خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ

۸۴–۸۶

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدا بخش لائبریری

جرنل

۸۴ تا ۸۶

پٹنہ

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 95079
Date 22.11.91

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری

رجسٹریشن نمبر:	۲۲۴۲۴/۷۷	سالانہ:	۲۰۰ روپے (ہند)
شمارہ:	چوراسی (چھیاسی)		۶۰ ڈالر (ایشیا)
قیمت:	پچھتر روپے		۱۲۰ ڈالر (دیگر ممالک)

۱۹۹۳ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے ابری آرٹ پریس (پرو پرائٹرز کتبہ جامعہ ملیہ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

■ ہندستان اپنے حصار میں	جناب ایم۔ جے۔ اکبر (مصنف) جناب مسعود الحق (مترجم)	۱
■ وہی احمد بگرامی کی ایک نادر تحریر	جناب سید مرتضیٰ حسین بگرامی	۳۴۱
جہانِ سرسید	مکتوب پریم چند	۳۵۱
پریم چند، سرسید کے علیگڑھ میں	پریم چند کا ایک مضمون	۳۵۲
سرسید پر پریم چند کے خیالوں کے درشن سے		
جہانِ آزاد جماعت احمدیہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۳۶۳
■ تاریخ مجمل مفصل مخطوطہ خدا بخش: سوانح جانجاناں پر نئی روشنی	جناب فرخ جمالی	۳۶۴
■ کچھ سر علی امام کے بارے میں	ڈاکٹر اختر امام تقدیم: ڈاکٹر انیس امام	۳۶۵
■ کچھ اپنے بارے میں	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۳۷۱
■ نیپال میں عربی، فارسی و اردو کے مخطوطات	ترتیب: فصیح الدین بلخی تقدیم: نسیم اختر	۳۸۱
یادداشتہائے دوود یادداشتہائے دوود	قاضی عبدالودود	۳۸۳
■ جرنل ۵۷-۶۲ کے بارے میں	جناب عبدالرؤف خاں	۳۸۹
■ نہرو، علی گڑھ، راس مسعود اور دارالسرائے	جناب مصطفیٰ خاں شروانی	۳۹۰
■ لاروش فوکو کے مقولے: ایک تعارف	ڈاکٹر نظیر صدیقی	۳۹۱
حرفِ آخر		
■ مقولے	لاروش فوکو	۱-۱۱۶

ہندستان اپنے حصار میں

مصنف

جناب ایم۔ جے۔ اکبر

مترجم

جناب مسعود الحق

حرفِ چند

اس کتاب میں جا بجا ضمیر کی آواز سنے گی:

میرے ضمیر کی!

تمھارے ضمیر کی !!

تمھارے ضمیر کی !!!

اور ایک حصّہ (تیسرا حصّہ: آخری دو باب) تو بہت دن تک یاد رہے گا

یاد رہے گا۔ تازہ رہے گا

اور دلوں کو گرمی اور روشنی بخشتا رہے گا۔

ضرب

تیم ہے۔ کبیر ایک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ انکی پیدائش جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ انکے نانا میر حبیب اللہ نے کشمیری شالوں کا اپنا کاروبار ترکستان میں شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں ترکستان مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور یہ خاندان بے یار و مددگار بہتا گرتیوں کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا۔ انکے دادا کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بہار کے اپنے گاؤں کے اخلاص اور اپنی تنگدستی سے عاجز آکر کلکتہ کے صنعتی نواح کا رخ کیا۔ یہ ایک ہندو تھے۔ انکا نام پریاگ تھا۔ بعد کو یہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام رحمت اللہ رکھ لیا۔ انہوں نے کانگریس پارٹی سے پیمان وفا باندھا تھا اسی لیے ہمیشہ ہندوستان میں رہے۔

کبیر کی اسکول کی تعلیم کلکتہ کے لا مارٹنز اسکول میں ہوئی۔ انگریزی میں آنرز کی ڈگری انھوں نے ۱۹۷۰ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے لی۔ بعد ازاں انھوں نے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز ممبئی میں یکسو تربیت سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ انکا تقرر مشونت سنگھ کی ماتحتی میں انسٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں فری پریس جرنل گروپ کے پندرہ روزہ رسالے "آن لکر" کی ادارت کا کام انکے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں کبیر کلکتہ میں آنند بازار گروپ آف پبلی کیشنز میں شامل ہوئے۔ یہاں انھوں نے مقبول ہفتہ وار رسالے "سنڈے" کی تشکیل بھی کی اور اس کی ادارت بھی۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے انگریزی روزنامے "ٹیلی گراف" کا منصوبہ بنایا اور پھر اسکی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ اخبار جلد ہی اپنی عمدہ پیشکش پر پہچانا جانے لگا۔

زیر نظر کتاب کے علاوہ ۱۹۹۶ء میں پینگوئن بکس انڈیا نے انکی ایک کتاب "رائٹ آف پاسیج" شائع کی۔ اس کتاب میں ہندوستان میں یکے بعد دیگرے ہونے والے ان فسادات کی چشم دید رپورٹیں ہیں جو یہاں ذات پات، زبان اور مذہب اور تہذیب اور ثقافت کے نام پر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ رپورٹیں اپنی صاف گوئی اور صداقت معروضیت کے لیے معروف ہیں۔

انکی ایک اور کتاب "نہرو: دی میکنگ آف انڈیا" منظر عام پر آئی ہے۔ یہ ضخیم کتاب نہرو کی محض سوانح عمریات ہی نہیں بلکہ نصف ہندوستان کی تشکیل و تعمیر اور اس جدوجہد میں پیش آنے والے نشیب و فراز کا نوجہ پسندانہ تجزیہ بھی ہے۔

ہندوستان

اپنے حصار میں

محبت اور شکر گذاری کے ساتھ
امّی جی ـــــ اور ـــــ ابّا جی
کے نام

فہرست

صفحہ نمبر

پیشگفتار ——— الف

تعارف ——— ۱

پہلا حصہ : پاکستان کا جنم اور ہندوستان کی بقا ——— ۵

۱۔ ۱۹۴۷ء کی منطقی بنیاد ——— ۷

۲۔ پاکستان میں بنیاد پرستوں کی بالادستی ——— ۳۰

۳۔ آقا نہیں، دوست ——— ۴۳

۴۔ اہل ایمان ——— ۵۸

۵۔ کیا موسم سازگار ہو رہا ہے؟ ——— ۶۱

۶۔ گاندھی جی کی آشا کا امکان ——— ۶۶

۷۔ "طائر قفس" کا عروج ——— ۷۳

۸۔ فرد، جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا ——— ۷۸

۹۔ اعزازات کی فہرست میں ——— ۸۰

۱۰۔ مہاندی ——— ۸۴

۱۱۔ ماضی اور مستقبل ——— ۹۴

دوسرا حصہ : پنجاب ——— ۱۰۱

۱۔ مسئلے کی نوعیت ——— ۱۰۳

۲۔ ایک پرانا خوف ——— ۱۰۶

۳۔ ایک عقیدہ اور دو مذہب ——— ۱۱۲

۴۔ [illegible] ۱
۵۔ تشخیص کا طریق ۱۲۹
۶۔ [illegible] ۱۳۰
۷۔ [illegible] ۹۰
۸۔ [illegible] ۵۵
۹۔ [illegible] ۶۰
۱۰۔ [illegible] ۶۹
۱۱۔ [illegible] ۱۹
۱۲۔ [illegible] ۲۰۰

حصہ دوم کشمیر ۲۲

۱۔ [illegible] ۲۲۳
۲۔ [illegible] ۲۲۹
۳۔ [illegible] ۲۳۵
۴۔ [illegible] ۲۳۵
۵۔ [illegible] ۲۶۰
۶۔ [illegible] ۲۸۰
۷۔ [illegible] ۲۹۵
۸۔ [illegible] ۳
۹۔ [illegible] ۳۲۰
۱۰۔ [illegible] ۳۳۲

پیشگفتار

ایک خیال اور عقیدے کی ڈکٹیٹرشپ کا ہموا نہیں ہے۔ مگر یہ لمحے ہوتے ہیں جب ذہنی تحریک کو تحفظ فراہم کرتی ہے کہ وہ ایک زبردست چیلنج کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ اور ہم اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔

بہت دنوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میں جو حوالہ کتاب میں دو ایک باب اور شامل کر کے کہانی کو آگے بڑھاؤں "ڈسکوری آف انڈیا" ہندستان کی سست یا جال کے واقعات کا بیان نہیں ہے یہ ایک سیاسی اور سماجی نظریے کو سمجھنے اور استعماری چنگل کے عذاب سے نکلے ہوئے ایک ملک کی بنیادی حقیقتوں پر اس نظریے کے اطلاق کی بحث ہے۔ اس میں مزید کوئی تبدیلی کسی کے حکم میں کوئی اضافہ نہیں کرے گی بلکہ شاید یہ کرنا کتاب سے رشتہ توڑنا کا سبب بن جائے گا۔ اس سب کے بجائے آئندہ عرصہ پر ہی توجہ کو مرکز کریں جو میں اور آپ سے ہیں اور توقع رکھیں کہ یہ اور ان دہائیوں کی ہوگی جو کھل رہے ہیں۔

ایم۔ جے۔ اکبر

••

تعارف

۱۹۵۹ء میں نوٹ ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے ہندوستان کی
تاریخ کے مطالعہ کی طرف توجہ دی۔ اس سے پہلے میں نے ہندوستان کی
تاریخ کا مطالعہ صرف اس حد تک کیا تھا جس حد تک وہ انگلستان کی
تاریخ کا جزو تھا۔ اس مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہندوستان
کی تاریخ کا انگلستان کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان کی
تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان کی
تاریخ کا مطالعہ ہندوستان کی تاریخ کے لیے ضروری ہے۔ اس مطالعہ
کے نتائج میں نے ۱۹۶۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیے۔
اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا رخ" تھا۔ اس کتاب
میں میں نے یہ بتایا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ہندوستان
کی تاریخ کے لیے ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی بتایا تھا کہ
ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ دنیا کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے بھی
ضروری ہے۔ اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف
پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے ۱۹۷۴ء میں ایک
کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی
تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی
تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے
۱۹۷۸ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام
"ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد میں نے
ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین
کو میں نے ۱۹۸۲ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب
کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد
میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔
ان مضامین کو میں نے ۱۹۸۶ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع
کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔
اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں
پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے ۱۹۹۰ء میں ایک کتاب
کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے
مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ
کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے
۱۹۹۴ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام
"ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد
میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔
ان مضامین کو میں نے ۱۹۹۸ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع
کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔
اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں
پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے ۲۰۰۲ء میں ایک کتاب
کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے
مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ
کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے
۲۰۰۶ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام
"ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد
میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔
ان مضامین کو میں نے ۲۰۱۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع
کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔
اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں
پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے ۲۰۱۴ء میں ایک کتاب
کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے
مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ
کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو میں نے
۲۰۱۸ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام
"ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔ اس کتاب کے بعد
میں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔
ان مضامین کو میں نے ۲۰۲۲ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع
کیا۔ اس کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلو" تھا۔

[illegible] ۱۹۴۷ء [illegible] ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو [illegible] ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو [illegible] ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو

[illegible]

اپنے دوست ضمیر انصاری اور صوفی لہنا کا بھی شکر گزار رہوں ان کے مشوروں کے لیے جو ان دونوں نے کتاب کے پہلے اور مشکل باب سے متعلق دیئے۔ نیکولا بوئیا (Nicola Boia) نے بھی بہت رائے، تو شوریٹ (Toshoriet) نے اور ٹیلی گراف اور سنڈے کے میرے تمام دوستوں و ساتھیوں نے آزمایش کے ان مہینوں میں میری حوصلہ افزائی کی۔ میں کمی نہیں کی جب میں صحافت سے زیادہ اس کتاب پر توجہ دے رہا تھا۔ میرے خصوصی شکریے کے مستحق فاروق عبداللہ اور ریتا دھوبی ہیں جنھوں نے ماضی کے بارے میں مجھے ایسی معلومات فراہم کیں جسے صرف وہی فراہم کر سکتے تھے۔ انتظامی معاملات میں امداد دینے کے لیے میں لسو رنجن سرکار اور شرن کمار کا بھی مشکور ہوں۔ کتاب کی تیاری میں تو تو، سمایاں اور دوسرے دوستوں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں بے پناہ مدد دیا۔ اس کتاب کا خیال میرے ایک دوست پیٹر میرٹ (Peter Merrett) کا مرہون منت ہے جنھوں نے مجھ سے اس وقت کہا تھا جب کہ میں نے ایک حرف بھی نہیں لکھا تھا۔ لکھنے کے فن کی نزاکتوں اور مدقل انداز میں بات کہنے کے سلسلے میں پیٹر کا میں نے خود سے گیسری اور روشنائی کی اس سے میں نے اور رتی کاٹ چھانٹ کے بہت سے سبق سیکھے

میری زندگی میں ایک غیر معمولی شخصیت ہے جس کا شکریہ میں شاید کبھی ادا نہ کر سکوں گا اور وہ ہے میری بیوی ملکہ۔ ملکہ نے مجھے اتنی محبت دی ہے جس کا میں کسی طرح بھی مستحق نہیں تھا۔ اس نے اپنی محبت و خبر گیری سے گھر میں ایک ایسا ماحول بنا دیا جس نے ایک خشکل شوہر کی پرورش کر دی۔ کتاب سے متعلق اس کے مشورے اور ہدایتیں بڑی واضح اور اہم تھیں۔ میری بیٹی مونا لیسا اور بیٹے ریگ کا ساتھ میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ اور یہی مسرت میری زندگی اور کام کا عجیب و غریب جواز بھی بن گئی ہے۔ یہ کتاب ایک باپ کی اپنے بچوں کو یہ بتانے کی بھی ایک کوشش ہے کہ اس نے کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سیکھا ہے۔

پہلا حصہ

پاکستان کا جنم
اور
ہندوستان کی بقا

(۱)

۱۹۴۷ کی منطقی بنیاد

ایک نئے ملک پاکستان میں ہے۔

مل اب ہے علاقے میں مو جس میں ایسا لگتا ہے کہ ہر اور ہر سے ہر تو کوئی فرق نہیں ہے ہر ہی ایک ہے سے
لو قریب ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے ہمارے سوال پہلے تو کہ کی حکومت نے بدھ حکومت کو حکومت سے
کہلے کو نے تک بھیجا یا مگر بظاہر اس نے تشدد یہاں کے کسی حساس کو یہ ان میں بڑھایا ہو یہ تشدد کے لئے
ملاقی مصاف کے اصل صدیوں سے عوامی علیحدگی کا حصہ ہے ہیں کہا یہ جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل ہی ان
حساس بطانوی علاقوں کی ہیں ہے سولھویں صدی عیسوی میں نقل ہاتھ ہ کہ کے سلطانی ڈھانچے نے اس کی مکمل
سلطنت کو یہاں مستحکم رکھا مگر یہاں یقین ہے کہ کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ نقش کا اگر بڑھا تھا اس نے مذہبی
کو خوا حکومت کرنے کے سبق دار ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک کی تشکیل ن اور ولیم آف اورنج کی
سے برطانیہ پہنچنے سے پہلے یہ اس کے نتیجہ تک کی مخالفت بڑھ گئی مگر یہ ہمارا بطانوی رعیوں کے رہنما حاتم
محمود نے نقل و حمل در رسل و رسائل کا ایک جال سا بچھا کر ہندوستانیوں کو متحد کر دیا۔ بطانوی حکومت کی ۱۰۰ سو
سے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں تک پہنچ سکتے تھے۔ مگر سب سے آسان اور حقیقت ہو گی یہ ہو
۱۹۳۰ء میں بھی اس ملک کا تقریباً نصف حصہ بطانوی حکومت کے تحت نہیں تھا۔ ان میں بہت سی ایسی ریاستیں
کرتے تھے جن کے فرمانروا ہندو ہوتے تھے۔ عدالتوں میں استعمال ہونے والے نقشوں میں سارے ہندوستان
دل کھ کر دکھایا جاتا تھا مگر اصولی و تکنیکی لحاظ سے ریاستیں بطانوی ہند کا حصہ نہیں تھیں حکمران
آزادی سے حکومت کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء ریاستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ کا ایک ایک ملک معاہدہ کر رہا تھا
یہ صحیح ہے کہ ہندوستان جاگیر داروں، سرداروں اور حکمرانوں میں منقسم رہا ہے اور اس کا حصہ
مختلف حکمرانوں کی تسلط و صحیح کے لحاظ سے مختلف رہا ہے لیکن یہ بات کسی ایسے نو مین کو نہیں
ذہنی کے بارے میں اور سابقی طرح کسی طرح بھی نہ سمجھ میں دیتی کہ وہ یہ کہے کہ جاگیر دارانہ حصے بخرے
الگ الگ علاقوں کی تاریخ ہی کرنے میں ہندوؤں اور بدھ مذہب کے وجود کے باوجود، شمال مغرب میں
سلیمان اور جنوب دکن سے لے کر شمال میں ہمالیہ تک دور دراز، جنوب اور مشرق کے ہندو راجہ
میں ایک جو ثقافتی اتحاد کی کسی نہ کسی شکل کا احساس پیدا کرتے تھے۔ ان علاقہ داریوں اور حکومتوں کی
موجودگی کے باوجود سرداروں، راجاؤں کے لیے کسی ہندو کو اعانت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔
ہی تاج حاصل کرنے کے لیے کسی مسلمان کو خود صلاح الدین تیسری کے مزار پر حاضری دینے کے لیے تیرتن
حاصل ہونے والی خوشی ہوتی ہے کہ ہندو راجہ بھی اس سرحد میں پر معاہدہ دیانت کی ہے

عوام کی عدالتوں سے بے پروا ہوں اور جن میں رہنما اور سرکش کا فرق حقیقت عرف رہتا ہے سختی اور نرمی کا فرق تھا جدید و قدیم کا فرق تھا سے کسی طرح بھی ایک نئے مذہب اور پرانی دقیانوسی کا باہمی فرق نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تو جو ہوئے وہ تھے سیاسی علماء علم قانون اور سائنس کے مجدد۔ جو ذات سب سے زیادہ جو صداقتوں کو آزمائشوں سے طے کرنے والی تھی وہ تھی جو ہمیں کتاب سے صداقتوں کا حاصل کیا ہو سارا علم تھا ہمیں ایک مجبور اور مظلوم قوم ہی۔ وہ جہاں پڑھا یہ تھا جو حاکم کا مذہب اور قانون ہے کہ یہ لگا جس میں ہم ہو رہے تھے زمانہ ہمارے اوپر ایک کہ یہ ہو سکتا تھا اور ہمیں وہ تکلیف کی ہوا آئی تھی جو ہمیں یہ معمول کشمکش اور ہمیں وہ تعلق کر سکتی تھی جو ہم اپنی ہمیں تعلیم کرنے میں بھی پیچھے ہمیں رہتی گا مذہبی کی کہ اس ذات کا ہمیں تھا کہ اختلافی میدان میں یہ معنی تھا کہ آزاد خلاف یا جائے اور مذہبی دنیا کے کہ اب بھی تعلقوں پر معنی کا ہمیں اس صداقتوں کو ہمیں ان کو آزاد سے ساتھی میں ہمیں عوام پر ہی تھا مگر کسی قوم پرستوں کا ان سے نقاب ہیں ہمیں ہو جو نظر بڑا پرستی ہے۔ جو نظر بڑا پرستی ہے اس سے ہماری ذات صداقتوں سے ہمیں ساری عوام پر ہمیں جا سکتے ہیں کہ اس مذہب کے میدانی عقیدہ یہ تھا کہ صداقتوں میں سے دو ان مختلف قوموں میں بھی معاملہ کی ہوا ہے۔ بھی ان حالات میں ہو سکتی ہیں تعلیمیں صداقتوں کی ہوئی اور واقعی وہ نشانہ ہوں گی اور اس صورت میں ہمیں ہو اور پرانی کی اور نئی کی ذات بھی تھا ان کی عادت دے گی میں بڑے سب صداقتوں کا ہو سکتا ہے سب ہمیں ہو یہ ہو ہمیں ہو اور قریب پر ہے تو ان قدیم بھی تھا کہ یہ ہے جا فقیہ بھی تعلیمیں کہ ہو ہے جا یہ ہے کہ ہے ہو ہے ہو ہے ہو

"مائی لارڈ، آئینڈ بیڈرن آج کا عام واقعہ ہے مگر صدر ستان میں یہ تصور ہوتے ہیں وہ تب ہوتے ہیں
ہیں اکثر صدور نے صدر بڑی دراقتدار کے بعض تذکرے سنے ہوں گے۔ شہادت و قصاص اور مذہب
پہچانی ایسے ہی واقعات ہیں جو کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں جاتے تھے جہاں وہ ان علاقوں و علاقوں سے
کی کمک طلب نہ ہے ہے بے رحمی کا بدلہ لیتے سارے سات سو سال کے عرصے میں کسی صدر نے دہلی میں حکومت
نہیں کی تھی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۷ء تک صدر کے زیر دست تیسرے دراز کے، وہ دہلی کے تخت پر فائز
بادشاہ متمکن رہے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ان کی تذلیل

مگر عجیب اور نظام صدیوں صدی تک ایک دو صدر تصور میں چلا آتا تھا قوت کی ولیت اور اس کے بعض
کی بنا اللہ نواز، یا ولی سلطنت کے بعد صدر ستان میں کسی قسم کی حکومت کے قائم کرنے کا جائز ذریعہ سمجھا جاتا
باقاعدہ زور پر ہوئے کے بعد ووٹوں کی گنتی کی صورت میں ہوئے لگا تھا صدی کے آخر میں صدر ستان کی
برقی ہوئے کے لیے قوم پرستوں اور فرقہ پرستوں میں کشمکش شروع ہوئی یہاں ستان کا ہوا
اس کے بارے میں متضاد خوب دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں گریزاں سے دو کا تیب نیاں کے
مزدوری کا میں مطالبہ ہی مسلمان جو یہ کہتے تھے کہ وہ صدر ستان کے ساتھ ہیں رہ سکتے تھے یہ ستان سے
گیا اور اس قوم پرستوں کو جو ایک متحدہ جمہوری صدر ستان چاہتے تھے حکمرانی کے حوصلے رہ گیا
مگر صدر صدر آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے ستان میں جو ہوں جمہوریت کی کامیابی، ہوئی ہے ہوئی علاقائی
ہیں وہ آج بھی مختلف رہے ہیں اور ابھرتے ہوئے ہیں صدر ستان میں ان دنوں سے تیسے سلطنت
کو کیا رہ گیا ہے جاتے ہیں تو ہی ریاست کے خلاف ایسی جنگ کو تند اور غلط استعمال کی مثالیں
پستیوں تک پہنچا دیا ہے۔

[illegible] ایک نئی نزاکت تاریخ میں ہوئی اور ہوا کا یہ جھونکا اس
۱۹۸۴ء میں دہلی سیاسی حالات کو یوں بدل دیا ہے صدر ستان میں قوم پرستی اور فرقہ پرستی دونوں کی جڑ
کی بنیاد رہیں مطلب یہ کہ [illegible] صدر ستان کے [illegible] اور اس کا تعلق یہ دونوں رجحانات تھیں اس [illegible] ہوئی ہوئی تھی کہ وہ تاریخ کی
سے قبل کے سماجی ٹھہراؤ کی حالت سے پیدا ہوئی تھی، اور ہمیں صدی میں صدر ستان میں [illegible] صدر
سیاست کی دین تھی جدید سیاست عوامی شرکت کی سیاست تھی، اس نے عام کی بیداری کی سیاست تھی اور

ان کا مطالبہ نہ صرف اقلیت بقائے باہمی ہے۔ مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے خیال کو بہ طور کلیہ کے مسترد قائدین نے خلافت کمیٹی کے کہہ کر رد کیا تھا دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے سیشن کے صدر مطاع نے اس بات کو بڑے نمٹنے مگر واضح طور پر یوں کہا تھا "ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ یہ الفاظ ہندوستانی مسلمان سیاسی قومیت اور ہمارے مذہب کا اعلان کرتے ہیں۔ جب کبھی ہندوستان کی فلاح و بہبود اور ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کا سوال سامنے آتا ہے اس وقت میں صرف ایک ہندوستانی ہی نہیں ہوں، بلکہ پورے ہندوستان ہوتا ہوں" مولانا محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "مسلمان خدا کے فضل سے کہ ملک کے معاملے میں اول مسلمان، دوم مسلمان اور آخر میں مسلمان اور مسلمان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا مگر جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اوّل ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور ہر حال ہندوستانی ہوں"

۱۹۳۱ء میں ملک کے صدر حال صاحب خدا علیہ اللہ نے بامبئی سیشن کو مخاطب کرتے ہوئے ۲۶ دسمبر کو کہا تھا "سب سے پہلے اور انتہائی صفائی کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اتنے ہی ہندوستانی ہونے کے دعوے دار ہیں جتنی زمرہ ہندوستان میں کوئی دوسری قوم دعوے دار ہو سکتی ہے۔ اور ہمیں بھی ملک کے حصول آزادی سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی دوسرے کو۔ وقتیں اس وقت درپیش ہوتی ہیں جب کہ یہ میں اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں سے کچھ مخصوص تقاضا کا مطالبہ کرتے ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کی عصمت کے محسوبے سامنے ہیں میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر صاف صاف یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان سیاست میں ہمارے نقطہ نظر بنیادی طور پر ہندوستانی ہے ہمیں ایک مشترکہ مفاد، ثقافت کے فروغ اور جوش ملی اور ترقی پسند ہندوستانی قوم کی تعمیر کے لیے متحدہ کوشش رہنا چاہیے یہ مشترکہ ثقافت ملک کی ان مختلف تہذیبوں کے حسین امتزاج سے اس ملک میں رائج ہوئی ہے۔ جو اس میں ہر مستقل ہوگی لیکن جب تک ایک کمیونٹی دوسری کمیونٹی پر اپنے تسلط کے لیے کوشاں رہے گی اور ہندو یہ سمجھتے رہیں گے کہ وہ ہندوستان کو خود دیکھے گی اس وقت تک ایک عظیم اور آزاد ملک بنانے کی ساری جائز آرزوؤں کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

پاکستان کا نعرہ محض تھا مٹھی بھر کٹر پسند لوگوں کا۔ درحقیقت مسلمانوں کا ایک طبقہ، ترقی وقت تک کہ بھی ذرہ برابر دلچسپی رکھتے ہے ساتھ رہنے ہی میں عظیم تر فائدے سمجھتے ہو سکا اس کے دیگر دلائل سے علیحدہ ہے۔ یہ تھا کہ ملک کے بٹوارے کے بعد ان کی دوسری [illegible]

کی محنت یا اس کے عام صحت پر کسی طرح کوئی اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں ایک صاحب [illegible] Allen Octavian Hume کی دل میں کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء کے بعد ایک ہندوستانی قوم کے نمائندوں کے نشیب و فراز سے متعلق معلومات اپنے ہوئے کانگریس نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے جو اس کرہ ارض کا عجیب ترین جاندار ہے جس نے وکیلوں کی اس پارٹی کو ایک قومی پارٹی میں تبدیل کر دیا اور آزادی کی راہ اختیار کی تھی۔ اس سے پہلے کے عہد میں بھی مختلف مواقع پر مختلف طاقتوں نے اس سوال پر کانگریس کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہندوستان سے باہر ایک عجیب سی چیز تھی۔ ایک مسلمان مدبر علاؤالدین علیہ الرحمۃ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی تعلقات میں وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ کوئی بھی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا جو ایک فرقے کے لیڈروں کو دوسرے فرقے کے لیڈروں سے اور اس عہد کے سے الگ کرتی ہو جو یہ سب مفاد عامہ کی خاطر عظیم عوامی اصلاحات اور عمومی حقوق کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ ہندوستان میں دریافت [illegible] کا زمانہ تھا۔ یہ اقتدار و اختیار کا جگہ [illegible] ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا اور مختلف مفادات رکھنے والے مختلف گروہوں کی کشمکش میں لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ اپنی حیثیت کو بہتر بنانے، اپنے مفادات محفوظ کر سکیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک نئے انگریزی داں طبقے نے ملک ہندوستان کی دریافت کرنے اور سمجھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کیمبرج میں [illegible] جیسے مصلحین نے ایک عظیم فوجی [illegible] بیرونی ممالک سے آزاد اور ایک متحدہ ہندوستان کی خواہش ظاہر کی۔ ان دونوں نے قوم کی آزادی کی اور [illegible] مختلف نقطے ہیں۔ ایک اسی سرکاری داں کی خواہش جو ہندوستان کی ہندو خصوصیت اور ہندو روایات کی انگریزی اور عیسائی روایات کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہونے کی ریکٹ صدی کی اسی عہد ورت کی پیداوار تھی۔ ماضی کی اصلاحات کرنے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے تاریخ اور ادب کی تخلیق ہوئی۔ یہ ایک مالدار طاقتور سفید چمڑی والوں کی حکومت ایک عارضی حقیقت ہے۔ سوال یہ تھا کہ انگریزوں کے بعد یہ ملک پر کون آئے گا؟ اس سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیے جاتے تھے۔ آزاد خیال اس طبقہ اشراف، ایک عظیم اور اچھے آئین کے وضع کیے جانے کی حکومت چاہتا تھا۔ دوسرے بہت سے لوگ بڑے بڑے علاقوں کے آزاد حکمران تھے۔ اس صدی کے ایک بہت زیادہ [illegible] پرست ہندو [illegible] نے [illegible] کو بڑے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ [illegible] ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ [illegible] زندگی پر روشنی

چاہیے صرف یہ صدارتی نظام جو صدارتی نظام سے مختلف ہے جس میں صدر کی
[illegible] صدر [illegible] کا اختیار اور
[illegible] صدر [illegible] کا
[illegible] صدر [illegible] کی
[illegible] صدر [illegible] کی
[illegible] صدر [illegible] کی

متوسط طبقہ جس کی آواز اس کی تعداد کے تناسب میں زیادہ تھی۔ اس کا سب سے موثر ہتھیار، جو خود ہندو اور سکھ ہی اسے الٰہ کر مسلمانوں سے زبردست مدد لیتی جن کی بڑی تعداد حقیقی ہندوستانی سے ہمیشہ کی حالی تھیں۔ ان کے خواب ان قومی آئینی حالات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے جو عوام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد ہوئے نعرہ جنگ یہ تھا کہ مسلمان خطرے میں ہے۔ بعد عمل مختلط کی آئینی خصائص، تجزیہ کیا گیا۔ بعد کو کوئی ضمانت بھی کافی نہیں سمجھی گئی اور مطالبہ ایک الگ ملک کی مانگ میں بدل گیا۔ ایک ملک جس میں ملا ایک مذہبی آئین کے ذریعے خود اپنا مختلط کرسکے گا یہ ایک مشکل کام تھا، اور اس میں کافی وقت لگا۔ پچھلی صدی میں سنٹرل یروسر سی۔ پی میں ۱۹۰۷ء اور میں ۱۹۰۸ء میں اور یو پی میں ۱۸۹۱ء میں سرکاری کاموں میں اصلاحات کے ضمن میں صدی کے استعمال کا تو جھگڑا ہوا اسے بڑی چابکدستی سے اس خدشے کو پھیلانے میں استعمال کیا گیا کہ ابھی تو شدید ہے ان کو مسلمانوں کی جو مسلمان کا حق ہندی نہیں اردو جانتے ہیں، سرکاری نوکریوں سے خود ہم رکھنے کے لیے کی جائیں گی اس بات نے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے پروپیگنڈے پر متوسط طبقے کے افراد کا ردعمل کیا ہوگا۔

زمیندار، نواب اور خاں بہادر حضرات بڑی خوشی سے ان ملاؤں سے مل گئے۔ دور تک قوتوں کا یہ ایک نہ دل جیسپ کلاسیکی ملاپ تھا، ان میں سے ایک کو یہی اقتصادی قوت کہنے کی فکر تھی دوسری پہلی سماجی برتری اور سو قائم رکھنے پر کمر باندھے ہوئی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ اسی اتحاد کی پیداوار تھی۔ اس کا ہدف نہ ڈھاکہ میں، ڈھاکہ کے نواب کی ایما اور پہل پر ہوا تھا مگال کے حساس صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر اقتصادی قوت مندو زمیداروں کے ہاتھ میں تھی، نفرت کے بیج بونے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کٹر مسلم ایک مستقل دراڑ ڈالنے کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ ملاؤں کا دعویٰ تھا کہ ان کا حق ہے اور کٹر مذہبی چاہتے تھے کہ ان کافر مسلمانوں کو قتل کر کے گائے کا قطعہ کرے۔ ایسی فضا میں قوم پرست عموماً ناقابل اعتماد رہے تر ہو جاتے تھے "ای سکار کلس ۱۹۰۶ء ۱۸۷۱ء (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) میں فیض الدین احمد نے لکھا ہے" ایک مسلمان لوہیہ بیرسٹر، جس نے اپنے آپ کو اس وقت موضع بحث میں آئے ہوئے ایک خاندان میں پایا جس نے ہندوؤں کے ساتھ اخوت اور بھائی چارگی کی خاطر مسلمانوں سے رضاکارانہ طور پر مقاطعے کی وکالت کی۔ انھوں نے کہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگیوں کا ایک دوسرے پر اتنا انحصار ہے کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مختلف مذاہب کو ماننے والا کہتے ہیں مگر دلوں میں اور اپنے عمل میں وہ ایک جیسے ہیں۔" مشرف کی اس معقول اور اقتدار پسند ذہنیت کو قبولیت نصیب نہ ہوئی زبان کے مذہبوں میں اور نہ ہی ہندوؤں میں۔

کے خدوخال کو ایک عظیم سے دیا۔

مسلم لیگ سے سب سے نوسب سے بڑا مسلہ جیسے آباد یہ حاکر تو یہ فی معاملوں کے دام یہ ہی تھی سے تو مسلمان
ی ہابت تھیں ہی تھی مسلمان میں رہا دل میں ۱۸ دیس سے سطح آتی تھی اس معاملہ یہ اس بات سے ہ
کر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ میں دو فیلیں کانگریس اور مسلم لیگ تنظیمی نقطہ میں بالکل ہ تھیں لیکن یہ مسلم
لیگ یقین کہ ملک کی آزادی کے لیے ہندو مسلمان سے نقطہ کے لیے محمد علی جناح سے سنا ر
صاحب کی ہندو ذہنیت میں ایک وقت تھا جب یہ سمجھتے تھے کہ محمد علی یہ کر رہے ہیں کہ کسی قوم کی دشمنی کی بنیاد
کیے ہوئے ہندو مسلم کا نعرہ لگا رہے ہیں کہ ایک مسلم طاقت کی حیثیت سے ہندو کی اس وقت سے بعد
مسلمان کی قیادت سنبھالی ہوئے اور خود ساختہ ہوئے یہ صورت حال تھی کہ اس کے ساتھ
ے نے اس وقت ہندو مسلمان کو اس طرح دیکھا کہ ہندو یہ کہ کی تھی کہ
تھے ہے ہی کہ ہندو مسلمان کی بنیاد تھی کہ ہندو ذہنیت تھی کہ ایک طرف مسلمان کو ہندو
تھی اس طرح سے بھی کہا جا سکتا تھا کہ تحریک خلافت کے بعد ہندو قیادت کے ہاتھ میں آ
کر ہندو میں ذہنیت کے ہاتھ میں انتقال کر گئے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہندو میں ہوئی اس سال ۱۹۲۰ کو خلافت
کمیٹی آل انڈیا خلافت کانفرنس پٹنہ اور دہلی میں ہندو مسلمان سے ساتھ رہے ۔ اس دونوں کے بعد ۱۹۲۲ء میں جب
کہ یہ رہنما تنظیم کی رہنمائی کر گئے ۔ دل دریا دل جناح صاحب سے ساتھ سے کہ رہ کسی کا بعد یا
۱۹۲۰ء میں اس کا اس کے بعد ان میں کہ سے کہ وہاں ہی قائد کی یہ بیشن کی خلیج کریں

آزادی سے قبل مسلم لیگ کے ایک تاریخ دان ہی کتاب "یاد قدے قوم پاکستان" نے
میں ۹۶ میں ہی ہی کہ یوں کرتے ہیں "مسلم لیگ یہ خطاب یہ تھا کہ ہندوؤں کے بعد ان ہی
ہی جمہوریوں کا تسلط ق ۱۹۰۶ء میں اس کے قیام کے بعد ہی سے مسلم لیگ کی سرگرمیوں تقریباً سمیٹنے کی مدت
عارضہ گرمیوں تک محدود رہیں اس کے سالانہ اجلاس بھی سے تھے سے پنڈالوں میں کبھی بڑے ہال میں ہوتے تھے
جن میں چند ہی عمارت ہوں کے ذریعے محدود سے جدوجہد آب عصمت کو تقریباً کا موقع ملتا تھا بڑے سے
عوامی جلسوں سے مسلم لیگ کا وقف ہی رہا تھا ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اس کے قیام کے بعد سے ۱۹۱۰ء تک تقریباً
بعد آزادی دفتر ہی کی ہیڈ کوارٹر کی حیثیت کی نہیں دربار اجلاس سے آپ دل تو ہو میں ہو کے لیے آنکھ کھلی تھی
ہو سکتے کا ایک دفتر بنانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی ۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تین سو روپے سالانہ کی مدد یہ
اس نے اپنی ہوگی ۔ دفتر کی یہی کل سرمایہ کی مقررہ آمدنی تھی

[illegible] ۱۹۳۷ کے تحت مسلمانوں نے صوبے میں ۱۷۵ نشستیں [illegible]
تھیں، وہ جماعت جسے مسلمانوں کا نمائندہ کہا جاتا تھا [illegible] ان سے صرف ۱۰۹ نشستیں ہی حاصل ہو سکی
[illegible] نے [illegible] مسلمانوں کی [illegible] حقیقت یہ ہے کہ [illegible] کی [illegible]
[illegible] ایک کے ساتھ [illegible] ۱۹۳۵ [illegible] ۱۹۳۷ [illegible] مسلمانوں کو [illegible]
[illegible] ۱۹۳۷ [illegible] کے وقت سے [illegible] اسمبلی [illegible] سے [illegible] پہلے سال [illegible]
[illegible] ۱۹۳۷ [illegible] کابینہ [illegible] کانگریس میں [illegible] کابینہ [illegible]
[illegible] ۱۹۳۷ [illegible] منعقدہ [illegible] ایک [illegible] [illegible] نے اس سلسلے میں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [

کانگریسی و قومی طبقے کے صدر مسلمان، علماء کے روایتی قبیلہ داروں سے تعلق تھی ان کا تعلق وہیں سے تھا لاکھوں عوام سے تھا اور لاکھوں یقیناً اصل کے راس پاس ست ان میں جا چکے ہیں ان کی جرأت، صاف گوئی کانگریس کو اس لوگوں سے دور رکھیں جو مسلم لیگ عملی یا صدر جماعت میں تھے رہے جاتے تھے ڈالمو بے اور سری ساگر جیسے صدر حق اور کی نیابت کے نظریے پر ایاں رکھتے ہیں وہ مسلمان صدر و قدر، تسلط کے واقعت رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں میں اس طبقے کی حمایت گی ہیں کرتا، میں کانگریس کی حامی کرتا ہوں ۱۹۴۲ء کے کانگریس سشن کی تقریر میں وضاحت کی "اور اصل اسی طرح ہیں جو ان کو ووٹ دیں گے ویسے ہی مسلم لیگ سے جن لوگوں کو ووٹ دیں گے وہ بھی ہمارے معاملات کی حمایت کریں گے جو چیز تھی جو جہاں حاصل ہے چاہتے تھے کہ کانگریس ان کے اور یہی وجہ تھی جسے کانگریس بھی اپنے نظریات کو قربان کیے بغیر نہیں کر سکتی تھی یہی کشمکش "متحدہ قومیت" جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک اسلم کی بنیاد اور جسے پنڈت نہرو کا ایک فیصلہ کن حملہ کہا جاتا ہے یہ ختم ہوا تھا ۱۹۳۷ء سے انتخابات سے صوبہ متحدہ میں کانگریس اور لیگ کا متحد ہو جانے کی نا کام کوشش کا حصہ۔

انتخابات کی نسبت نے مسلم لیگ کی حکومت کی خواہش کو مدھم نہیں کیا۔ اس خیال کو زندہ رکھنا کہ یہ صرف لیگ ہی ہے جو مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اگر کانگریس نے مسلمان وزراء کی وزارت کے ساتھ میں یہ دکھا سکتے کہ اس کا مسلم حکومت کا ایک حصہ ہونے کے باوجود اپنی کمیونٹی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں تو یہ بھی مسلم لیگ بھی ختم ہو جاتی۔ حتیٰ کہ جب صوبہ متحدہ یو۔پی جیسی اہم ریاست میں حکومت میں شامل ہونے کے لیے بے چین تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس حقیقت کے باوجود کہ صوبے میں کانگریس اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے کانگریس سے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کابینہ تشکیل دینے کے لیے کہا۔ توقع کے مطابق پنڈت جواہر صاحب نے صرف یہ مطالبہ پیارہ کانگریس کو اپنی طرف سے کسی مسلمان کا نام تجویز کرنا چاہیے اور اسے ایک مخلوط پارٹی کی طرح رکھا جانا چاہیے۔ مسلم لیگ نے ۲۲۸ رکنی کے ایوان میں ۲۹ نشستیں جیتی تھیں مگر اس نے اصرار کیا کہ وزارت کی تشکیل کے لیے اسے وہی حیثیت حاصل ہونی چاہیے جو مسلم لیگ کو مسلمان کے لیے حاصل تھی۔ نواب اسمٰعیل خان۔

[illegible]

۔ جو صاحب ان لوگوں میں تھے جو جناح صاحب کو لندن سے واپس لائے تھے

یوں صحیح تھا، لیا۔ ۔ ۔ ۔ یہ صاحبہ صاحب سورنگ کھل طرح ان کی تعلق ۔ ۔ ۔

[illegible]

[illegible] سے [illegible] سیاسی لاط سے، ایک ملک سے [illegible] ہوئے [illegible]

[illegible] صاحب کے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] کے [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible]

نہیں گے۔"

(۲)

پاکستان میں بنیاد پرستوں کی بالادستی

۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے بالآخر برطانیہ کے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۶ کی سامراجی مارڈ یوال کو شایا اور رضا۔ جون ۱۹۴۸ تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سلطنت کی عطائی تقسیمات کی رسم ادا کریں گے۔ آخری تاریخ کے تعین میں بھی ایک سال سے زائد کی مدت دی گئی تھی حالانکہ کانگریس کے نمائندے ماؤنٹ بیٹن کی مدت میں چھ ماہ مزید توسیع کے لیے نہایت آسانی سے درخواست کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ان کی اس جلد بازی کی کوئی منطقی اصاحت آج تک نہیں ہو سکی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عذر یہ رہا ہے کہ انھوں نے نئی حکومت میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو ساری قیمت اس کے حصے میں آتی اور وہی جو دیوی پڑی کہ یہ ہیں ایک سفید فام سے۔ بہرحال یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت میں انتظار کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ کانگریس کی تقسیم کا تو صرف ایک حیلہ مطلوب تھا جو اس کے مدبرانہ اس تقسیم کو قبول کر چکی تھیں۔ اور اسی کی دھمکی سے جناح کا کیک ایسا سلگتا ہوا ٹکڑا ہو گیا تھا جو ابھی بھی ہضم نہیں ہو پا رہا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے انتقال حکومت میں اتنی جلدی اس لیے دکھائی کہ وہ ایک ایسی بات جلد سے جلد طے کر دینا چاہتے تھے جو ان کے اور خود جناح صاحب کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور یہ بات یہ راز تھا پاکستان کے حامی جناح صاحب کا ذاتی کارنامہ، اپنی آخری حدوں پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ گروہ پاکستان کے قیام کے صوبے کے اعلان سے پہلے رہا تھے تو تنازعہ دو الگ الگ ملک کے مطالبے کی تحریک ہو تو اپنی اس اساسی فکر کا حوالہ موجود تھا۔ صاحب کہ ہم پہلے ہی چکے ہیں کہ مسلمان دو قوموں نے مسلم لیگ کی حمایت کبھی نہیں کی۔ اور پاکستان کی تحریک نے صرف جو مقبولیت ۱۹۴۶ کے انتخابات میں اس وقت تقویت حاصل کی جب جناح صاحب خوف دلا کر اس کی فضا تیار کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان مسلم عوام نے نہیں بنایا۔ اس کا غم تو مسلمان متوسط ہے جس کی مٹھی بھر لیڈروں کا حق لے لیے تھا۔

میں انگریزوں کے خلاف اس نے کوئی تحریک خود چلائی اور نہ ہی کسی تحریک میں شرکت کی۔ اپنے سے
وحشی اور مرعوب کو کانگریس کے لیے محفوظ رکھا جو آزادی کا دن کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی اور مسلم لیگ
خلاف جناح صاحب برسرِ موقع انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ جناح جب کانگریس سے الگ ہوئے تو
دیئے تو جناح صاحب نے علان کیا کہ ۱۹۳۹ء کو ۱۹۴۰ء کو ۱۹۴۱ء تک کے زمانے میں
جیسے ہم صوبے میں لیگ کو حکومت کا دعوت دی گئی جس سے وہ ۱۹۳۷ء میں فراری تھی۔ جناح صاحب کو اس بات
موقع مل گیا۔ یہ ستی مشین کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے ہتھیار کی طرح استعمال کریں۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ
کانگریس سے علیحدہ کر خطرہ کے خطرے کی پکار کا موضوع بنایا تھا جسے بہرحال مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ جناح صاحب
نے فیصلہ کیا اور ابتدائی سم در کشمکش تک فیصلہ۔ یعنی انتخابات میں شکست کھائے ہوئے جناح صاحب کو
مندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ تسلیم کرنے کا حق دینے کا فیصلہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں جب جنگ ختم ہونے
والا تھا انگلستان نے مندوستان کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا شروع کیا تو جناح صاحب کو اس بات پر پورا اطمینان
گیا تھا کہ انگریز مسلمانوں کی نمائندہ پر یقین کر چکے تھے۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو وہ ڈائریکٹ ایکشن
دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ کلکتہ میں شہید سہروردی کی مسلم لیگی حکومت نے یہ بات ظاہر کر دی کہ برسرِ اقتدار لیگ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ کلکتہ میں
فسادات کی پیٹ میں آگیا۔ لیگ کے مسلح کارکنوں نے بڑے پیمانے پر ہندوؤں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کے
جواب میں ہندوؤں نے بھی ویسی ہی شقاوت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ یہ سوں دار کی دھمکی کے سچ ہونے کا ایک
ثبوت تھا۔ قتل و غارت کا دور دورہ ہوا۔ دلوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ دریں اثنا عبوری حکومت میں مسلم
لیگ نے اپنے وزیروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔ مارچ میں
ماؤنٹ بیٹن آئے۔ اپریل کے آغاز میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے چھ ملاقاتیں کیں۔ ۱۰ اپریل کو برطانیہ
نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ یکم مئی کو کانگریس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس کی ذاتی گمان نے ہندوستان کو ایک منقسم ہندوستان
کی آزادی کو ان لینے کا اختیار دے دیا۔ گاندھی جی نے بڑی بے چارگی کے ساتھ۔ جو کہ ان کے چاروں طرف ہو
رہا تھا۔ اس پر معذرت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بعض نے کانگریس سے ایک متحدہ ہندوستان میں جناح
صاحب کو برسرِ اقتدار آنے دینے کی اپیل تک کی۔ مگر قتل و غارت گری اور بربریت کے اس نے نظیر دور دور
میں انسانیت اور سمجھداری کی بات کون سنتا۔

۲ جون کو یک آل انڈیا کانگرس میں تقسیم کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ کانگرس میں نہرو، سردار پٹیل

ریاست کے قیام میں [illegible] سیاسوں سے اس [illegible] ۱۹۰۷ میں سامنے آئی [illegible] سب کچھ [illegible] خالفت [illegible] پرچی بھٹو [illegible] کانونشن لیگ [illegible] بھٹو [illegible] کانونشن لیگ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] ۔ [

کے تجربے کرنے کی اجازت دے گا۔

ان دونوں گروہوں میں فیصلہ کن تصفیہ کیسے ممکن ہو سکتی تھی۔ یہ بات اگر بھی کہ دونوں مختلف نظریات پر پرورش پائے ہوئے دو گروہوں کے ترجمان کبھی بھی ایک ہی حیثیت دلوانے کے سلسلے میں بیٹھ کر سر کے کوئی متفقہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔

وزیراعظم لیاقت علی خان، جن پر جناب حسین شہید سہروردی صاحب کے مقابل نے بڑا فوجداری کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں دائر کیا تھا، کی شہادت کے ساتھ ہی یہ مقدمہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ ان میں مسلم لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۲ء کو مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے خواجہ ناظم الدین کو اپنا لیڈر منتخب کیا۔ ۱۹۵۳ء کو وہ وزیراعظم بنے۔ ۱۹۵۴ء کو ان کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ ۱۹۵۵ء کو وہ مشرقی پاکستان کے وزیراعلیٰ بنے۔ ۱۹۵۸ء کو ان کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ ۱۹۶۴ء کو وہ مشرقی پاکستان کے گورنر بنے۔ ۱۹۶۴

۱۳ اور ۱۴ مارچ ۱۹۵۳ء کی درمیانی رات کو فوجی عدالت نے ان کو موت کی سزا سنائی۔ ۱۴ مارچ کی صبح کو ان کے وکیل نے لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ ۱۵ مارچ کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ مارچ کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ مارچ کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ مارچ کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ مارچ کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۱ مارچ کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۱ مارچ کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ اپریل کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ مئی کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ مئی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ جون کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ جون کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ جولائی کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ اگست کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ ستمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۱ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۱ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۲ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۲ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۳ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۳ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۴ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۴ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۵ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۵ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۶ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۷ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۷ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۸ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۸ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۹ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۹ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۰ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۰ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۱ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۱ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۲ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۲ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۳ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۳ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۴ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۴ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۵ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۵ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۶ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۶ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۷ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۷ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۸ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۸ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲۹ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲۹ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳۰ نومبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۰ نومبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۲ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۲ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۳ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۳ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۴ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۴ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۵ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۵ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۶ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۶ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۷ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۷ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۸ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۸ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۹ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۹ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کے لیے ۱۰ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۰ دسمبر ک

ن کے مدر کا سیاست داں سرگرم عمل ہو گیا۔ انھوں نے وقت کے ایسے مرکز کی تشکیل کی کوششیں شروع کر دیں جو ان کے محسن کے لیے ایک چیلنج تھا۔

بنگالیوں سے پنجابیوں کی نفرت کا الزام اس سے پہلے بھی لگتا رہا ہے۔ سکھ دیش کے مابعد واقعات سے بعد ان تعلقات کے سلسلے میں پہلے بھی کافی لکھا جا چکا ہے اور اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پنجابی بنگالی کے بارے میں یا محسوس کرتا ہے اس سے لطف اٹھانے کے لیے صرف ایک اقتباس کافی ہوگا۔ اقتباس صدیق سالک کی ایک بہت اچھی کتاب سے لیا گیا ہے۔ صدیق سالک ۱۹۷۱ میں ڈھاکا میں پاکستانی فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے متعلق تھے اور یہ وہ ایک ایسے شخص بھی تھے جس نے جنگ کو شکست خوردہ فریق کی طرف سے دیکھا تھا۔ اپنی کتاب Witness to Surrender (سرنڈر ڈیموکریٹک پریس کراچی، ص ۹۴) میں سالک ان طریقوں کا بیان کرتے ہیں جو بھائی، چچا زاد اور ۱۹۷۱ کی جنگ کے اصلی آغاز سے قبل بنگالیوں سے برتاؤ کرنے میں استعمال کرتے تھے۔ آزادی اور خود مختاری کے جوش میں مبتلا ہونے کی بجائے وہ مغلوب (Bagos) کو قابو میں رکھنے کے لیے خوف و دہشت کے دور دورے کو ضروری سمجھتے تھے۔ Bagos بنگالیوں کی تذلیل کے لیے ایک خاص سینڈھرسٹ اور سیالکوٹی اصطلاح تھی۔ مشرقی پاکستان کے ان بگوز نے آئینی قوت کے سلسلے میں جو سوال اٹھایا تھا، وہ محض تعداد کے لحاظ سے یہ لوگ مغربی پاکستان کے فیرنگوز سے زیادہ ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ پاکستان کا موجودہ علاقہ چار صوبہ آزاد ریاستوں میں منقسم تھا، کوئی صورت نہیں تھی کہ کوئی انفرادی طور پر بنگالیوں کو ایک فوجی وٹ کی سربراہی حاصل ہونے سے روک سکے۔ اس سلسلے میں ہتھیار ڈالنے کے بجائے پنجابیوں نے اقتدار کی اکاس بیل کے پھیلنے بڑھنے کو ترجیح دی۔

۱۹۵۲ء بنگالی پاکستان کے اساسی نظریات کی طرف سے تشکیک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ عوامی مسلم لیگ نے اپنے نام سے دانستہ طور پر مسلم کا لفظ نکال دیا تھا۔ بات یوں نہیں تھی کہ تقسیم کے وقت بڑے پیمانے پر انتقال آبادی کے باوجود جن کروڑ مسلمانوں نے ایک متحدہ صوبہ تقسیم سے پہلے مشرقی بنگال میں رہنا تھا بدستور مشرقی پاکستان میں قیام پذیر رہے۔ اسی دوران ستمبر ۱۹۵۳ میں فضل الحق نے اپنی کرشک شرامک پارٹی پاکستان مزدور کسان پارٹی سے اور اس طرح ۱۹۴۷ کی سب سے اہم کامیابی کو شکست دینے میں مسلم لیگ کی ذہنی اور جاگیردارانہ سیاست کا اہم البدل فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں عوام نے اس کی مکمل طور پر تائید و تصدیق کر دی۔ مسلم لیگ (پاکستان مسلم لیگ) پارٹی ۱۹۷۰ء میں کیا کر رہی تھی اس بات کو بنگلی اندازہ ۱۹۵۴ کے ان انتخابات میں اس وقت ہو گیا جب اس نے ۳۰۹

نشستیں کے یونین میں کل نشستیں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں مسلم لیگ کو تنگ شرکت پارٹی اور دوسری چھوٹی جماعتوں کے متحدہ محاذ سے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی

مگر بھاشانی اور حق نواز کی "کیبنٹ" کو زیادہ عرصہ تک چلنے نہیں دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے ایک نیا آئین نافذ کیا۔ اس آئین کے تحت ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخابات ہوئے۔ ایوب خان کے مقابلے میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کھڑی ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں عوام نے محترمہ فاطمہ جناح کو بھاری اکثریت سے ووٹ دیئے۔ مگر مغربی پاکستان میں ایوب خان کو زیادہ ووٹ ملے۔ اس طرح ایوب خان صدر منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کے خلاف ملک گیر تحریک چلی۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایوب خان نے استعفیٰ دے دیا۔ اقتدار جنرل یحییٰ خان کے ہاتھ آیا۔ جنرل یحییٰ خان نے ۱۹۷۰ء میں ملک میں عام انتخابات کرائے۔ ان انتخابات میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ نشستیں حاصل کیں۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے ۸۱ نشستوں میں سے ۸۸ نشستیں حاصل کیں۔ عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہوئی۔ اس لیے شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم بننا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے نے شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم بنانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک شروع ہو گئی۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں فوجی آپریشن شروع ہو گیا۔ اس آپریشن کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا۔ اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آیا۔

مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کے بعد مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی۔ بھٹو صاحب نے ۱۹۷۳ء میں ایک نیا آئین نافذ کیا۔ اس آئین کے تحت ۱۹۷۳ء میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ بھٹو صاحب وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب کے خلاف ملک گیر تحریک چلی۔ اس تحریک کے نتیجے میں بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہو گئی۔ اقتدار جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ آیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی۔ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں محمد خان جونیجو وزیر اعظم بنے۔ ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق کا طیارہ تباہ ہو گیا۔ اس حادثے میں جنرل ضیاء الحق جاں بحق ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں ہی محمد خان جونیجو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۸۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۹۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۹۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۹۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۹۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۹۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۹۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۰۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۰۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۰۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۰۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۰۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۰۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۱۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۱۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۱۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۱۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۱۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۱۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۲۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۲۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۲۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۲۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۲۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۲۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۲۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۲۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۳۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۳۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۳۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۳۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۳۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۳۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۴۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۴۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۴۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۴۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۴۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۴۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۵۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۵۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۵۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۵۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۵۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۵۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۵۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۵۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۶۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۶۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۶۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۶۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۶۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۶۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۷۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۷۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۷۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۷۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۷۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۷۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۸۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۸۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۸۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۸۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۸۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۸۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۸۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۸۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۹۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۹۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۰۹۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۹۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۰۹۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۰۹۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۰۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۰۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۰۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۰۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۰۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۰۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۱۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۱۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۱۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۱۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۱۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۱۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۱۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۱۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۲۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۲۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۲۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۲۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۲۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۲۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۳۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۳۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۳۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۳۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۳۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۳۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۴۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۴۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۴۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۴۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۴۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۴۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۴۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۴۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۵۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۵۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۵۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۵۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۵۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۵۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۶۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۶۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۶۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۶۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۶۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۶۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۷۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۷۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۷۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۷۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۷۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۷۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۷۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۷۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۸۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۸۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۸۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۸۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۸۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۸۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۹۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۹۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۱۹۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۹۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۱۹۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۱۹۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۰۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۰۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۰۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۰۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۰۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۰۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۰۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۰۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۱۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۱۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۱۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۱۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۱۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۱۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۲۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۲۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۲۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۲۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۲۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۲۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۳۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۳۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۳۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۳۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۳۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۳۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۳۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۳۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۴۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۴۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۴۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۴۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۴۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۴۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۵۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۵۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۵۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۵۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۵۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۵۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۶۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۶۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۶۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۶۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۶۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۶۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۶۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۶۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۷۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۷۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۷۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۷۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۷۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۷۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۸۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۸۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۸۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۸۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۸۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۸۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۹۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۹۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۹۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۲۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۹۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۲۹۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۲۹۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۰۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۰۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۳۰۵ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۰۵ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۰۸ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۰۸ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۳۱۱ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۱۱ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۱۴ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۱۴ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۳۱۷ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۱۷ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۲۰ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۲۰ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۳۲۳ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۲۳ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۲۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۲۶ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ ۲۳۲۹ء میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۲۹ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بن گئیں۔ ۲۳۳۲ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ۲۳۳۲ء میں ہی ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف وزیر

ھ ئی ۱۹۵۵ء میں ۔۔۔ ری آمن سا ۔ کمل ا شکیل ہوئی خواہش میں اس نے پہلے ۔ ۔ کمل ۔ ۔ ۔

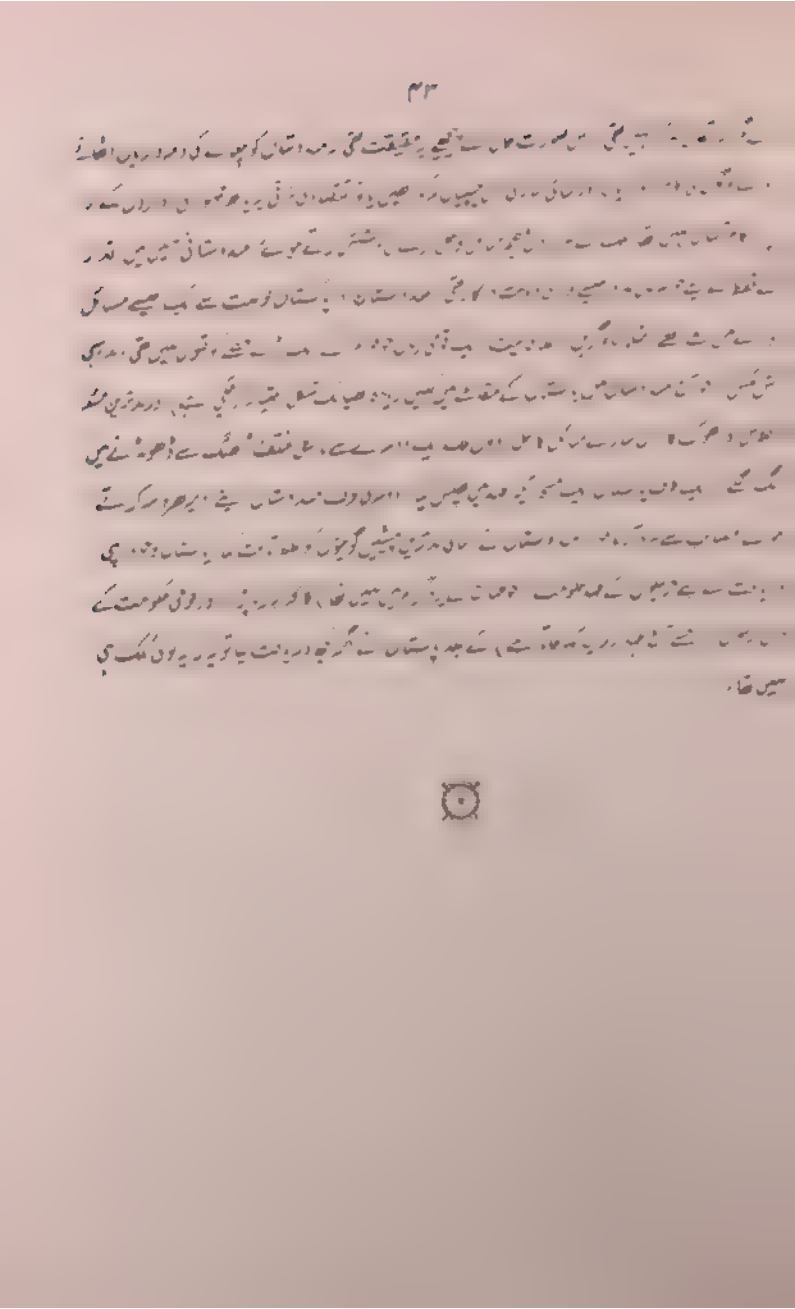

(۳)

آقا نہیں دوست

جنوری ۱۹۴۸ میں جنرل ایوب خاں (بعد کو خود اپنی کارگزاریوں اور کارستانیوں سے متاثر ہو کر جنھوں نے اپنے آپ کو فیلڈ مارشل مقرر کر لیا تھا) کو حضرت قیصر کا مذاق مستری، پاکستان کا لقمہ دینجانے کے لیے وزیرستان کے گرانی پیمانہ کی کمان سے تبدیل کر دیا گیا۔ آیئے اب نظر حضرت کے کیریڈ میں ان کے بارے میں ساری معلومات کا خود ساختہ کا خود نوشت سوانح عمری رہے گی۔ یہ کتاب جون ۱۹۶۴ میں اس وقت لکھی گئی جب وہ عمری کے بیماری مقدمہ پر آرام فرما رہے تھے اور پاکستان میں اپنے اختیار و قدرت کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھے۔ "کنسٹرکٹو ڈیوٹی ورسٹی پریس کی پاکستان شاخ نے جب ۱۹۶۷ میں یہ کتاب تیاری کی اس وقت تک ایوب خاں کے لیے حالات سخت کم سازگار ہو گئے تھے۔

سوانح عمری کا عنوان "آقا نہیں، دوست" بڑا معنی خیز ہے۔ مگر حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ دنیا کے بارے میں پاکستانی عوام کیا سوچتے تھے تو اس عنوان کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے۔ کتاب کا آغاز دیباچہ دعائیہ سے ہوتا ہے جس کے نیچے قرآن کی ایک آیت ہے جس کے ذریعہ حکومت کو مالکانہ میں جینے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود بدلے"۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ ہی حالت کے بدلنے کا (اقبال)

ایوب خاں نے پاکستانی عوام کی حالت کو بدلنے کا عزم کیا، کیوں کہ ۱۹۵۸ تک ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے وہاں جو تبدیلیاں کیں وہ مزید بہتری کے لیے تھیں۔ "وقت" جیسے بھیانک خطوں کے ذریعہ پاکستان کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو سوانح کا پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ کتاب سے اس رویوں کا ادراک بھی ہوتا ہے جنھوں نے بعد میں پاکستان کی تاریخ کی تشکیل کی۔

[illegible]

سیاست دانوں نے اس حقیقت کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ فوج کو مشق کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے ذہن سیاسی عقاید کی سرزمین میں پروان چڑھے تھے۔ آپ کسی مصنوعی تحلیل پر حکومت نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ فارسی طور پر نظم و ضبط فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ بات بالکل منطقی تھی کہ کوئی بھی سیاسی حکومت برقرار نہ رہ سکے گی۔ بہرحال اصل مسئلہ باقی رہا۔ نظم و ضبط فراہم کرنے کے پیچھے قوتوں نہیں تھا۔ اس اختیار کچھ نہیں تھا۔ عوام کو محکوم کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کسی ملک کی تعریف اس کے صرف جغرافیہ نہیں کر سکتے۔ مسلمان جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں وہ اس کا اظہار نہیں بھی کر سکتے ہیں۔ فرانس اور امریکہ میں بھی، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی یہی ہے۔ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ مصر کی بغاوت کے بعد جس سب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پاکستان کے دس سال بھی کوئی ایسی نہیں ہے جس پر سارا ملک متفق ہو۔ آئین لفظیات کا مجموعہ ہیں جو عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔

فوجیوں کو اگر کسی پر بھروسہ تھا تو وہ خود اپنے آپ پر۔ اور یہ ایک کھلا راز تھا۔ اسے درمیان کا راستہ تلاش کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایوب خاں نے اس وقت ملک بغاوت نہیں کی جب تک کہ وہ خود ان صلاحیت اور اس اعتماد سے مستحکم نہیں کر لیا جو اس کی دو جنگیں تھی ہیں تو پاکستان کا ایک واحد ادارہ بن گیا جو منظم کی صلاحیت حاصل کر لی۔ اسی غیر مستحکم حالت تک پہنچ جاتا جہاں سارا ملک پہنچا ہوا تھا۔ ۱۹۷۱ میں بہرحال فوج ہی ملک کو بچا سکتی اور یہ وہی فوج ہے جو ایک ملک کو خود اپنے آپ سے بچا سکتی ہے۔

حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش کرنے والی فوج کی قیادت نہ تو ایوب خاں کر رہے تھے اور نہ ہی یہ کارروائی ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ کوشش اس وقت ہوئی جب ۱۷ فروری ۱۹۵۱ میں پہلے پاکستانی فوج کے جنرل سر فرانسس گریسی سے ملک کی فوج کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لی تھی (جنرل گریسی وہی تھے جنہوں نے ۱۹۴۸ء کی جنگ میں کشمیر میں اپنی فوجوں کو بھیجنے کے جناح صاحب کے حکم کو نہ مانتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے احکامات اگلی تک ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لیتے ہیں۔) اپنے برطانوی پیش رو سے پیل بات ایوب خاں کو جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ فوج میں "بیگ ٹرکس" کا ایک گروپ ہے جو ملک اور اس کے کمانڈر ان چیف کے لیے درد سر بن سکتا ہے۔ جنرل گریسی مزید زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکتے تھے وہ یہ تھا کہ میجر جنرل کبھی جیسے افسر "عجیب و غریب" تھے۔

ایوب خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کے شک و شبہ کا اظہار وزیر مظم لیاقت علی خاں نے

تین دن لگ جاتے تھے وہ تمام دارے جو محصول آبپاشی کے وقت ہمیں ورثے میں ملے تھے بعد کو ہم نے خود بنائے تھے، ایک ایک کر کے منہدم ہوتے جا رہے تھے۔ جنرل سیاسی ملک میں شامل ہو گیا تھا انتظامیہ کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جسے شخصی سیاسی مفادات کو داغ دینے میں ملوث نہ کیا گیا ہو۔

۲ جون ۱۹۵۸ء کو وزیر اعظم فیروز خاں نون نے ایوب خاں کو کل مدار ان چیف کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے مزید دو سال اور دیئے۔ ۷ اکتوبر کو جنرل ایوب خاں نے خود اپنے لیے تھوڑی اور توسیع کا فیصلہ کیا مگر اسی کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کارروائی کے لیے وہ فوراً ہی مہینے تک بہت سرگرم رہے۔

اس زمانے میں انھوں نے جو ڈائری رکھی اور جس کے بہت سے حوالے انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دیئے ہیں، اس میں انھوں نے لکھا ہے ۳ مئی ۱۹۵۸ کو انھوں نے میگ میں بیگم ناہید خاں سے ملاقات کی۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ فوراً دس سال تک بہت حکومت رکھی جائے (در حقیقت یہی مدت تھی جس میں یہ حکومت قائم رہی) اور پھر وہ پر لگا کر اڑ جائیں گی اور "شہزادہ بھیلا" جس نے ملک کو توڑ ہی ڈالا) ڈوبتی ہوئی ناؤ سے بچ نکلے گا۔ جہاں تک اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر رہے تھے اس زمانے میں وہ کتاب ان کے زیر مطالعہ تھی جس کا نام تھا "اور جنھوں نے ہندوستان پر حکمرانی کی۔"

۴ اکتوبر کو ایوب خاں کراچی کے ذریعہ اپنے مخصوص ڈبے میں بیٹھ کر کراچی پہنچے جہاں جنرل حامد اور جنرل یحییٰ خاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ۷ اکتوبر کی شام کے سات بجے تک وزیر اعظم نے اپنے سنہ وار محاذ کے ساتھیوں کے آپس جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے باہمی مصالحت کی راہ نکالنے کی کوشش کی مگر آٹھ بجے تک مصالحت کی ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں صدر اسکندر مرزا کے تعاون سے ایوب خاں نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے مارشل لا کی تعمیل کر دی۔

پاکستان کی تاریخ کو نہایت مختصر جائزہ میں ناپا سکتا ہے دو پرانے پاکستان میں اور دو نئے پاکستان میں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک بنیادی اقدار کا شعور ہوتی ہوئی، سولین حکومت، موجودہ پاکستان میں ۱۹۰۱ سے ۱۹۰۰ تک رہ نمائندوں کی نمائندہ ہوتی ہوئی جمہوریت ۱۹۰۰ء کے بعد سے کہ ہم خود دیکھ رہے ہیں ایک فوجی آمریت جو اپنے اقتدار کو مستقل تسلیم دینے میں مصروف ہے۔ ۱۹۰۰ء سے غیر متوازی عہد ہیں۔ مستقل، حتیٰ کا عکس، سوائے اس کے کہ دوسری بار کی سویلین اور جمہوری حکومتیں پہلے دور کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور شاہ کن تھیں۔

جمہوریت کے میدان میں پاکستان کا بنیادی تجربہ، اس خاص قسم کی کامیابی، جھوٹے دعووں کی مبالغہ آمیزی اور ناامیدی کی تمثیل میں سامنے آیا دوسرا تجربہ، ایوب دور کے، ذہانت، مقاصد سے نیچے گر کر مخلوط، حواس جو جانے کی

[illegible]

عشائی تعمیت کا یہ دور ہیلوان کے پرنس پیدائر حامد حسن کے ایک تجربے سے ساتھ آتا ہے
[illegible] ورزش [illegible]
[illegible] ہیلوان [illegible]
[illegible] ہیلوان [illegible]
[illegible] ہیلوان

Acc. No. 050...

کرنے ہوئے، فوج کی حمایت کی۔ فوجی حکومت نہیں ہوئی۔ ایوب آمریت نہیں ہوگا۔ میں عوام کا خادم ہوں۔ مجھے آپ کی ۱۰ کی ضرورت ہے۔ آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی رضامندی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ جمہوریت کے لیے کی ہوئے، ان کے اعتماد میں ساڑھے پانچ سال تک لگاتار عوام یہ عہد دہرا کوئی معمولی عہد نہیں تھا۔

اس سے قبل ہم نے جن خیالوں سے بات کرتے ہوئے بھٹو صاحب کے متعلق "دستوں کا ایک نیا دور" کی بات کی تھی، اس وقت بھٹو صاحب نے اپنے بنیادی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ خیالات کیا تھے، اس کا اندازہ بھٹو صاحب کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ۱۹۶۲ء میں جمہوریت اور اپنے بارے میں خود بھٹو صاحب یہ بات مختلف انداز سے کہہ رہے تھے اور اس عام خوش فہمی کو مسترد کر رہے تھے کہ پاکستان کی آبادی میں سے پڑھے لکھے لوگ اس بات سے یقیناً واقف تھے کہ مغربی جمہوریت کا نسخہ ہمارے لیے موزوں نہیں ہے۔ بہرحال، عوام اور مسئلوں کی کرداری کو یقینی بنانے والے اداروں کی تشکیل اور ان کے استحکام کے لیے کچھ کرنے کے بجائے بھٹو صاحب نے ان کو ایسے تحکمی اقتدار کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

مارشل لاء ختم ہونے کے بعد ہی سے طلبہ میں مقبول ہونے کے چند ماہ بعد بھٹو صاحب نے ۱۹۶۹ء کی بغاوت کی راہ ہموار کی۔ اس بغاوت کی کامیابی کو خود بھٹو صاحب کی نظر سے دیکھیں گے تو ہمیں ان کے تین سال بعد ۱۹۷۲ء میں جب وہ برسر اقتدار آئے، ان کے ایڈیٹروں، دانشوروں کا کردار سامنے آ جائے گا۔ ان سب نے مل کر ایوب کے خلاف جو تحریک چلائی تھی، اس کا بنیادی مقصد پاکستان کی آزادی کے لیے پاکستان پر سب سے زبردست حملہ قرار دیا۔

یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی۔ بھٹو صاحب نے، جن میں کس قسم کی جمہوریت ہے۔ ضیا حکومت کے خلاف سے تاریخ ہونے سے آج تک میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ صاحب! ہمیں ان میں دیئے گئے بہت سے انتباہات کو بھٹو کے سیاسی حریفوں کی ذاتی کمزوریوں سے منسوب کر دیا ہے۔ ان کی بات ہے ان پر تنگ و تشہیر کی پرچھائیاں ہیں لیکن پھر بھی ہم ان تنہا بیانوں کو ان کے کل کردار میں بھٹو صاحب کے زمانے کے سرکاری دستاویزات سے لی گئی ہیں تب بھی یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اگر بھٹو نے کسی کا مذاق اڑایا تو وہ خود ان کی ذات تھی۔ یہ وہ شخص جس نے انھیں سنجیدہ معنوں کسی مسئلے پر جیلیے پر کسی کو تنقید کی، وہ صرف ان کا کلک کا نشانہ قرار پایا۔ مسٹر بھٹو نے ایک ایسی غلطی کی جو کوئی دوسرا کر سکتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ آدمی رہے سے اختر کرتا۔ انھوں نے مجھ جیسی باتیں تحریری شکل میں، اور خود سرکاری دفتروں میں ۱۹۶۹ء میں ۱۹۶۶ء میں ہونے والی تحریک مزاحمت کے بارے میں وہ باتیں اس حقیقت کی نشاندہی

بھٹو کے بارے میں ان کی قابلِ رحم بے بسی بڑی عبرت ناک ہے۔ بھٹو نے کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ان کی جارحانہ پالیسی کے آخر میں کوئی ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگیں گے اور کوئی سوال تک بھی نہیں۔

مگر فوج جس کے لیے بھٹو صاحب نے اتنا کچھ کیا اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا، ان کے خلاف کیوں ہو گئی؟ اور ضیاء نے کن وجوہات کی بنا پر بھٹو صاحب کے جنرلوں کو ہٹا کر اپنی طرح کے جنرل کو آگے بڑھایا تھا کس طرح ان کو پہلے نیل صحرا اور پھر چالیس کے قحط میں۔

۱۹۶۹ میں ایوب سے لگ ہونے کے بعد بھٹو صاحب کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اقتدار تک پہنچنے کا راستہ ان کے لیے صرف جمہوریت ہی کا ہے کیونکہ فوج تو ان کو اپنی مدد سے اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہونے دے گی۔ انہوں نے فوجی حکومت کے خلاف ایک بڑی سیاسی تحریک شروع کی۔ ۱۹۶۹ میں اصغر خان، خواجہ طارق علی (مصنف [illegible]) سے ایک ملاقات میں [illegible] نے ان سے درخواست کرتے ہوئے کہا تھا "تم کچھ بہت بڑا کرو۔ صرف تم یہ پاکستان کے دروازے سے [illegible] کر سکتے ہیں۔ [illegible] سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے [illegible] ہیں، یہ واحد چیز ہے جو کام کر سکتی ہے۔ یہ واحد موقع ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

خواجہ طارق علی نے اپنی کتاب میں انتہائی معقول طور پر لکھا ہے بھٹو اور ان کی حکومت کے وقتی [illegible] نے انہیں ان کی زیادتیوں سے بچانے کی [illegible] میں، مقابلہ آرائی کے لیے وکیل دیا۔ طلاق نے قومیتوں کو [illegible] ہے متحد کیا۔ [illegible] کر بھٹو صاحب نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک [illegible] کا آغاز کیا۔ [illegible] کی وجہ یہ بھی کہ بھٹو صاحب خود ایک سندھی تھے اور یہ طاقت باوجود اس کے [illegible] کے حصول کی خاطر [illegible] نہیں ہوا تھا، ان کی حکومت سے کچھ مذاکرات بھی کیے تھے۔ حکومت پنجاب میں [illegible] بھٹو صاحب نے اپنے [illegible] میں اس بات کا اظہار کیا کہ آپ کو اپنی توقع کے مطابق [illegible] ملتا ہے۔

لوگوں کو [illegible] میں [illegible] کی جاگیر تقسیم کرنے کے لیے [illegible] ایک جاگیر [illegible] اسٹیٹ تھی [illegible] ۱۹۷۰ کے لگ بھگ [illegible] ۱۹۷۱ میں [illegible] کے لیے [illegible] فوج بھیجی، ۱۹۷۹ میں [illegible] کی [illegible] کو [illegible] کی [illegible] دی گئی [illegible] دست [illegible] [illegible] [illegible]

تعارف کرانے کے لیے بھٹو نے معمر قذافی سے درخواست کی۔ انھوں نے قذافی سے کہا کہ روس کے مفادات کی حفاظت سے کچھ کرنے پر تیار ہیں۔ قذافی نے ماسکو سے رابطہ قائم کیا جو اس وقت ماسکو رہے تھے۔ یہیں بھٹو کی اس ہیٹلر کتنی لے ہارے میں تایا اور بھٹو نے جس میں وہاں وکالت کی درخواست کی۔ ماسکو نے ان سے کہا کہ انھوں نے روسیوں سے اس کام کی کوئی قیمت مقرر کرنے کو کہا تھا۔ پاکستان، ذکر، کام سب بیکار ہے۔ بہت ہوکسی اور قذافی بھٹو کے ہاتھ سے چلا گیا۔ قذافی ہاتھ سے چلا گیا یا انھیں ہٹا دیا گیا۔ فیصلہ جانبدار ہے۔ اس پر تسلا یا گیا۔ بہرحال یہ تھا پاکستان کی جمہوریت کے دوسرے اور زیادہ المناک تجربے کا۔

(۴)

اہلِ ایمان

جب کسی وفاقی قوم کسی علاقوں کے خلاف کامیابیوں کی مزاحمت کے قریب پہنچتی ہے وہ علاقہ جو قوم کے کسی حصے میں ہے کچھ لوگوں میں کوئی گروپ جو بہت زیادہ بڑھتا ہے جانے والے علاقوں کی جگہ کو پر کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ کچھ وقت کے لئے ان کے درمیان جنہوں نے جدوجہد میں شاندار شرکت کی تھی، کچھ علاقوں کو اقتدار کا حق دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ طاقتور گروپ کامیاب ہوتا ہے یہ میں بازی لے جاتے ہیں خصوصاً جب یہ سب خفیہ مخالف کامیابی میں شامل رہے تھے جو کہ کامیابی کے قریب پہنچنے ان کی بنیادی کمزوری تھی کے نقطہ نظر سے ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ بھٹو کو ختم کرنے کے مقصد کے لیے وہ اور کر سکتے تھے مگر کیا ان کی حمایت کے لیے عوامی حمایت جس کی ان کے پاس نہیں تھی۔ بھٹو مخالف کامیابی جب اپنے شباب پر تھی اس وقت بھی قومی حمایت پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے تو کسی اور موقع پر قبول عام حاصل کرنے کی ان کی صلاحیت سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ جائزہ پیش کرنے کا مصنف ہی کی ہیں ہے، کوئی اور نہیں خواجہ رفیع نے مئی ۱۹۸۲ کے ایک اداریہ میں یہ بات بڑی صفائی سے کہی تھی انھوں نے ۱۹۷۰ کے انتخابات کرانے کے فیصلہ کو پورا نہیں کیا ہے ان کی پیشگوئی کہ اس بات کا یقین تھا کہ وہ اکثریت نہیں حاصل کر سکتیں اور بھٹو اقتدار میں پیپلز پارٹی کو حکومت پر پھر آجائے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ۱۹۷۰ میں پیپلز پارٹی جیت گئی جو کہ پیپلز پارٹی تھی جسے ہم نے حال ہی میں کالعدم پارٹی کی مخالف پارٹیوں نے ... اس سے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ آپ حکومت بھی ان کے خلاف میں دے دیجیے ہم نے ہی پیپلز پارٹی کے لیے موقع کو ختم کرنے کے لیے مخصوص بنا رکھا ہے اس حکومت کو ختم کرنے کے بعد یہ بھی چاہا کہ ایسے اقدامات بھی کیے جائیں جن سے سیاسی قوتیں کالعدم کیا جا سکے۔ تمام مصطفیٰ قوم ... کب ایسی حکومت بنے جسے پاکستان کے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ میں نے کہا تھا کہ اس بات میں تضاد ہے کہ ایسی حکومت کو عوام کا اعتماد کیا حاصل ہو گا اور اس کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتی اس کے خلاف میں جو صاحب یہ فیصلہ کہتا ہے اس میں تضاد ہے۔

اس گفتگو میں مخلوط حکومت کا نظریہ جیسے ۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد پیش کیا گیا تھا اس کے خلاف دلائل دیے گئے ہیں۔ حکومت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی کسی کارروائی کا ارادہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی کسی کارروائی کا ارادہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی کسی کارروائی کا ارادہ نہیں کیا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء میں جو دن ہمیں تھا کہ ضیا ٹھوکے دن میں ہمارے ساتھ آپ کا وقت گزرا ہے

جب ضیا نے مصنف کو بتایا تھا کہ وہ جب تک جنرل ٹھوکے حکومت پر قبضہ رکھنے کے سلسلے میں بیدار رہے وہ اس کشمکش کے بارے میں اس وقت سننے آئی تھی جب میں مصنف نے اسے بتایا تھا کہ اس نے ۱۹۷۷ء میں کس طرح بھٹو کو بچانا چاہا تھا۔ میں نے ضیا سے خوب یاد کرنے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے جو سوال پوچھا تھا اس کا جواب ضیا نے کیا تھا۔ اس وقت کیا محسوس کیا تھا۔ جب ٹھوکے بھٹو کا تختہ الٹا تھا تو اس وقت کیا محسوس کیا تھا۔ اس وقت بھی ساری محسوس ہوا تھا۔ اس وقت بھی ساری محسوس ہوا تھا۔ اس وقت بھی ساری محسوس ہوا تھا۔

کسی قتل سے ہاتھ خون کے دھبے سارے دھو ڈالے پھر بھی پچھلے کی طرف کیسے جائیں یہ سر کی طرف سے منتظر ہیں۔ مجھے اپنی مصنف نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دوسری بات یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ وقت واقعی ہیں۔ آج ہی دن ہیں۔ میں صرف حساس ہوا تھا۔ وہ دن ہیں۔ وہ دن ہیں۔ وہ دن ہیں۔

ہیں۔ ہوتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ میں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔

کس طرح ہوتی ہے۔ تو پھر وہ کیوں مٹا دیے گئے؟ کیا تو ہوگا کہ کوئی بات تو ہوگی ہی یہ بات تھی کہ ہم نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔

کے علاقے میں، اور وہاں کے لوگوں کی بیٹیاں، بہنیں، ماؤں کے ساتھ کیا کیا گیا۔ لوگوں سے ساتھ کاروبار کی گئی اور یہ صرف سیاسی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا۔ کیا یہ سب سچ ہے؟ ہزاروں باتیں ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی سچ کہتا ہوں! جب مجھے یہ معلوم ہوا میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا کہ جب بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی تو آپ کو کیسا لگا تھا؟ آپ نے مصنف کو یہ بتایا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔

ہیں۔ ہوتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ میں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔

کس طرح ہوتی ہے۔ تو پھر وہ کیوں مٹا دیے گئے؟ کیا تو ہوگا کہ کوئی بات تو ہوگی ہی یہ بات تھی کہ ہم نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔ ہمارے ساتھ کیا کیا۔

کے علاقے میں، اور وہاں کے لوگوں کی بیٹیاں، بہنیں، ماؤں کے ساتھ کیا کیا گیا۔ لوگوں سے ساتھ کاروبار کی گئی اور یہ صرف سیاسی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا۔ کیا یہ سب سچ ہے؟ ہزاروں باتیں ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی سچ کہتا ہوں! جب مجھے یہ معلوم ہوا میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا کہ جب بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی تو آپ کو کیسا لگا تھا؟ آپ نے مصنف کو یہ بتایا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔

میں نے صدر ایوب سے کہا "پندرہ دن" اور یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے اور یقیناً یہ صحیح میں تھا اور وہ تھے صدر ایوب اور ان کی گفتگو یہی تھی یہی حقیقت تھی۔

ان پندرہ دنوں میں کیا کچھ ہوا، وہ کون سے رخنے تھے جن کا ذکر جسٹس منیر نے کیا تھا؟ جسٹس منیر یقیناً اس بحث کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو اس وقت فوجوں میں چل رہی تھی اور موضوع تھا دعوت و تبلیغ۔ وہ جیسے ہی گرفتار ہوئے تو اس کی تردید کر دی گئی۔ "نہیں جناب چیف جسٹس کی نیچ ہوئی" اور ایوب صاحب کو اپنی جان کی محبت بڑی پیاری تھی، جسٹس بھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی جو وہ تنہا جیل گئے۔

جنرل صاحب اس ہاتھ میں بندوق اور بائیں میں جمہوریت کی بھائی کے دھڑوں سے بڑا ایک تھپڑ برسائے رہے آئے اور چھ ہی دنوں میں بائیں ہاتھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔ انتخابات کی اجازت دے دی جائے گی مگر صرف اس وقت جب پاکستان ہیوی ڈیوٹی کور سے بالکل صاف کر دیا جائے گا۔ جسٹس منیر نے اس سلسلے میں مصنف کو بتایا کہ "جی ہاں اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے" میں نے کہا کہ "انتخابات تو ایک ذریعہ ہیں، بذات خود کوئی مقصد نہیں۔" بہرحال تو سرحال پاکستان میں نظام مصطفیٰ اور ایک خالص مذہبیت کا نظام چاہتے ہیں لیکن یہ سوچیا ایک وقت ہوگی کہ ایک ایسے پاکستان کو جسے وجود میں آئے ہوئے ابھی صرف چار سال ہوئے تھے محض اسلام کے نام پر چلایا جا سکتا ہے۔ اب حالیہ عرصہ کے بعد مشرقی پاکستان نے جمہوریت کی بازیافت کو اپنی بہت سی مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ ادارے کی بنا پر تھی، مگر جنرل یحییٰ خاں کی ایسے ملک کے لیے واحد دین یہ تھی کہ انھوں نے جہاں تک پاکستانیوں کے حافظے اور تجربے کی بات ہے وہ حقیقی انتخابات کرا دیے۔ ۱۹۷۰ء کے ان انتخابات نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ۹۴۷ کا ورثہ اب ختم ہو چکا ہے۔

⑤

کیا موسم سازگار ہو رہا ہے

ریاست سے نظریئے کو فلاں لیجیے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ درحقیقت ہوا یہ ہے کہ پاکستان نے ایک رکاوٹ کے بعد دوسری رکاوٹ کا سامنا کیا۔ مگر اس کی شخصیت کی ساخت ہی قائم نہیں ہوئی۔ بنیادی فلسفہ و مقصد لاگو نہیں ہوا اور عوام تاریکی میں راستہ پانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ یہ چاہے ۱۹۵۶ کا آئین ہو یا ۱۹۶۳ کا دستور، مارشل لاء ہو یا مارشل لاء نہ ہو، پیپلز پارٹی کی حکومت نظام اور پھر مارشل لاء اسی سبب سے ہماری قسمت خراب رہی۔ آپ کے سامنے آپ کی منزل واضح تھی آپ اس کے لیے چل کھڑے ہوئے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان بھی طرح مستحکم ہے اور ہم تاریکیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

یہ بڑا خوب صورت تجزیہ ہے فلسفہ اور نظریہ کی حقیقت کے سلسلے میں ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم جمہوریت چاہتے ہیں تو کیا ایک خرابی ریاست خود اس کی رنگینیوں کی توجیہ، تعریف، قدروں اور ان کی حلیف فوج کے بیان سے مطابق کرے گی۔ خواہ یہ نہیں مانتے کہ ایک اچھا مسلمان ہونے کے لیے آپ کو طاقت کے ذخیرہ ہونے کی یہ بھی ضرورت ہے۔ علاوہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ حدود، مذہب سے مسلسل یہ آزادی ان کے وجود کے لیے کوئی شرط ہے اس کے برعکس انہیں اپنے پڑوسی کے وسیع و عریض علاقوں میں جمہوریت اور آزادی کی تازہ ہوا پر رشک آتا ہے اور وہ بھی اپنے ہاں اسی جوش کو دیکھنا چاہتے ہیں جو انقلابی جمہوری آزادی کی مسرتوں سے ہم کنار کر دے جیسا کہ ۱۱ اکتوبر طبقے اور عوام کی جو شرکت ہوئی تھی اس وقت محسوس ہوتا تھا کہ یہ ملک اپنے قدم کو قائم رکھنے کے لیے بالآخر طبقہ ان پابندیوں کی طرف بڑھے گا جو قانونی طور پر عائد کی جائیں گی۔ ایک طرف اپنے قدم کو قائم رکھنے کے لیے،

جنرل ضیا نے دو حربے جو بہت کامیابی سے استعمال کیے ایک تو انتخابات اور اس میں حصہ نہ لینے کا کہ سندھ و انڈیا ایک ہے پھر سندھی پاکستان کی تحریک کا ساتھ کیوں دیں اور دوسرا حربہ سندھ میں مہاجر پٹھان جھگڑے کا پیدا کرنا۔ اس میں بھی وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ پاکستان، خصوصی طور پر جمہوریت کی حمایت میں رائے قائم کرنے میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سندھ میں کیا ہو رہا ہے۔ سندھ کے دانشور جو ان کے پیچھے تھے، کریدتے رہے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو باقی ملک سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ میری بیوی ریوو نے ان سے ملنے کے بعد مجھ سے کہا تھا "انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ سندھ کو ہندوستان کا حصہ بننے کو ترجیح دیں گے۔" انھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں موجود مقامی کی صاف صاف حمایت کی ہے اور سندھ کے عوام اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں شاید اسے شدت پسند سندھی قوم پرست کہہ سکتے ہیں۔ یہ علامہ مصطفیٰ کہنے نے افسانہ نویسوں کو بتایا تھا کہ کوئی محب وطن پاکستانی ان سے ملنا برداشت نہیں کرے گا۔ مگر حقیقت ان کے برعکس ہے۔ وہ اپنے حمایتی پاکستانی سے ملتے ہیں۔ پاکستانی فوج سے خوش ہے کیونکہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک بہتر مفاہمت ہو جائے گا۔ الخ الخ۔

ضیا نے جو کامیابی حاصل کی تھی وہ سندھ میں حاصل کی تھی اور یہ بھی لیکن اس کی بھی بہت حد تک وقت کے ساتھ ساتھ نظر آئیں جب میں ۱۹۸۴ میں پاکستان سے نکلنے سے بعد دنیا سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس وقت لکھنے کے رویہ، مرٹیلی گرف کے لیے لکھ رہے تھے گفتگو کرتے ہوئے ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ کو انھوں نے کہا "ہمارے ملک کی بھی سندھ میں حالت بڑی بری ہے۔ میری حالت تو ان مردوں اور عورتوں سے بہتر ہے جو بھی جرم نہیں ہوئے جیلوں میں ہیں۔ میں یہ جگہ ہی پر ہوتی ہوں مگر اس بات پر میں اپنے ملک میں آزاد نہیں ہو سکتی۔"

ڈیوڈ ٹائمز فروری ۱۹۸۴ کے نامہ نگار رحیم حمید نے لکھا تھا "ہزاروں کی تعداد میں فوج کی زیادتیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج میں جیلوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ان کی تعداد میں موسیقی، مگر پھر بھی، ترقی پسند ادیب کہیں ہیں۔ طلباء کے علاوہ بھی گئے ہیں۔ ان میں سے لیکچرز میں، ڈاکٹروں، عورتوں، دیہاتیوں کو جیلوں میں ڈالنے کی سزا دے کر جو کچھ انھوں نے کیا ہے اس نے ہر ایک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بہرحال صورت حال بلوچستان سے بھی زیادہ خراب ہے۔ زبردست قوتی طاقت استعمال کی گئی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۶)

گاندھی جی کی آتما کا مسکن

مسلمانوں میں [illegible] طاقت بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ گروہ ان ہندوؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو مسلمانوں پر حملے کرتے تھے۔ ان حملوں میں قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ کانگریسی وزراء کے [illegible] دور دورے میں ان کی بھیجت مقرر کی (فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان جانے کا سوچ رہے تھے) وہ اس کی [illegible] کو دیکھ کر بیمار ہو جاتے تھے۔ ۳۰ جنوری کو انھیں اس کام سے روک دیا گیا۔ انھیں، وہ کس طرح مسلمانوں کے [illegible] کہ یہ فرقہ پرست ہندو [illegible] مگر گوڈسے کی گولیوں نے یہ اعلان دیا۔ [illegible] کے بیچ جا کر [illegible] وقت [illegible] کے [illegible] کہ یہ شخص جانتا تھا کہ [illegible] کوئی مسلمان [illegible] کی [illegible] دیوانگی کی نشست میں سامنے آئے گا۔ مڈ ریڈیو نے ہندوستان کے معزز ترین شہری کی موت کی خبر [illegible] کو دی نہیں۔ اس کے مقررہ پروگرام بدستور چلتے رہے۔ ہاں پولیس نے قاتل کی شناخت کر کے [illegible] پر سے دباؤ کم کیا۔ جب بعد میں مڈ ریڈیو نے بالآخر ایک بیان نشر کیا تو اس میں کہا گیا کہ ایک [illegible] تھا "پانچ بج کر بیس منٹ پر دہلی میں۔ مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ اب ہندوستان کی موت نے ملک میں فرقہ پرستی کے کانٹے کو نہیں نکال دیا۔ اس وقت کے سب سے بڑے مسئلے کو ان کی قربانی نے حل کر دیا تھا۔ کانگریسی تو ورکنگ کمیٹی جو پاکستان میں تھیں، وہ ہندوستان میں بھی موجود تھیں۔ دونوں سے زیادہ گمبھیر مسئل میں۔ زبان، نسل، علاقائیت، اقلاس، سات کروڑ اچھوت چار کروڑ مسلمان پاکستان گئے، [illegible] رہے ہمارے جو اپنے جاگیر، راجا اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے، ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ تناؤ اور بے یقینی کے پہلے دو سال دہلی میں حکومت کے لیے مشکل ترین سال تھے۔ کئی برس گزرنے کے بعد مارڈونٹ بیٹن نے اور ان جیسی Larry اور Dominique Lapierre Collins کو بتایا تھا کہ ایک وقت ایسا آیا تھا جب نیڈت نہرو نے حقیقت میں سے کہا تھا کہ وہ آزاد ہندوستان کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ یہ بات یقیناً متنازعہ فیہ ہے کیوں کہ یہ بات فرد کی یاداشت پر مبنی کے ثبات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان حالات میں بے نسل لا ایک فلسفہ ضرور موجود تھا۔ جمہوریت پر عمل درآمد کو معطل کرنے کے لیے کوئی بہانہ بھی معقول ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جمہوریت اور آزادی نے کن قوتوں کی پیدائش میں کیا فرقہ پرستی کے [illegible] ہو جائیں گے؟ کیا لسانی ریاستوں کا مطالبہ انتخابات کے نعرے میں تشدد اختیار کرے گا؟ کیا ۱۹۴۶ء کی طرح بھوک [illegible] کو عوامی رائے عامہ کی مدد سے ایک بار پھر جیتا جا سکے گا۔ کیا فرقہ پرستوں کی صفیں ہو گی؟ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا آسان ہے کہ پنڈت نہرو کو اس بات کا یقین تھا کہ کانگریس بر دست فتح حاصل کرے گی مگر تھا سے

کے اس وقت کو تنی سمیدی سے نمو پیا۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

(۷)

طائرِ قفس کا عروج

[illegible] کے بعد کی عالمی صورت حال کے جواب تھے۔ اس سے بڑھ کر ایک ملک جو ایک صدی تک [illegible] کی دولت سے مالا مال ہوا تھا، وہ ہندوستان تھا۔ جب کہ ہندوستان کی جمہوریت کی [illegible] کی جو بھی تصویر پیش کیا جائے، صدی کے [illegible] ہندوستان کی حقیقی دولت اس کی [illegible] سے تھی۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جس نے [illegible] کی جدوجہد کو [illegible] سے [illegible] کا حق دے رکھا تھا۔

[illegible] سے بہت سے [illegible] تھے، جن کی [illegible] ملک کے سب سے بڑے [illegible] ہوئے کی [illegible] میں [illegible] کی [illegible] کی [illegible] کی

[illegible] کی [illegible] سے [illegible] کے [illegible] کے [illegible] ک

کا ایجنٹ بن کر سامنے آیا تھا۔

کے دیہی کلچر کا تانا بانا تیلگو اور مل یالم رسائی گروہوں پر مشتمل ایک جداگانہ فیڈریشن تھی۔ اگرچہ یہ ایک الگ تھلگ علاقہ تھا لیکن یہ علیحدہ تامل ملک تامل ناڈو کے علاوہ کوئی ذوراسی صورت قابل قبول بھی نہیں تھی۔ یہ آج ایک حقیقت ہے کہ اس زمانہ کا علاقہ حال مذکورہ بالا میں سے ہے۔ جس راجن نے مجلس نے ای وی آر کے ساتھ کام کیا تھا وہ ۱۹۴۸ء میں ڈی ایم کے قانون ساز کونسل کے اسپیکر بھی رہے تھے۔ انھی بزرگ سے مصنف کو تامل ناڈو کی خود مختار کونسل کی تشکیل کی تجویز پیش کرنے کی تحریک ہوئی۔

اس بات کا احساس بھی بڑھ رہا تھا کہ قدامت پرست ہندوؤں کے غلبے کے باعث دراوڑ تحریک حقیقت میں رجعت پسند ہو رہی ہے۔ اس تحریک کو عوامی حمایت دلتوں کی خوشامد سے حاصل ہوئی ہے جو ہندو سماج کے سب سے نیچے درجے کے لوگ ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں جسٹس پارٹی نے جو بعد میں دراوڑ کزگم کہلائی، ای وی آر کے ساتھ مل کر اپنا دستور مرتب کیا تھا۔ اس دستور کے مطابق پارٹی کا مقصد برہمنوں کے خلاف غیر برہمنوں کی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پارٹی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ اس کے باوجود ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں حصہ لیا جس میں اس نے ۲۸ نشستیں حاصل کیں۔ یہ تعداد ایک بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ای وی آر نے یہ بھی اس شرط پر حصہ لیا تھا کہ پارٹی کی سرگرمیاں سماجی اصلاح تک محدود رہیں گی۔ ۱۹۴۹ء میں جب کانگریس کی اکثریت نے جواہر لال نہرو کی تقسیم کے وقت ان کے ساتھ آگئی تھی، اتحاد کیا گیا تو ڈی ایم کے پارٹی کانگریس کے ساتھ مل گئی۔ ای وی آر کے لیے جنھوں نے اس کے نظریات کی تشکیل کی تھی یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس سے ان کی جگہ پر کسی کو بھی پارٹی کا صدر منتخب کیا جائے۔ انھوں نے صرف جنرل سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا۔ ای وی آر کی صحافتی موجودگی کو روکا گیا تھا مگر ان کے جذبات کی ذہنی بدستور تھی۔ کرسی صدارت پر پیریار کے لیے خالی ہی رکھی گئی۔

اگر اس سے قبل ۱۹۴۱ء میں علیحدگی کے ایسے مطالبے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی تو ملک میں ایک اور بھیانک آگ لگ گئی ہوتی۔

(۸)

فرد، جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا

[illegible] کے سب سے زیادہ [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

مطابق ۱۹۰۵ء یورپ، ۱۹۰۰ء تک ہر ملک دنیا کی بہترین سیاسی تدبر کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اس کی تعلیم یافتہ اشرافیہ کا ایک چھوٹا گروہ تھا جو تاج کے ساتھ وفاداری کے ساتھ ساتھ میدان جنگ اور عدالتوں کے ساتھ ساتھ دربار میں کام کرتا تھا۔ اس کی وفاداری کو ان کی تربیت کی گئی اور ۱۹۳۲ء میں "ڈیموکریسی" وجود میں آئی۔ ۱۹۰۹ء میں سلطنتوں کی شکست کے بعد یہ ملک ایک صوبہ بن گیا۔ ۱۸۵۶ء میں نیپلز، ۱۹۰۰ء میں سسلی، ۱۹۰۰ء میں ہنگری کا حصہ بنا۔ ۱۹۰۰ء میں آسٹریا کو غصب کر کے ۱۹۰۰ء میں ملک کا حصہ بنا۔ ۱۹۰۰ء میں یہ ملک کر دیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں سترنی نیپلز سے ساحل تک کرزن کے دو بنگالوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر ایک کو ایک صوبہ بنانے کے لیے ۱۹۰۰ء میں ایک صوبہ جسے انگریزوں نے بنایا وہ "بہار" تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء میں وجود میں آیا۔

۱۹۴۰ء میں ہندوستان کو مختلف علاقوں وسعت اور جیش دہ تعمیت کی حامل ۵۰۰ سلطنتیں یا ریاستیں ورثے میں ملیں۔ ان کے حجم سے یہ سب برصغیر کے دو تہائی سے زیادہ حصے پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے ۲۵ چھوٹی چھوٹی راجواڑہ ریاستیں جن کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی، موجودہ صوبوں سے منسلک تھیں۔ ۱۰ لاکھ کی آبادی رکھنے والے ۶ راجواڑے (ریاستیں) مرکزی نظامیہ کے حوالے کیے گئے۔ ۲۰۵ ریاستوں کو جن کی آبادی تقریباً ساڑھے تین کروڑ تھی، مدھیہ بھارت، راجستھان، گجرات، سوراشٹر اور ہماچل پردیش یونین ایسٹیٹ بنائیں، ان تبدیل کر دیا گیا۔ حیدرآباد، میسور اور جموں و کشمیر کی بڑی ریاستوں کو ان کی سابقہ حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ ان تینوں ریاستوں کو خصوصی حیثیت میں مدغم کرنا، پارلیمنٹ کی اس ملک کو آخری بڑی دین تھی مگر یہ وہ نہیں ہو جس کی عوام کو جستجو تھی۔ عوام تو اپنی ریاست اور اپنی تہذیب کی حدود میں رہنا چاہتے تھے نہ کہ نظامیہ کی حدود کے مطابق۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۱ کا دن تھا اور صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے جب مہاتما گاندھی نے اپنی خانقاہ سے ۲۴۱ میل دور بحر ہند کے ساحل پر ڈانڈی کی طرف کوچ شروع کیا۔ ۶ اپریل کو وہاں پہنچ کر ایک مٹھی نمک اٹھا کر ایک، پھر ایک مٹھی نمک اٹھا کر، تھا، جو ساری دنیا کو ہلا دینے والا تھا۔ مہاتما گاندھی نے اس نمک کے ذریعے ۶ اپریل سے شروع کر کے ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو گاندھی نے اس ملک کے عوام میں ۱۰ ہزار سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر

دم توڑ دیا۔ بھوک سے جاں دے دی۔

(۹)

اعزازات کی فہرست میں

جب انھوں نے اپنی سیاسی پارٹی کی جگہ کیک کی مٹھی کو دے دی تو پیری بی ای وی، راما سوامی، گیلاپ ڈرامہ بازی کر رہ گئے۔ مگر ان کے یہ ڈرامے بھی بہ حال بڑے موثر ہوتے تھے اور انھوں نے پارٹی کی روح کو بیدار رکھا تحریک کو زندہ رکھا ۱۹۵۲ میں اس معمر آدمی نے اعلان کیا کہ وہ صدر زمیہ رامائن کو جس میں رام اور راون کی لڑائی بیان کی گئی ہے، سرعام نذر آتش کریں گے اس اعلان کے بعد انھیں یہ لطف خود ہی کرنا پڑا کیونکہ ان کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مرض برہمنوں کے خطوط آنے لگے جن میں اُن سے کتاب کی بے حرمتی کرنے سے اجتناب کرنے کی درخواست ہوتی تھی ۱۹۵۱ میں انھوں نے علیحدگی کے تمام مطالبے کے اظہار کے طور پر ہندوستان کے آئین کو جلانے کا پروگرام بنایا جس وقت یہ معمر رہنما اعلانوں کی شاہ سرخیوں پر توجہ صدول کیے ہوئے تھے ڈی ایم کے میں اس کے حامی ست یہ جہد میں مصروف تھے۔

۵۲-۱۹۵۱ کے عام انتخابات کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ مگر ۱۹۵۶ میں تیروچیراپلی کانفرنس میں ڈی ایم کے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سی این انادورائی کی قیادت میں ۱۹۵۷ کے عام انتخابات لڑے گی۔ پارٹی کے بعض علی پروگراموں پر مثبت عوامی ردعمل نے پارٹی کے عہدوں کی حمتیں بڑھا دی تھیں۔ ن عمل پر دگراموں میں مثال کے طور پر ۱۹۵۴ میں انادورائی کی قیادت میں مدراس میں کمیسن کمیٹی کے دفتر سے جیسیر پارک دروازوں سے یہ نیا بیچ کے ساحل تک جلوس کے جانے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جلوس داروں کا کہنا ہے کہ جلوس میں تقریباً بیچ لاکھ افراد شریک ہوئے۔ سیاست دانوں کی معمولی جلسہ آرائیوں سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی بحیثیت مجموعی کرس میں عوام کی شرکت ڈی ایم کے کی مقبولیت کا ثبوت کرنے کے لیے کافی تھی۔ ۱۹۵۷ کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں پارٹی نے بڑی تعداد میں نشستیں جیتیں اور علیحدگی کے بعد ۱۹۶۷ کی قانون ساز مقام کے ایک رکن بن گئے۔ اس کامیابی کے نتیجے کے طور پر پارٹی کو ریاستی سطح نے تسلیم کر لیا اور یہ تمام

[illegible] ۱۹۶۲ [illegible] چھوٹے [illegible] تک محدود تھی [illegible] چھوٹے سے [illegible] کوئے [illegible] ایک [illegible] جس [illegible] حقیقی [illegible] صرف [illegible] تھے [illegible] اور [illegible] یہ حقیقت ہے کہ [illegible] جنگ [illegible] ہندی [illegible] بین الاقوامی [illegible] داخلی [illegible] سیاست [illegible] اقتصادی [illegible] ۱۹۶۳ء [illegible] آغاز کر دیا

[illegible] ہندوستان [illegible] [illegible] [illegible] کچھ [illegible] محسوس [illegible] [illegible] جیسے [illegible] [illegible] [illegible]

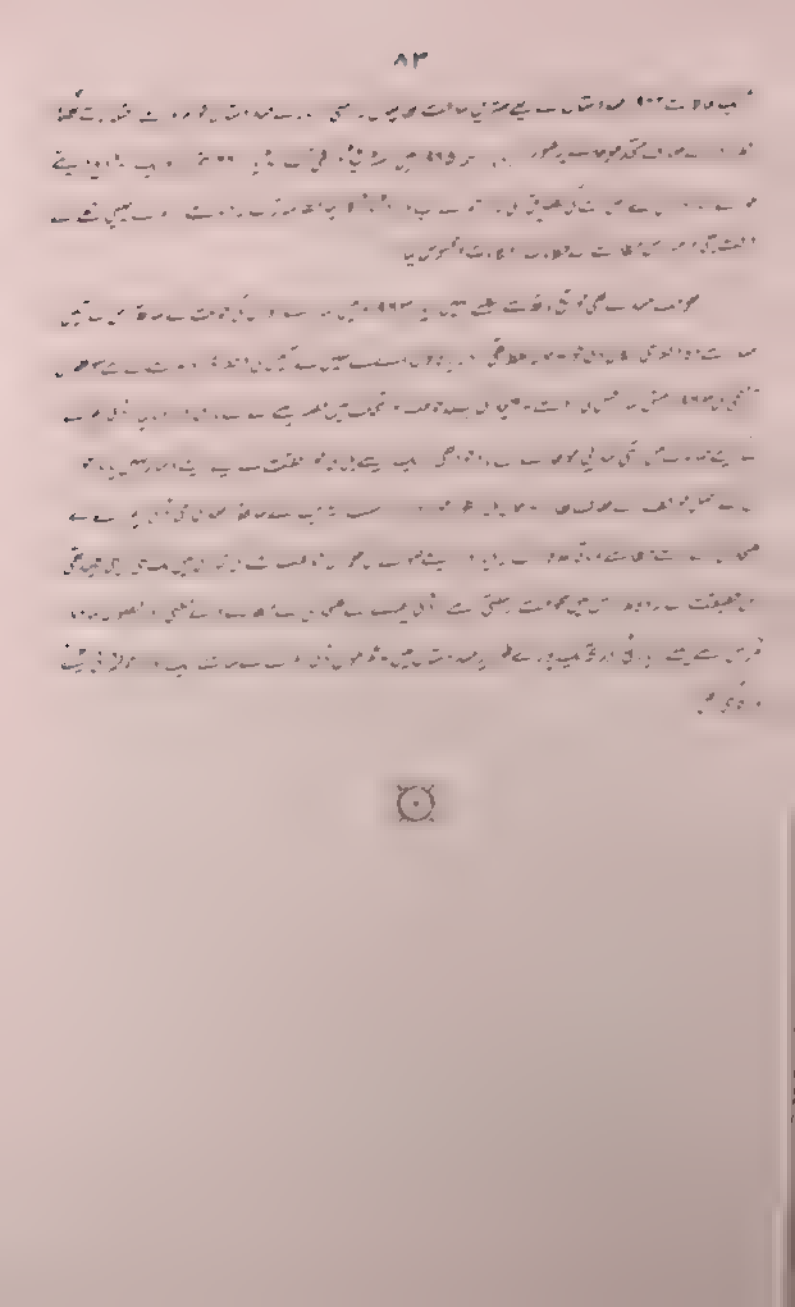

(۱۰)

مہاندی

یورپ کے جن لوگوں نے عثمانی اور مغلیہ سلطنتوں کا زوال اور ان کی جگہ یورپی چھوٹے چھوٹے ملکوں کی برتری کا مطالعہ کیا ہے ان کے لیے یہ بات خاص طور پر مشکل ہوتا ہے کہ یہ مختصر برطانوی سلطنت کے جو اب ایشیا کی عظیم قوت بن گیا کیوں نہ ہوا۔ اگرچہ بہت تاخیر ہوئی مگر یہ بھی ہندوستان کو عثمانی و مغلیہ سلطنت مستعار ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن جب انہیں پر ریاستوں کی تشکیل نے لیے جان دینے والے ایک سے ایک بڑھ کر تھے تو ہندوستان میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے قومی ریاست کی خاطر جینے کو مرنے پر ترجیح دی۔

۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کا جلاس ہوا جہاں ایک ہنگامی مسئلہ فیصلہ طلب تھا۔ آزاد ہندوستان کی قومی زبان کونسی کرنے کا مسئلہ ایک طرف وہ لوگ تھے جو جلد سے جلد انگریزی کے استعمال کو ختم کر کے ہندی کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے۔ ہندی کے حامیوں کے پاس جواز یہ تھا کہ چھوں صدی کی جو مردم شماری میں ہندوستان کی ۳۳۰ ملین آبادی میں سے ۱۴۰ ملین افراد ہندی سمجھتے تھے۔ دوسرے ذیلی کو اس فیصلے میں بقائے باہمی کا حصہ قرار دیا تھا۔ اسمبلی کے بہت سے اراکین اس بات سے خوفزدہ تھے کہ ہندی کو فوقیت دینے کا مطلب قدیم زبان کا درجہ گر جائے گا تو علاقائی زبانوں کا درجہ بڑھ جائے گا۔ اقتدار پسند حضرات چاہتے تھے کہ انگریزی اس وقت تک سرکاری زبان بنی رہے جب تک ہندی کو کوئی مقبول عام روپ دریافت نہ کر لیا جائے۔ گاندھی جی نے ۳۰ سال قبل اس دقت ہی ہندی کی حیثیت تسلیم کر لی تھی جب کانگریس اور کسی بھی سے ہندی کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے حامی نہ تھے۔ اتفاق رائے کے فیصلہ اب ووٹ کی اکثریت سے ہونا تھا۔ اس کا ووٹ تھا کہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کے لیے ۱۵ سال کا عرصہ دیا جائے۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی ہندی کو ہندوستان کی واحد سرکاری زبان بنا دیا جائے گا۔ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کے ان لوگوں کی ترجمانی کر رہے ہیں

ایک کا نقصان تھا۔

کتنے ہی ذہنی موضوعات میں تھے۔ خود کمیٹی میں موجود بعض ممبران پارلیمنٹ سے بھی ہندی کو قومی زبان بنانے کے خلاف ووٹ دیا۔ ان میں سے ایک ممبر نے ہندی کو قومی زبان بنانے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنے ضمیر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندی کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ ہندی سے جو لوگ ہمدردی رکھتے ہیں ان کی حمایت کا میں احترام کرتا ہوں۔ میں نے ہندی کی حمایت اس لئے کی ہے کہ میرا ضمیر اس کی حمایت کرنے کو کہتا ہے۔ میں نے ہندی کی حمایت اس لئے نہیں کی ہے کہ میں ہندی کا حامی ہوں۔ میں ہندی کا حامی نہیں ہوں۔ میں ہندی کی حمایت اس لئے کر رہا ہوں کہ میرا ضمیر مجھے ایسا کرنے کو کہتا ہے

[illegible] کی دلیل کا بھی جواب دیا کہ صدر کی حیثیت در حقیقت اس حقیقت کی ترجمانی ہے [illegible] ملک کا ۴۲ فی صدی حصہ تسلیم کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ حقیقت کہ یہ ۴۲ فی صدی حصہ تقریباً ایک ہی علاقہ میں آتا ہے اس خیال کو غلط ثابت کرتی ہے کہ یہ علاقہ سارے ملک میں ضم ہو جائے تو شاید اس زبان کا اعتماد [illegible] قبول ہو۔ اس سے ۴۲ فی صد زیادہ تر کب ہی ملاتے ہیں ہے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ [illegible] مکتا ہے بعض اخبار اور گنتیوں کی اکثریت سے پھر مسئلے حل کیا ہے؟ آئین میں ترمیم کے حالات کو بدستور رکھیے۔ مسئلے کا حل ہونے دیجیے۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ حل وہی کریں جو ہندوستان کے آخری حل میں ہیں ہو۔ ہماری کچھ زیادتیاں بھی ہوئی ہوں گی ہیں سیاسی نوعیت رکھتے ہیں آئے دن کے مسائل ہیں شاید [illegible] حل ہو جائے۔ اگر ہندی کی یہ حیثیت ایک حقیقت بن جاتی ہے تو [illegible] غیر ہندی صوبوں کے لوگ اس کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔"

یہ تھا کیا ہوا اس کی کچھ تھوڑی سی جھلک ہم نے پیش کر دی ہے۔ ۲۶ جنوری کے بعد ۱۹۶۲ء میں جب ڈاکٹر رادھا کرشنن کا تقاضا تھا اور شاستری جی ۱۹۶۴ء میں جب نہرو کی موت کے بعد حال ہی اور شاستری جی کی حیثیت بھی وہ پہلے مصلحت کے تحت قائم دور سے گذر رہی رہے تھے۔ پھر بھی ان کے ساتھ آگیا تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو باقاعدہ آئین میں یہ بات تھی جب ہندوستان ایک جمہوریہ بنا تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو اس بندرہ برس کی مدت ختم ہو رہی تھی جس میں انگریزی کے استعمال کو ختم ہونا تھا۔ یہ گرچہ ایک حقیقت تھی ۱۹۶۳ء کے ایکٹ نے اس پریشانی کو دور کر دیا تھا کہ اس تاریخ تک انگریزی زبان کا بستر لپیٹ دیا جائے گا۔ مگر جو لوگ اس سلسلے میں شبہات رکھتے تھے۔ مدراس میں ڈی ایم کے نے کر دھندوستان کے پندرھویں یوم جمہوریہ کو "یوم تاسف" کی حیثیت سے منانے کا فیصلہ کیا۔

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو مدراس کے وزیر اعلیٰ بھگوتی چرن کا انتقال ہوا۔ ہندوستانی اخباروں نے اس خبر کو شاہ سرخیوں میں شائع کیا۔ اخباروں کے پہلے صفحات طویل طویل سوانح عمریوں سے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک نے بڑے لمبے چوڑے تبصرے لکھے تھے۔ [illegible] کہا جا سکتا کہ اگر راجندر کو پہلے حملے کرنے کا موقع ملتا تو شاید سورج ہی نہ نکلتا۔ [illegible] ۱۹۶۵ء کے [illegible] ہندوستانی صوبوں سے ایک ایسی خبر تھی جو عام حالات میں پہلے صفحے پر شائع ہوتی تھی۔ [illegible] صفحات پر چھپا۔ [illegible] اردو اخبار ہی [illegible] کانگریسٹ کی جوں [illegible] کے بارے میں [illegible] ۲۶ جنوری یا ۲۹ جنوری [illegible] کانگریسی رہنما کا قتل [illegible]

ے ۔ ۔ ۔

کر چکے ان عہد دستانی سامعین کو جو شاید مجھے اس وقت سن رہے ہوں گاہ کر دینا چاہیے کہ میں راجہ جی کے معاملے میں بڑے سنہ در بے استعداد ہوں، مگر پھر بھی میری یہ کوشش ہوگی کہ جلی سینچنے پر میں مسلسل ۱۰ - وہ کام کروں جس سے میں، ان کے کم از کم آسان درسیدھے سادے خاندان سے، تعلق ہو جاتا ہے

مگر مدراس میں لوگ ایسی اسپیچ انقلابی کے موڈ میں کم تھے۔ گرو بڑے غدر تے محسوس کرتے ہوئے وہ سی وزیر علی جھکتہ دستم نے اندورائی اور ڈی ایم کے کے دوسرے قائد لیڈروں کو ۲۵ - ۲۶ جنوری کی درمیانی شب میں گرفتار کر لیا۔ مگر یہ حیاتی تدبیر ۲۰ ہزار طالب علموں کے اس اجتماع کو روک نہ سکی جس کے لئے گئے مدرسی اطلاعیہ نائب تھا اور اسے مجھے میں جو تین جیلوں کا دورہ پڑا ہو تھا۔ مدراس میں کانگریس کے جھنڈے جلا کر سیاہ جھنڈے لہرائے دوسرے مقامات پر قومی جھنڈے کی بے حرمتی کی گئی۔ اور یہ سب فعل قابل مذمت تھا۔ اچھے خوبیں گھنٹوں میں دو نوجوانوں نے تامل کو بچانے کی خاطر خود سوزی جیسی دلیرانہ کر لیں۔ ڈاک خانہ میں کام کرنے والے ۲۳ سالہ نوجوان رنگا جن نے ایک چوراہے پر اپنے آپ کو آگ لگائی آگ کے شعلوں جوں جوں اسے اپنی لپیٹ میں لیتے جاتے تھے وہ تامل زندہ باد کا نعرہ لگاتا جاتا تھا۔ کوئمبتور کے مقام پر ۲۲ سالہ سبرامنیم نے بھی یہی کیا۔

مظاہرے پُرتشدد ہو گئے۔ مدراس کے وزیر اعلیٰ وزیر خود ستری گلزاری لال نندہ کے الفاظ میں ایک چٹان کی طرح سخت بنے ان مظاہروں کو ظلم، ضبط کا مسئلہ قرار دینے کا فیصلہ کیا اور پولیس بھیج دی۔ ب مظاہرین پولیس کی گولیوں سے مرنے لگے اور غم و غصہ کی لہر ملک کے باقی حصوں کو بھی متاثر کرنے لگی۔ ۲۸ جنوری کو اپنے کلکتے کے ایک دورے میں وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے مزدکاروں کو بتایا کہ میں نے، حالات و واقعات دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یقین دلاتا ہوں کہ یہ ہی مسلط نہیں کی جائے گی کانگریس کے نیچے طبقے میں ان کے ساتھ تو بات گوش نے ہندی کے پرجوش حامیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد باری ختم کریں۔ اسی میں وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے میٹ کشی کی۔ "ہم ہمیشہ ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور اختلافات کو دور کر سکتے ہیں۔" (یہ بیان دیتے وقت شاستری جی مگرزی میں لوٹے تھے)

مگر ڈی ایم کے کے اہم لیڈر ابھی تک جیلوں میں تھے اور جو ہر شہر کو بیرونی کوئی بھی بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ۲۹ جنوری کو کیرالہ کے ایک ہوٹل کے ایک بیس سالہ بیرے نے دو خط لکھے ایک اپنے باپ کو اور دوسرا ڈی ایم کے کے لیڈر اناتھ دورائی کو۔ ان خطوں میں اس نے کہا کہ وہ تامل کے لیے اپنی جان قربان کر رہا ہے۔ اس نے کھٹمل مارنے والا زہر پی لیا اور مر گیا۔ لوگوں کو اس سلسلے میں اپنی قطعی رائے ظاہر کرنا پڑی، وہ کس کے طرف دار ہیں بتانا پڑا۔ گروہوں کی تقسیم ہندی اور غیر ہندی کے روایتی خطوط پر ہوئی بمبئی میں ذہین کارٹونسٹ لکشمن نے (جو خود کرناٹک

سب سے اہم کام کو سمجھنے کے لئے ہمیں کرنا پڑتا ہے اپنی خود کی بہت سی دست کش ہونا کچھ بہت سے مقامات سے ہٹ کر ہوا جا رہا تھا کہ کچھ نے ان لوگوں کو بہت سا ایسا ذریعہ مطلوبہ ہے جو اس کی پرستیوں کے لئے خاموش ہو جاتی تھے اس ذریعوں کو اپنی جانب میں واپس نہیں لے جاتے تھے کہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس خط کے اقتباس سے تقسیم کرتے ہوئے انہیں تاکید کی ہے کہ ملک کا اگلا خط ہے میں بڑھائے گا۔ اس کے بعد ہی ان مطالبات کی تکمیل کے طریقوں پر کچھ سنجیدگی سے غور و فکر ہو پائے گا۔

مطالبات کیا تھے؟ اصل ایک قومی رہنما کی حیثیت سے مہدی کو مزید کی ذرا سے جانے پر معترض تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بات ان کی ہے وہ یقین دہانی کو جس میں سمجھا تھا کہ مہدی کسی بھی تحفظ پر مسلط نہیں ہوں گے جو اسے میں چاہے آئینی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ ایک بار پھر یہ بنیادی کی نصیحت تھی جو اس ملک کی سمت بدل رہی تھی۔ "یقین دہانی" کے پیچھے کیا فلسفہ تھا اسے متعین کرتے ہوئے ان کی ۳ ستمبر ۱۹۴۹ء کی ہوا میں سارا سمجھنے کی ایک نقطہ یہ تھا اس سمت مناسب رہے گا۔ "اپنے ملک میں لکھنے کی طاقت ہماری خود مختاری ہاں ہونا چاہیے ہمیں اس سلسلے میں تھوڑی طریقہ کار اپنانا ہوگا۔ یہ تحکمانہ رویہ؟ یہ سوالات میں مہدی کے پرجوش حامیوں سے کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کیوں کہ ان کی متعدد تقریروں میں خود میں نے یہاں اور بعض دوسری جگہوں پر سنی ہیں مجھے علامت محسوس ہوا ہے۔ یہ صرف یہی نہیں کہ بنیادی طور پر مطلوبہ رویہ ہے بلکہ یہ ایک خطرناک رویہ بھی ہے۔ اس سوال پر آپ سمجھ داری کے ساتھ غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی اگر آپ مہدی کو ان لوگوں پر مسلط کر دیں جو اس کے مخالف ہیں تو یہ خود مہدی کے دماغ میں مددگار ہوگا۔ ہندوستان کے تھوڑی ہی میں مسلط ہیں یہ صورت حال یقینی ملکات میں سے ہے۔ اسی لیے آپ کو صدر دستور نہیں کے ان تمام رکاوٹوں کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کرنا ہوگی جن کی ماری زبان مضبوط ہیں ہے آپ کو ان لوگوں کے دماغ میں بیٹھنے ہوں گے جو مہدی ہی کی ایک مختلف قسم کو لیتے ہیں جسے ہندوستانی بڑا کہا جاتا ہے۔ آپ کو بھی بات کرنی ہوگی تو کہاں نظر آئے تو وہ ہاں ہے کی

۱۰ دسمبر ۱۹۶۵ کو ہندوستانی پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں صدر جمہوریہ کے اعزاز میں ہونے والے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ نشست کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یقین دہانی کی بات کہی تھی۔ گذشتہ دنوں ۲۲ فروری کو لوک سبھا نے ملک لیبیا نے مقدمہ سے پیدا ہونے کا فیصلہ کیا کہ دو آفیشل لینگویجز ایکٹ میں ۱۹۶۵ کی یقین دہانی کو آئینی شکل دیے جانے کے لیے ضروری ترمیم کرے۔ لیکن دھیما پڑ گیا

(۱۱)

ماضی اور مستقبل

[illegible] میں ہندوستان سے متعلق جو [illegible] بے یقینی اور ظلمت کا طوق جیسے اسفندیار کے مقابل کا ترکش تھا۔ ہندوستان کی [illegible] کی [illegible] کی [illegible] سے زیادہ اس کے ماضی کی [illegible] پر مطمئن [illegible] ہندوستان [illegible] کہ ہندوستان [illegible] لکھے جیسے بڑھے ہوئے حالات سے کسی نتیجہ کو [illegible] کے لیے [illegible] کرنے کے لیے [illegible] یقیناً اس جیسے حال [illegible] طور کے ملک میں [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible] سے زیادہ [illegible] [illegible] [illegible]

گے اور اس طرح کے سلسلے چلتے رہیں گے"۔

ہربرٹ نے یہ پیچیدہ دنیا کا مطالعہ کیا تھا اور اس نے یہ کتاب اس صدی کے نصف میں لکھی تھی۔ اس نے یورپ کی سرمایہ داری کی قربانی سے پیدا ہونے والے جذبات دیکھے تھے۔ ای ڈی۔ مورل کی کانگو کی غلامی کے خلاف مہم کا وہ مطالعہ بھی اس کے سامنے تھا جس کا بھی کوئی حل نہ نکلا تھا۔ بیلجیم کے کانگو کے دوران اور کثیر سے متعلق کیے گئے وعدے نے ایفا میں نئے تنازعات پیدا کیے تھے۔ ہربرٹ نے یہ کوہ پیما آگاہی دیتے ہوئے سنا تھا کہ لسانی ریاستیں، جو ماضی کا بیانیہ کھول دیں گی جس سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان پر دنے مگر یزوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ یہاں سے تو تقسیم کرو اور حکومت کرو کے سہارے اور اب ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جا رہے ہیں۔ اس نے جناح کے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہوئے ہر باغ کے اثرات سے سینکڑوں میلوں کو پھیلتے بھی دیکھا تھا۔ بہت سوں، بشمول خاکروہ بھی اپنے یہاں ذیرا عظم اور گورنر جنرل بن سکتے ہیں۔ وہ جب اپنی کتاب لکھ رہا تھا اس وقت ہندوستان کی ریاست کا حصہ تھے۔ اپنی سیکولرزم حاصل کرنے کے لیے تھے۔ ۱۹۶۰ کے عوامی تشدد کی مذمت تھی۔ ہربرٹ نے ملک کی کیک قسمت سکھوں کو اس خطرے کے پیش نظر کہ وہ سے خالصتان بنالیں گے خوفناک علاقہ نا سے سننے میں کانگریس کی بے حسی بھی دیکھی تھی۔ سینئر کشمیر شیخ عبداللہ جنھوں نے اپنے حامیوں کو مذہبی پاکستان سے دور رکھا تھا جیل میں قیدی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیلجیم ہربرٹ نے اس مجموعہ ضداد صورت حال کو دیکھا اور یہ بچوں دانی میں واپس ہونے کا کافی سرمایہ ہو یا مگر یہ سارے مسائل تو کیے بعد دیگرے وقت اور مجبوریت کے ساتھ ساتھ دیکھنے طور پر حل ہوتے گئے۔ بیسویں کے دوسرے نصف ملک چین نے اپنے آپ کو دنیا سے لگ کر کے ایک بیرونی کے تناظر اور اندرونی کا سنگر تخلیق کر لیا تھا۔ ہندوستان ساری دنیا کے سامنے اپنے تجربے میں معروف تھا۔ اس سے تحفظ کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے تھے اور ہر فرد کو آزادی تھی کہ وہ آئے اور اس کے پیچیدوں کو دیکھے۔ اور اگر چہ اس کا اصلی چہرے پر نظر آنے لگا، مگر اس کے پیچیدہ سماجی پر توجہ کر رکھے۔

ہندوستان کی یہ قومی بقا کی جدوجہد خود اپنے خلاف جدوجہد سے ایک فعال اور گھستے ہوئے تعدیلی کل کی حیثیت سے ہندوستان نے پہچانا، کو اپنی۔ لکھنے کی اس توانائی کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظر حرف مجبور میں ملتی ہے مگر بر لسانی ہندوستان کے بجھے ہوئے علاقے یا سب جو اس سب سی توانائی کی مدد سے اپنے آپ کو تنوع لیے میں نکھارتا رہا ہوئے ہیں۔ ہندوستان خود اپنے سیاسی طبقے سے مختلف ڈگر پر ہیں ہے ہے سے واقف لاکھوں کروڑوں ہیں ان کی تعلیم یافتہ ہیں جو ہر سب ایک ایسا سی ای سے ہر

[illegible] پاکستان بنگلہ دیش اور بھارت ہندوستان کے [illegible] ۱۹۴۰ء میں [illegible]
[illegible] ہندو خوف کے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

دُوسرا حصّہ

پنجاب

①

مسئلے کی نوعیت

اس حقیقت پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوؤں نے سکھ مت کو ایک الگ مذہب نہ سمجھتے ہوئے سکھ ازم کی مختلف شکل سمجھا تھا۔ ہندو پنجاب کو نہیں بلکہ مسلم کثیر ہندوستان کے تعاون کے بعد اب جداگانہ سکھ ریاست کا

سکھ ازم اور ہندو ازم کی یہ بحث یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے مذہب کی جداگانہ حیثیت کو بھی نہیں مانا۔ مذہبی مسئلے نے سیاسی کشمکش و تنازعے کی شکل صرف اس وقت اختیار کی جب بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے یہ سکھ اکالی لیڈر صرف ان کی حمایت کا کوشش کرنے لگے بلکہ خود ان کے مذہب کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے سکھ مذہب کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کے بانی اور بعد کے گرو بھی ہندو تھے۔ بابا نانک نے اپنا مذہب ہندو مذہب سے ہی اخذ کیا تھا۔ ہندو مذہب کے بہت سے عقائد جیسے آواگون، کرما، مکتی وغیرہ کو انہوں نے اپنے مذہب میں شامل کیا۔ ہندو مذہب کی بہت سی مذہبی کتابوں کو انہوں نے اپنا مقدس مذہبی لٹریچر بنایا۔ ہندو مذہب کے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو انہوں نے اپنے مذہب میں جگہ دی۔ بابا نانک نے اپنا مذہب ہندو مذہب سے ہی اخذ کیا تھا۔ ہندو مذہب کے بہت سے عقائد جیسے آواگون، کرما، مکتی وغیرہ

[illegible] ہے۔ حال ہی میں [illegible] ہے۔ اگر یہ یقین ہے۔ حال ہی میں [illegible] ہے۔ [illegible] ہے۔ [illegible] ہے۔

(۲)

ایک پُرانا خوف

پانچویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ رسان سے زیادہ رسوخ کی بات ہوتی ہے یہاں کا اپنا الگ ادھرم جو بعد کو ہندو دھرم کے نام سے جانا گیا، بڑے خطے میں رہنے والے مختلف قبیلوں کا جیل بنا۔ اس برصغیر کی طرف ۵۰۰ قبل مسیح کے آس پاس سے آئے تھے۔ جب روسی قبائلیوں کے ترک عمل سے جو خیبر یونان۔ یستیا اور ایران سیتھیا نے دوا تھا۔ افغانستان سے پرے ہندوکش کی پہاڑیوں کے درّوں سے گزر کر وہاں پہنچے جو آج پنجاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پنجاب کا مطلب ہے "پانچ دریاؤں کی سرزمین"۔ وہ پانچ دریا جن میں چھلم چناب، روی بیاس اور ستلج شامل ہیں زیادہ صحیح نام ست آب ہوتا۔ یعنی سات دریاؤں کی سرزمین اس لیے کہ جس وقت آریا یہاں آئے اس وقت دریائے سندھ کی یہی تعداد تھی۔ دریائے سندھ جو مغربی سرحد کی نشان دہی کرتا تھا اسے گھگرا سے ملا دیا گیا اور اس طرح سرسوتی مشرق ہو گیا۔ سرسوتی علم کی ہندو دیوی کا بھی نام ہے اور یہ بھی مجہول نہیں کہ اس نام کے دریا کا سوکھنا آج آٹھویں دہائی میں پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی علامت ہے۔

آریا قبیلوں کی کسی سرزمین پر یہیں آئے تھے ان کا اور وہ یہاں اس وقت مواجب ایک عظیم تمدن جو اب وادی سندھ کی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے زوال کے قریب تھا۔ شہروں کا ایک سلسلہ تھا جو مشہور بندرگاہ لوتھل سے سندھ میں موہن جوداڑو تک پھیلا ہوا تھا۔ ان شہروں کے نام نہیں معلوم ہیں۔ یہ تمدن پھیلا ہوا تھا آریا سے پہلے پنجاب میں قدیم [illegible] کسی زبان میں بولتے تھے۔ [illegible] اشلوک [illegible] کے سمان میں کسی زبان میں [illegible] ترقی [illegible] جو دیا کی طویل ترین [illegible] رہنے والے [illegible] جارحیت اور [illegible] میں [illegible]

زیادہ کشت وخون کا دھبہ رکھائے کو گوشت میں بدلنے کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں رہا۔ اس وقت صنعتی ترقی کی بھی بہار ہے سیکولر ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ جاری ہے۔ اس کا سہرا کمیونسٹوں کے سر ہے جو صوبائی سطح پر کیرل دونوں جگہوں پر حکومت کرتے ہیں انھوں نے باقی ملک کی طرح اپنے یہاں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگانے سے اتفاق نہیں کیا جب کہ مسلمانوں کی کٹر سنت والی ریاست کشمیر بھی ذبیحہ گاؤ کی اجازت نہیں دیتی اور مسلمانوں سے بھی گائے کا گوشت نہ کھانے پر اکتفا کرنے کو کہتی ہے کشمیری برہمن دونوں کے لوگوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے سور کا گوشت جس سے مسلمانوں کی طرح یہودی بھی پرہیز کرتے ہیں، نہیں کھاتے (حالانکہ کشمیری برہمن اپنی ذات کے دوسرے لوگوں کی طرح سبزی خور نہیں ہیں) دلی اور سماج کے سکھ حکمرانوں کے خلاف اپنی لڑائی کے زمانے میں سکھوں نے گائے کے تحفظ کی اپنی خواہش کا بہت مظاہرہ کیا مگر آخری دونوں میں تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی آنے کی وجہ سے تشدد پسند سکھوں نے ہندو مندروں میں گائے کے سروں کو رکھ کر ہندوؤں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔

ہندوستان کے ذات کے عجیب وغریب نظام میں پنجاب کے آریاؤں کا خاصہ حصہ ہے۔ رومیلا تھاپر نے اپنی ہسٹری آف انڈیا۔ ٹیلگوئن بکس ۱۹۶۶ جیسی تاریخ داں خاتون نے اس تعصب اور عدم رواداری کو آریاؤں کے اس تعصب کا راست نتیجہ قرار دیا ہے جو ان کے دلوں میں ان نسلی قبائلی نسلوں کے لیے تھا جن سے برصغیر میں ان کا مقابلہ ہوا تھا اور جنھیں انھوں نے مغلوب بنایا تھا۔ آریاؤں کی جن اعلیٰ ذاتیں تھیں، برہمن یا مذہبی رہنما، کشتریا سیاسی اور دانشور یا تاجر اور کسان سب کے نیچے شودر تھے یا سیاہ فام اس سرزمین کے اولین باشندے جنھیں سب سے پہلے نوے زمین کھیت مزدور بنایا گیا اور بعد کو انتہائی جسمانی اور اخلاقی تحقیر ان کا مقدر بنی جلد ہی یہ سب سے نیچی ذات اچھوت قرار پائی۔ دراصل نظم اجتماعی کا شکار ہوئی جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ بعد کا کوئی نظریہ ذات کے اس تعصب کو مٹا نہ سکا کچھ لوگوں کو اسے کم کرنے میں تھوڑی بہت کامیابی ضرور ہوئی۔ مذہب اسلام اپنی رحمدلی اور ذات پات کی مخالفت کی وجہ سے شودروں میں بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا مگر جو ہندو مذہب ہندوستان میں باقی رہا وہ یا تو اعلیٰ ذات کے ان لوگوں نے تبدیل مذہب کیا تھا جو بالآخر ہندو ازم کی طرف لوٹ گئے۔ اسلام اپنے مساوات اور برادری کے پیغام اور اللہ کے سامنے مساوات کے تصور کھلا مظاہرہ کے باوجود ذات پات کے نظام کی پروا نہ کرنے کا شکار ہوا۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے ذات پات کے لیے، یہ تعصب کو اتنا نہ کہیں، تو قابل ذکر حد تک اپنا لیا تھا ان میں بھی وہ اچھوت سمجھی جاتی تھی جو ان کے یہاں کا مطیع تھا ۱۹۰۱ء کے مردم شماری میں مسلمانوں نے بھی ذات پات کو تسلیم کیا تھا جو اچھوتوں میں سکھ ارکو اپنانے والوں کو اونچی ذات

ایشیا کا ایک حصہ مذہب بن گیا۔ مذکورہ دونوں مذاہب کو اپنانے والے زیادہ تر لوگ قبیلوی اور چھوٹی ذات کے تھے جو سماجی اور برہمن وغیرہ اعلیٰ ذاتوں کے اتحاد کے نیچے پس رہے تھے۔ ۱۲ ویں صدی تک یہ طبقات کو ہندو مت میں کئی حیثیتوں کو حاصل کرنے کا موقع ملا۔ راجپوت برہمنوں کے تعاون سے اقتدار سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی بھی متبادل کے لیے بے چین تھے بدھ مت سے ترقی پانے والی اور اس کی ترقی کی اصل وجہ اس کی جاگیردارانہ معاشرت تھی۔ خصوصاً مورید راجا اشوک کی اشوک ایک سماجی تھے جنھوں نے اپنی حکومت سے برصغیر میں پھیلا دی اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب برہمن ازم اور ویدانت دونوں کے لیے معدوم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

اس صورت حال میں برہمنوں کا رد عمل تھا اور تقاضا روحیلا تھاپر نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف انڈیا" لیگزن بکس ۱۹۶۶ء میں اس تقاضائی عمل کو یوں بیان کیا ہے۔ ان تمام حملوں کے دوران برہمن روحانیوں اور تربیتوں سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور نہ ہی مدد حکومت اور جین مت سے فائز ہو سکے بلکہ وہ کچھ دیوتا عبادت خاموشی کے ساتھ سماجی میں چلے گئے اور کچھ نے نئے خصوصیات کے ساتھ نئے دیوتاؤں کی شکل میں جنم لیا یہی زمانہ تھا جب برہمن حکومت نے زمین حاصل کیے جو آج مذہبی ادارہ کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں اس طرح برہمن سے مدد زمین ایک تاریخی غلطی ہوگی کیوں کہ یہ اصطلاح دراصل آٹھویں صدی عیسوی میں ملکوں کی ادائی ہوئی تھی جو وہ مذہبی اداروں کے لیے دستاویز عبادت کرنے والوں کے لیے مختص کرتے تھے ہندو مذہبی اداروں کو ہمارے مقابلے طور پر کسی تاریخی حیثیت سے نہیں لکھا یہ کوئی انہونی حکومت نہیں ہے یہ مختلف سوچ مسلکوں و عقاید سے پیدا ہوا اور برہمن چھ جین میں ۱۰۰ یک مذہب سے منسلک تھے و کچھ وہ حضوں کا مسلک تھے جو اس ترقی یافتہ مذہب سے منسلک ہو گئے تھے کیونکہ یہ مندر وہ ہی حضوں کا مذہب میں سطح رعایت مگر سی بڑی تھی

مندر وہ مرکز تھا جو عمل سے مل کر ایک مخصوص دھرم کی تشکیل میں ہوتا ہے ساتھ ہی اشوک کا ضابطہ اور شیو تاور ہے اس حیثیت سے ایک ذاتی حدود تھا جب حکومتوں نے اس میں ہیئت ہوتا ہے ہندو مذہب کی ایک مخصوص حیثیت تھی۔ یہ ہے مذہب بھی اس کے ذریعہ پیدا ہوئے اس ہی کے ذریعہ ہندو مذہب میں آئے ہندو دھرم ایک دیوتا مانوں سے وابستہ ہی مرکزیت کی وجہ سے ہندو مذہب کے ہندو مذہب کے حضوں و عقاید نے دیہاں کا رخ کیا جہاں برہمن کو پہنچے کے لیے ان کو ہندو مذہب کے خیال و رسم کی طرف سے گیا تو ملک بڑا تھا اس لیے ہی وہ حضوں نے دیہاں ایک قسم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۳)

ایک عقیدہ اور دو مذہب

اس میں وقت بھی لگا درد اور کوشش کی ضرورت بھی پڑی۔ لیکن "قانون کے پہیے کی گردش" کے مصداق پر پہلے وعظ اور سمارناتھ کے ہرن پارک میں ہونے والے اجلاس کو جس کی تبلیغ جماعت نے سب سے پہلے یہ محض پانچ چیلوں کے سامنے کی تھی۔ آخر ہندوازم نے قبول کر لیا۔ عرب کے ریگستانوں میں بنی آمنہ اور عبدالمطلب کے بیٹے محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی کا مفہوم کرنا نسبتاً زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اسلام کا پیغام ۶۱۰ء میں آیا اور ۶۲۲ء تک مکہ کے مفاد پرستوں کے غیظ و غضب سے بچنے کی خاطر اپنی جائے پیدائش مکے کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ دو سال بعد بدر کے مقام پر ہونے والی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جانے والی مہم جنگ میں فتح نصیب ہوئی مگر ۶۳۰ء میں یہ ہوا کہ شہ مکہ نے نئے عقیدے اسلام کے سامنے سپر ڈال دیئے۔ ۶۳۲ء میں حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا۔ مگر ان کا پیغام عرب کی سی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ محض گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار تھی مگر ایک موسم کے اندر اندر اسلام کی فوجیں مغرب میں بیرس کی طرف جانے والی سڑکوں پر تھیں اور مشرق میں چین کے دروازوں پر۔ عرب تاجر عقیدے کو ہندوستان کے ساحل پر لائے اور رسول کے انتقال کے دس برسوں کے اندر یہاں اور مغربی ساحل کے مختلف مقامات پر لوگوں نے مذہب تبدیل کیے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مالابار کے مسلمانوں کے لیے آج بھی 'موپلا' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ موپلا (مہاپلائی) ایک عرب مشتق ہے جس کا ترجمہ "عظیم بچہ" کیا جاتا ہے (نویں صدی عیسوی میں۔ مالابار عقیدے کے مطابق خود مالابار کے راجہ نے اسلام قبول کیا وہاں اسلامی فوجیں نہیں تھیں، اسی لیے نفاق سے، تبدیلی مذہب کے لیے کسی جبر و تشدد کا سوال نہیں اٹھتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو پہلا قبضہ اس وقت حاصل ہوا جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے بلوچستان سے گزر کر سندھ کو اپنے تصرف میں لیا مگر عرب کو شکستیں۔ سندھ کے سرحدی ریگستانوں پر روک گئیں۔ مسلمانوں کے ان حملوں کو جنھوں نے شمالی

سے اس برصغیر کی تاریخ رقم کرنا دراصل کسی بے بسی درماندگی کا اظہار ہے۔ جو کوہ ہندوکش سے آنے والے بدیسی کہلائے۔

ظاہر ہے کہ ترک، افغان اور ترک مغل حملہ آور پہلے پہل کھوٹ نہ لے آئے درجہ بدرجہ ان کی نسلیں یہیں کی ہو کر رہ گئیں، انھوں نے یہاں مقامی آبادی سے اتحاد و یگانگت کی طاقت حاصل کی جس نے ان کو سلطنتیں قائم کرنے اور سیاسی منظر نامہ بدلنے کے لائق بنایا۔ انھوں نے نئے ہندوستان پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ شکست کے بعد بھی وہ ہندوستان میں بچے رہے۔ محمد غوری اور آباد ہونے والوں کا ذکر تیمور کی روایتوں سے بڑا صاف سامنے آتا ہے۔ ۱۳۹۰-۱۳۹۱ء میں تیمور نے شمالی ہندوستان کی ہمایہ سلطنتوں کو تباہ برباد کیا، اس کی فوج اور لوٹ مار کا حلقہ دہلی میں تغلق اور ملتان میں خضر خان کی نسل میں موروثی حکمرانوں کو تاراج کرنے کے بعد وہ جس علاقے پر حکمران بنا جو سو سال بعد اس نے اپنے سپاہیوں کو بخشا، ان سلطانوں کو ان کا بگاڑ ہوا ہے۔ دہلی کو کبھی کسی آدمی نے لوٹا اور برباد نہیں کیا۔ یہ تاثر تو صرف تیمور، بابر، شاہ محمد شاہ رنگیلا اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے لفظوں کے ساتھ کیا۔ ہر مصیبت کا شکار مسلم حکومت ہی اس کی ذمہ بھی تھی۔ حکومت اور دولت میں ان کی حصہ سب سے بڑا تھا۔ تیمور نے ترک سلطنت کو تباہ کیا، ورثہ دولت اور گھریلوں نے زیادہ تر مغلوں کو ختم کیا۔ مگر ۱۴۰۵ء میں واپس گئے جب کہ تمردوں کے پیچھے سوار ترک خاندان مغل اپنے آبائی گھروں کو بھی واپس نہیں ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے ۱۵۰۰ء تک ہندوستان کو اسی طرح وطن کا تصور دیا تھا کہ آج ہندوؤں نے یہ بات "ثابت" کرنے کی مہم شروع کی ہے کہ آریہ مسلمانوں کی طرح مندر شکن کی پجاریوں کو پار کر کے یہاں نہیں آئے ان میں ایک نئے تو ہندوستانی سنجیدگی سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ قلب ستان کا وہ علاقہ جس سے آریہ اپنے ترک وطن کے سفر پر نکلے تھے۔ ایک زمانے میں دنیا کے الٹ پلٹ ہونے سے جنوبی ہندوستان کے بیچ میں واقع تھا۔ بدیسی اور دیسی مذہب اعتقاد کے نظریے کو تو بنیاد کی صورت حال میں بھی سے جو کہ ہندوؤں پر بدیسی ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ معکوس منطق کے سہارے ان کے مذہب کو ہندو رد کا حصہ بنایا جاتا ہے۔

تیمور سے ہندوستان کی کوئی خصوصی تکلیف نہیں جوڑا، مرکز منہدم ہو گیا اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والی

ثانیہ نے جوہ دوں اور عورتوں کے ایک ایسے گروہ کو منظم کیا جنھوں نے صدیوں تک شعور پر اپنے انمٹ چھاپ چھوڑی۔ ان کے گیت ہماری زندگی کا حصہ ہیں جن کا پیغام آج بھی اب وہ اقتصادی عمولوں میں کم ہو چکا ہے، اس صدی کی خصوصیت کو لڑنے کی طوفانی لہروں سے بچانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مکتی کی تحریک نے جس کو ختم نہیں کیا مگر صدیوں کو برہمن ازم سے بچا لیا۔ اس تحریک کا ایک حصہ اسلام میں صوفیا کے پیروں میں ملتا ہے جو ہندو بھی رہ سکتے ہیں یعنی ملا، جن کا صدیوں قبل یقیناً برہمن ہونا کا مقابلے میں صحیح معنوں میں ہوا کی لہر لے کر آئے خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، فرید گنج شکر، نظام الدین اولیاء اور علی ہجویری جیسے اولیاء کی درگاہیں اجمیر، دہلی، ملتان اور دیپالپور میں آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مقدس زیارت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ملا کی کوششوں کے مقابلے میں ان مذہبی لیڈروں نے اختلافی عناصر کے بجائے مشترک خوابوں پر زور دے کر صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان سماجی ہم آہنگی کی تجمیع کی اور اس کے لیے کوشاں رہے۔

سارے شمالی ہند، مگدھ اور بنگال میں جیتنیہ مہاپربھو، شمال میں رامانند، راجستھان میں میرا بائی، سندھ میں سادھنا، مہاراشٹر میں تکارام، نامدیو اور پرماند، جنوب میں ولبھ سوامی جیسے مگن ہیں ان عظیم ترین دانشوروں نے اپنے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے، جیسے ہی فریب جیتے کہ مہابیر اور گوتم بدھ تھے جنھوں نے تیرہویں صدی ق م کی لہروں کے درمیان، خدا کی وحدت، عبادت گزار کی ریاضت اور نفس اور گرد و پیش کے اندرونی پرسکون کو پروان چڑھایا۔ یہ دسویں صدی کبیر (۱۴۴۰-۱۵۱۸) اور گرو نانک (۱۴۶۹-۱۵۳۹) تھے جنھوں نے کہا کہ صدیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش جھوٹی ہے کیونکہ خدا تو ایک تھا۔ نانک نے کہا کہ "جھوٹ کا تول بالا ہے مسلمان ملا اور ہندو پنڈت، جیسے فرقوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ شادی کے عہد نامے شیطان پڑھتا ہے۔ کبیر نے اپنے آپ کو اللہ اور رام کا بیٹا کہا اور چار سو برس سے زیادہ عرصے کے بعد گاندھی نے یہی شبیہیں استعمال کیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی یہی کوششوں میں کبیر کے گیت گائے۔

کبیر ایک جولاہا تھا اور ان کے رفقا میں ایک جولاہا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ مسلمان پیدا ہوئے کبیر صوفیانہ تصورات کی بدولت ہندو مسلم اتحاد کی علامت بن گئے۔ کبیر محض ایک نغمہ نہیں تھے انھوں نے ایک باقاعدہ نظام کو پیش کیا، بنیادی اصول جس کی جنگ کی تھی وہ ان کے دوہوں میں ملتے ہیں جو سنسکرت کی آمیزش سے کچھ لیا گیا اور کچھ نئے ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ اور براہ راست ہے۔ سادہ الفاظ میں کبیر نے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچایا۔ مصور، فنکار، دست کاروں اور کاشت کاروں میں آج بھی ان کے نظریات و خیالات زندہ ہیں مگر ان کے

ہے۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ شادی بیاہ تک محدود ہے۔

(۴)

پنجاب اور دہلی کا مقابلہ

سکھوں کا پہلا وطن

۱۷۰۷ء سے ۱۷۳۹ء تک ایران کی مشہور لڑائیوں اور اس کے قتل کے بعد ۲۵ سال تک ہندوستان میں انارکی رہی۔ مغل بادشاہ کی سلطنت پر جو کہ تیموری خاندان کی نسل سے تھا، ۱۷۳۹ء میں ایرانی حملہ آور نادر شاہ نے حملہ کیا۔ نادر شاہ ۲۱ جون ۱۷۳۹ء کو دہلی پہنچا اور ۵۷ دن تک وہاں رہا۔ اس عرصہ میں اس نے دہلی کے تخت پر محمد شاہ کو بٹھا دیا اور خود ایران واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ نادر شاہ کی فوج نے دہلی میں قتل عام کیا۔ ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ نادر شاہ کے سپاہی دہلی کی گلیوں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ ان کے ہاتھ جو کچھ آیا وہ لے گئے۔ نادر شاہ کے ساتھ ۷۰ ہاتھی تھے۔ ان پر سونا چاندی اور جواہرات لاد کر وہ ایران لے گیا۔ اس کے علاوہ ۱۰ کروڑ روپیہ نقد لے گیا۔ اس کے ساتھ ۳۰ ہزار گھوڑے تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار اونٹ تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار خچر تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بیل تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بھیڑیں تھیں۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بکریاں تھیں۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار گدھے تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار اونٹ تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار خچر تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بیل تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بھیڑیں تھیں۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار بکریاں تھیں۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ۱۰ ہزار گدھے تھے۔ ان پر بھی لوٹ کا مال لاد کر لے گیا۔

کے دور میں یہ سلسلہ اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت اس کے ارکان کی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار تھی اور یہ پورے مغل ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اس سلسلے کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا نظم و ضبط تھا۔ ہر نئے رکن کو پہلے ایک سال تک ایک عام خادم کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس دوران اسے صرف خدمت، عاجزی اور خاموشی سیکھنی ہوتی تھی۔ جو شخص اس ابتدائی مرحلے میں اپنی انا کو قابو نہیں کر پاتا تھا، اسے کبھی بھی اگلے درجے پر نہیں بھیجا جاتا تھا۔ یہ اصول اتنا سخت تھا کہ کئی امیر زادے، جو صرف نام کی وجہ سے اعلیٰ مقام کی توقع رکھتے تھے، اس مرحلے میں ہی واپس لوٹ گئے۔

سلسلے کے اندر تعلیم کا نظام بھی بہت منفرد تھا۔ یہاں کتابی علم سے زیادہ عملی تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ ہر رکن کو ایک استاد کے ساتھ جوڑا جاتا تھا، جسے وہ اپنا مرشد مانتا تھا۔ یہ رشتہ صرف رسمی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں اعتماد اور وفاداری کا گہرا تعلق ہوتا تھا۔ مرشد اپنے شاگرد کی کمزوریوں اور طاقتوں کو بخوبی جانتا تھا اور اسی کے مطابق اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس نظام کی وجہ سے سلسلے میں ایسے افراد تیار ہوتے تھے جو نہ صرف علم رکھتے تھے بلکہ عمل میں بھی مضبوط ہوتے تھے۔

سلسلے کی ایک اور اہم خصوصیت اس کا خفیہ نظام تھا۔ اس کے ارکان کے درمیان ایک مخصوص قسم کی علامتی زبان رائج تھی، جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ یہ علامتیں ہاتھ کے اشاروں، مخصوص جملوں اور بعض اوقات لباس کے رنگوں میں بھی ظاہر ہوتی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سلسلے کے افراد بغیر کسی بڑے اعلان کے ایک دوسرے تک پہنچ سکیں۔ یہ نظام اتنا مؤثر تھا کہ کئی بار مغل انتظامیہ کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہیں ہو سکا۔

سلسلے کی مالی بنیاد بھی بہت مضبوط تھی۔ اس کے پاس کئی دیہات کی جاگیریں تھیں، جن سے حاصل ہونے والی آمدنی سلسلے کے مختلف کاموں پر خرچ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ارکان کی طرف سے بھی رضاکارانہ عطیات دیے جاتے تھے۔ اس مالی خودمختاری کی وجہ سے سلسلہ کسی بیرونی دباؤ سے آزاد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اتنے لمبے عرصے تک قائم رہ سکا۔

سلسلے کے زوال کی ابتدا ۱۷۶۲ء میں ہوئی، جب اس کے بانی شیخ عبدالرحیم کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد کوئی ایسا شخص سامنے نہیں آیا جو ان جیسا اثر و رسوخ رکھتا ہو۔ نتیجتاً سلسلے کے اندر گروہ بندی شروع ہو گئی۔ مختلف خلیفوں نے اپنے اپنے حلقے بنا لیے اور مرکزی نظام کمزور پڑ گیا۔ ۱۷۷۰ء کی دہائی تک سلسلہ صرف چند علاقوں تک محدود رہ گیا۔ ۱۸۰۱ء میں آخری معلوم خلیفہ کا انتقال ہوا، جس کے بعد سلسلہ عملی طور پر ختم ہو گیا۔

آج اس سلسلے کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں ہے، لیکن اس کے اثرات کئی جگہوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض پرانی خانقاہوں میں اس کے طریقے اب بھی رائج ہیں۔ کچھ خاندانوں میں اس کی روایات نسل در نسل منتقل ہوئی ہیں۔ اور کئی مؤرخین کا خیال ہے کہ اس سلسلے نے مغل دور کی سماجی اور روحانی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا ہے، جو اس کے ختم ہونے کے بعد بھی کئی سال تک محسوس کیا جاتا رہا۔

کردیا جاتا۔

قابل اعتبار نہ ہوں مگر یہ جنرل یا دداشتوں کی صحت پر شبہ کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ انھوں نے جو کتاب
مارشل ریسیز آف انڈیا (مثل ایلیکٹیز) جی ۱۹۰۹ء صفحہ ۲۱۴ میں بیان کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے
ہوئے لکھا ہے "مقیار ڈسلنے کا بڑا قابل دید منظر تھا جب سکھ فوج کے نڈر اور جری سکھ (مسلمان سپاہیوں سے
سُرخ وردی والوں کو سلامی دی۔ کمانڈر ان چیف لوسٹر لیا (میدان جنگ سے تمغیں مزید بہادری کے
خوردہ مگر ہمت نہ کر سکل گئے۔ پنجابی مسلمانوں کے علاوہ، مگریزوں کے حلف وفاداروں سے علاوہ
برتانیہ کے لیے لعان بھی آئے۔ شمالی پنجاب میں، گجرات کی ضلع میں ایسٹ محمد ڈاکٹر، مسلمان
پنجابی زمینداروں کا ایک دستہ لیا تھا۔ ایسی ہی مقدار دستہ میں میتر کی حاکمیتی میں ۱۰ جرف سکھوں (مسلمان سے تعلق
ہی نہیں بلکہ مندو اور مسلمان تعلقات کے سلسلے میں بھی۔ اس کی بات رہے کہ تاریخ کو مرکزی طور پر
کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے جو مسلمان کو بہانے سے زیادہ تباہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ عظمت اٹھا سکتے
کے معاہدہ کی کمیتہ ایب ایسے مندوالیڈ کی حیثیت سے بیش کیا گیا ہے جس نے اپنی ساری زندگی ہندی مسلم
حملہ آوروں سے بچنے اور وطن کی حفاظت کی جاد کرنے میں گزار دی۔ اسی تین شیوجی کو گرفتار کرنے اور درد بیب
کے دربار میں لانے والے مسلمان کمانڈر نہیں بلکہ جانے سکھ تھا جو ایک راجپوت سردار تھا اور جدید سیاسی طبقے
سے بنے تعلق رکھتا تھا مندو سنسان خود ہے، ضلع کے ۔۔۔ سے بیس زیادہ بچیوں کو جاں لیتا وقت یہ کام اس
کے مسائل کچھ کم ہوتے۔

گرو گوبند سنگھ، کتوبر ۱۷۰۸ء کو شبہ ہے اور یہ صرف نہیں کا چیلنج اور نہ تھا جس نے اس وقتی
نبا کر سکھ اور ایک الگ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ انھوں نے سکھ تشخص کو ایک ظاہری شکل عطا کر دی یہ
اگرچہ اصل سبب نہیں تھا لیکن بھی گہری تبدیلی موجد گرونانک نے گرمواد فرقہ کی تو گرو گوبند سنگھ نے سنت
باشکل دسویں ۔۔۔ ۱۶۹۹ء میں بیسا کھی کے دن خالصہ کا ان تھا۔ گرو گوبند سنگھ نے گرونانک کے بیروں کو آمد
پورا کرنے کا عہد کیا۔ انھوں نے اس کے معتقدین سے کہا کہ تمہیں پانچ ایسے رضاکار چاہئیں جو اپنے مذہب سے
نام پر اس کی تو سے اور خود اس کے واسطے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پانچ افراد جو اس قربانی کے لیے تیار
ہوئے وہ سب کے سب مارے نہیں گئے۔ ان کا نام پانچ پیارے" رکھا۔ پانچ گرو کی موجودگی سے مشرف سایا میں اس
نے ایک دو دھاری تلوار سے تسلط فائی اس، جو اس کو بہ مت ملکیاں کا بیتھا تھا۔ سنگھ بیتہ کا لقب اور یہ
خالصہ ایک، کہلانے لگے یہ بیلے تو تھے تھیں سکھ مذہب کے تحفظ اور اس کی بقا کو یقینی بنانے کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بلکہ سو سے بھی کچھ زیادہ برسوں کی مدت پڑی مگر اس دوران دہلی میں شمال و جنوب کی علاقائی قوتیں ہی حاوی نہیں بلکہ بیرونی لٹیروں کے مقابلے کی بھی سکت کم ہو چلی تھی۔ نادر شاہ ایران سے آیا اور دہلی میں لاکھوں روپے مال غنیمت سے تین تخت طاؤس اور مشہور زمانہ کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا، لے گیا۔ اٹھارہ برس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے حکمرانوں کے ہاتھوں بے حد ذلت و رسوائی کا سامنا کیا۔ اس کے بعد سے دہلی کی زمین بنے تک وہ اور اس کے ساتھی تسخیر میں بھی بڑا طول طویل سفر طے کرنا تھا، یہ بات بھی عبرت و تعجب سے کم نہیں کہ ان دونوں کو ایرانی، ترکی اور افغانی حملوں نے تسلسل پر عبرت ہوا۔ اس یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہریانہ اور دہلی کا ریاستی علاقہ موجودہ جمہوری ریاست راجستھان کے ریاستی علاقے کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔

۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے سے ملک کو مہلک ترین مصیبت کا سامنا تھا۔ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۹ء تک افغانستان کا وہ حکمران تھا جس نے تقریباً ۱۷ مرتبہ برصغیر پر حملے کیے۔ ان حملوں کے دوران ابدالی نے پنجاب اور دہلی کو لوٹا۔ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان افغانوں نے صدر مقام دہلی پر قبضہ کیا۔ یہ کسی روک ٹوک کے لوٹ مار اور مقامی حکمرانوں کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلنے کا بہترین موقع تھا۔ مرہٹے جو اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی فوجی قوت تھے، ان حملوں کے مقابلہ کر سکتے تھے لیکن وہ ابھی پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کھا چکے تھے۔ اس جنگ کے دوران انہوں نے اپنی بہترین فوج کھو دی تھی۔ مرہٹوں کے حملے لوٹ مار کے لیے ہوتے تھے۔ وہ علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے نہیں آتے تھے۔ ان کے حملوں کا ایک نقطہ حملہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ واپس چلے جا

دیا کیا تھا دوسرے اور مسلمان افسر بھی تھے جن میں جنرل الٰہی بخش، فقیر اور سلطان محمد خان تھے۔ اس کی بیٹی بیوی میں بڑی گل بہار بیگم بہت جیتی تھیں۔ لاہور کو فتح کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے جو پہلا کام کیا، وہ تھا لاہور کی جامع مسجد وزیر خاں کے مقبرے اور داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری۔ داتا گنج بخش کا مقبرہ بعد کو اس کی سکھ بیویوں نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ رنجیت سنگھ نے جب اپنی فوج کی تنظیم نو کی تو اس میں بھی عہدوں پر مسلمان بھی رکھے گئے۔ جب سکھ فوج سری نگر میں داخل ہوئی تھی فوج کا جھنڈا ایک ڈوگرا جمعدار جنرل زور آور سنگھ کے ہاتھ میں تھا اسی طرح جب ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد فاتح سکھ دستے کابل میں داخل ہوئے تو جھنڈا پرچم ان مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھے جن کی قیادت کرنل شیخ سادن کر رہا تھا۔ ریاست میں ہر مذہبی برابر تھا، یہاں تک کہ مسلمانوں کو قرآن کے احکامات کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لیے اپنے قاضی اور جج مقرر کرنے کی اجازت تھی۔

رنجیت سنگھ نے برسوں کچھ کسی ریاکاری یا جعلسازی میں مبتلا ہوئے بغیر حکومت کی۔ ان کی سلطنت بالاعلان ایک سکھ سلطنت تھی۔ مہاراجہ کا خطاب دہلی یا کابل کا نہیں تھا بلکہ خالصہ جی کا سکھ مذہبی قیادت کا عطا کیا ہوا تھا۔ اولین سکھ سکے پر مہاراجہ کی تصویر کے بجائے سرکار خالصہ جی لکھا جاتا تھا مگر رنجیت سنگھ کا سیاسی تدبر تھا کہ اس نے اپنے دوست عزیز الدین کو بتایا تھا۔ غیر جانب دار تھا۔ بچپن میں چیچک کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے چہرہ کُرا ہو گیا تھا اور اس پر دانوں کے گہرے گہرے نشانات پڑ گئے تھے، ایک آنکھ بھی اس مرض کی نذر ہو گئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے دوست عزیز الدین کو بتایا تھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ اس نے کہا تھا کہ "خدا چاہتا تھا کہ میں سارے مذاہب کو ایک آنکھ سے دیکھوں اسی لیے اس نے ایک آنکھ کی بینائی چھین لی۔"

سکھ سلطنت شمال میں تبت کی سرحدوں سے لے کر جنوب میں سندھ تک اور جنوب مشرق میں دریائے ستلج سے پرے تک پھیل گئی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے کچھ ہی برسوں بعد سلطنت کے اقتدار کے لیے سکھ سرداروں کی آپس میں لڑائی شروع ہو گئی۔ اس سے مختلف دھڑے پیدا ہوئے۔ رنجیت سنگھ کے بیٹوں نے اپنے درمیان تحقیر کی جنگ کی۔ ناجائز ہونے پر لگ بھگ کوئی حکومت قائم نہیں رہ سکی۔ انھوں نے خود ایک نئے ناجائز حکومت سے ریاست بنائے سلطنت کی حمایت مند بخشی سے بوسیدگی کی شکل اختیار کر لی۔ سکھوں سے معاملات میں دخل نہ دینے کے معاہدے کے باوجود انگریز حکام کی ترغیب سے اپنے آپ کو جام سے دو جو فوج کے بہاؤ کے سہارے ۱۸۴۶ء میں ملکوں کا اعلان کر دیا جنھوں نے ۱۸۴۵ء میں پنجاب کو اس کے ہاتھ

[illegible]

سکھ مذہب کی تاریخ

سکھ مذہب کی تاریخ کا آغاز گورو نانک سے ہوتا ہے۔ وہ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۳۹ء میں وفات پائی۔ ان کا تعلق ایک ہندو کھتری خاندان سے تھا۔ ابتدا میں وہ ہندو مت کے روایتی عقائد پر عمل کرتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہبی نظریات کا مطالعہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا ایک ہے اور وہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان، بلکہ وہ سب کا ہے۔ یہ تصور اس وقت کے لحاظ سے بہت انقلابی تھا۔

گورو نانک نے اپنی تعلیمات کو ۹۷ بھجنوں پر مشتمل ایک مجموعے میں جمع کیا، جسے جپ جی صاحب کہا جاتا ہے۔ یہ سکھ مذہب کی بنیادی دعا ہے اور ہر سکھ کو اسے روزانہ پڑھنا چاہیے۔ اس میں خدا کی وحدانیت، اس کی صفات اور انسان کے اس کے ساتھ تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ گورو نانک نے ذات پات، بت پرستی اور توہم پرستی کی سخت مخالفت کی۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ صرف نیک اعمال، سچائی اور خدا کی یاد میں ہے۔

گورو نانک کے بعد نو اور گورو آئے، جنہوں نے سکھ مذہب کو ایک منظم شکل دی۔ پانچویں گورو، گورو ارجن دیو جی نے ۱۶۰۴ء میں گورو گرنتھ صاحب کی تدوین کی، جو سکھوں کی مقدس کتاب ہے۔ دسویں گورو، گوبند سنگھ جی نے ۱۶۹۹ء میں خالصہ پنتھ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سکھوں کو پانچ ککار پہننے کا حکم دیا: کیش (لمبے بال)، کنگھا، کڑا، کرپان اور کچھیرا۔ یہ علامتیں سکھوں کی شناخت بن گئیں۔

گوبند سنگھ جی نے اعلان کیا کہ ان کے بعد کوئی انسان گورو نہیں ہوگا، بلکہ گورو گرنتھ صاحب ہمیشہ کے لیے سکھوں کا رہنما ہوگا۔ اس طرح انہوں نے ایک زندہ گورو کی روایت کو ختم کر کے ایک کتاب کو مستقل گورو بنا دیا۔

سکھ مذہب کے بنیادی عقائد میں ایک خدا پر یقین، ذات پات کی نفی، مساوات، محنت اور دوسروں کی مدد شامل ہیں۔ سکھ مندر کو گوردوارہ کہتے ہیں، جہاں ہر شخص بلا تفریق آ سکتا ہے۔ وہاں لنگر کا نظام ہوتا ہے، جہاں سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں تقریباً ۲ کروڑ سکھ آباد ہیں، جن میں سے بیشتر پنجاب (بھارت) میں رہتے ہیں۔ سکھ قوم نے ہمیشہ مظلوم کی مدد کی ہے اور اپنی بہادری کے لیے مشہور ہے۔ ۱۹۸۴ء میں سکھوں کی مقدس عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل پر بھارتی فوج کے حملے کے بعد دنیا بھر میں سکھوں نے احتجاج کیا۔ اس واقعے کے بعد بہت سے سکھ کینیڈا، برطانیہ اور امریکہ منتقل ہو گئے۔

سکھ مذہب کا فلسفہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کی عظمت اس کے اعمال میں ہے، نہ کہ اس کی ذات یا مذہب میں۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ مذہب آج بھی دنیا کے ترقی پسند مذاہب میں شمار ہوتا ہے۔

۵

تشخّص کا بحران

تاریخ میں سرتری در رفعت کا مضمحل فیہ مدتک ایسا زوال شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ترجیح اس بات کو دی کہ انھیں سنگھ صاحب کہا جائے، حالانکہ وہ صحیح معنوں میں ایک بادشاہ تھے۔ ان کے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ نے بے انتہا جاہ کر وہ، دستاہ بنے۔ سخت بات کہنے سے پرہیز کرتے ہوئے گرزم الفاظ استعمال کیے جائیں تو یہ کہا جائے گا کہ وہ ایک سادہ لوح تھا اور راجیوں کی ست لے اس کے دشمن کو مزید کمزور بنا دیا تھا۔ محنت برا ہے حق کو جتانے کے لیے وہ سب سے بڑی جو دلیل دیتا تھا وہ یہ تھی کہ اس کے چھ بھائی۔ شیر سنگھ، کاشمیر اسنگھ، دیشور، راسنگھ، اُلّا، اسنگھ اور دلیپ سنگھ ناجائز اولاد تھے۔ ان کی ماؤں کی نیک نامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے سکھ سردار غالباً اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھے۔ بڑے لڑکے کی حیثیت سے اس کا دعویٰ سب سے زیادہ زبردست تھا۔ ایک طرف کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ نے جلد ہی سرداروں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور باپ کے جیتے جی حکومت کے بیس بیشتر اصل قوت جیت سنگھ، جو اکو اپنے ہاتھوں میں دیا۔ دوسری طرف اس کے باپ نے چالیس سال تک لوگوں کو یقین دلانے میں صرف کر دیا کہ وہ بیوقوف اور اہل نہیں ہے۔

۵ نومبر ۱۸۴۰ء میں شراب، بیچینی، افیون اور تیز بخار (ملیریا) کی ترکیب کیا بھی کوں نہ جائے؟ ہیں مبتلا ہو کر کھڑک سنگھ کی موت نہیں سے زیادہ ایک طبعی حادثہ کا موقع تھی۔ توقع تھی کہ جیسے ہی نونہال سنگھ حالات پر قابو پالے گا، کہ اسی دن شام اس کے باپ کی ارتھی سمشان بھومی کی گیند سر یہ جیتے جی نے کی وجہ سے اس کی موت ہوگئی۔ انگریزوں کی منظوری سے اکھڑک سنگھ کے بھائی شیر سنگھ کو جانشینی ملی۔ لاہور کی درباری سیاست میں انگریزوں نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور یہ کوئی خفیہ کی بات بھی نہیں تھی کہ مختلف گروہوں نے جانشینی کے تنازعے میں ان کی مدد مانگنا شروع کر دی تھی۔

تخت پر بٹھایا اور اس کی

[illegible] جاگیر اور خود مختار حکمران کی حیثیت سے [illegible] ہوئے کہ [illegible] کو ہندوستانی متوسط طبقے نے سلطنت کے استحکام میں [illegible] سے فتنہ پردازی کے علاوہ کوئی اور [illegible] کی علامت کے طور پر مشتہر [illegible] ایک مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ حالات سے قابو سے [illegible] لوگوں میں سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت دلیپ سنگھ نے حاصل کی۔ [illegible] تیس سال [illegible] ہی ہوئی تھی۔ سنگھ بک سقے کی ڈلی تھی [illegible] لے [illegible] یہ [illegible] سنگھ کا اصلی بیٹا نہیں تھا بلکہ اس کی پیدائش کی جنس کو رانی جنداں کے تعلقات کا نتیجہ تھی

۱۸۴۵ء کے دائل میں انگریزوں نے ڈوگرا سردار گلاب سنگھ سے اتحاد قائم کیا اور موسم خزاں تک پنجاب پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی فوجوں کی صف بندی شروع کر دی۔ ہندوستانی جاگیرداروں کے روایتی فن غداری نے فتح حاصل کرنے میں انگریزوں کی ایک دفعہ پھر اس وقت مدد کی جب سکھ سردار تیج سنگھ جو کمک کے طور پر موقع پر پہنچا تھا لارڈ گف کی فوجوں کو جو ۲۲-۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کی جنگ میں تقریباً ہار مان چکی تھیں، ختم کرنے کے بجائے اپنی فوجوں کو لے کر چپ ہو گیا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے اتحاد کا انعام یہ دیا کہ اسے وہ علاقہ خرید نے کی اجازت دے دی جو آج جموں اور کشمیر کی ریاست کہلاتا ہے اور جس پر اس کے وارث حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کی کتب بکش میں سری سنگھ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔

۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو، ایک ناکام بغاوت کے بعد، انگریزوں نے سکھ سلطنت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ نے کوہ نور ہیرا ملکہ وکٹوریہ کے حوالے کر دیا۔ سکھوں کا کہنا تھا کہ آج رنجیت سنگھ مرے ہیں، مرے اور ان کے ساتھ اس نئے مذہب کی روح کا ایک حصہ مر گیا۔

اسی دوران دہلی میں، سلطنت کے نانک کو بڑی مضحکہ خیز تفصیلات کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔ مغلوں کے آخری دور کی حقیقت تخیل سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے، ۱۸۳۷ء میں تاج شاہی پہنا۔ بہادر شاہ بھی اپنے آپ کو "شاہ عالم" کہتے تھے اور سرسید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے مطابق، صدیوں پرانی خاکروہ اپنے آپ کو ایک کھوئی ہوئی بھیڑ کے روپ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس بیان کی توجیہ فراہم کرنے کے بجائے ہم اسے ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ مغلوں

انگریز ریزیڈنٹ کمپنی ڈنکس سے کہا کہ وہ انھیں کسی طرح ٹال دے۔ جب سپاہیوں نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا میں تو محض وظیفہ خور رہوں اور وہ ان کو تنخواہ دینے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ سپاہیوں نے کہا کہ وہ تنخواہ نہیں چاہتے جس پر لوگوں پر ملت لعنت کر دی جاتی ہے۔ مغل حاندان کا یہ آخری چشم و چراغ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا کہ اس وقت جب ان کو اتنے تشدید تھے رفقوں سے سادر شاہ جیسے آدمی کو مشاورت کے بغیر نہیں چھوڑ اور وہ قیادت کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔

انگریز نے اس اسی کو تباہ کرنے کے لیے مذہبی خطاب پیدا ہونے کا انتظار کیا۔ خصوصاً جب قید کے دن کہ جس ان مسلمان امت کے امام یہ جاہلوں کی فرمائی کرتے ہیں۔ انھیں یہ توقع تھی کہ اس موقع پر کائے بھائے یہ مسلمان ہیں روایتی، متعصبی ہو گی اور اس اکھا کو توڑ ڈالے گا۔ ہوا اس کے بالکل برعکس مسلمان لیڈروں نے دیکھ کو کو متوقع قرار دیا، جو ہادر شاہ نے کہرے کی فرمائی کر کے لوگوں کے سامنے ایک مثال رکھ دی جنگ کے دوران انگریزوں کے محاصرے کو توڑنے کے لیے صدر دستاویزوں نے بڑی جانثاری اور بہادری دکھائی۔ ایک مسلمان عورت سے بیٹے سب و ایک مجاہد کہا اور ہر سال بدھ کر توپوں سے کیے جانے والے ایک حملے کی قیادت کی۔ وہ گرفتار کر کے قید کی گئی۔ گرفتار ہونے سے پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے دو انگریزوں کو مار ڈالا۔ ۱۸۵۷ء اگست و ستمبر کے مکمل کا سنہ کے بریلی کی امداد کے لیے گئی ۱۳ ہفتہ تک قلعہ دہلی کی دیواروں میں رخنے پیدا کر دیے گئے اور ۲۰ کثر کا ہم یہاں نے پچی سطحات کو بچا لیا تھا۔ انگریز مسودے میں نے تیس ہزار گھڑ سوار تیس ہزار پیدل سپاہی ہونے کیس محل تنخواہ دے جانے پر لٹکائے گئے لوٹی دستوں نے دہلی کے حصے، سندوں کو چھوڑ کے کھانے تار، دہلی کو انگریزوں نے بالکل اسی طرح جس طرح جیسے تاتاریوں نے کیا تھا تباہ کر کے رکھ دیا۔ برطانوی دستاویزات کے مطابق ۸ ہزار اس لوٹ مار کے بعد لوگوں سے سکے دستیاب ہو سکتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ایک نیم مجھوی تعداد نے مال غنیمت کے کر اپنے ایسے حصوں سے سکے، جنھیں حاصل کر لی۔ سہو اور شاہ عالم کے بیٹے جواں بخت کا سمندر، اسی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس طرح انگریزوں نے دہلی سے اپنی حکومت کا وہ دروازہ چھین لیا جو شیر شاہ سوری نے سات سو سال پہلے بنوایا تھا۔ مگر اس دفعہ یہ حوں خزانہ ایک نئی جنگ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے بیچ لڑی گئی۔

اس تعلقات کے دوران سلطنوں نے یہ دکھا دیا کہ وہ ایک فرقہ کی حیثیت سے خود اپنے معاملات اور عزائم رکھتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے مختلف ہیں۔

[illegible] مارشی خاتمے کا اعلان کیا

[illegible]

[illegible] سکھوں کی [illegible] ۱۰۰ [illegible] ۱۰۰ [illegible]

حالت کی یہ عجیب و غریب کروٹ تھی جو [illegible] سکھوں کی [illegible] سکھ [illegible] سکھ [illegible] اور [illegible] کی آغوش میں [illegible] سکھوں نے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اس کے بعد [illegible] سکھوں کے [illegible] سکھوں کی [illegible] سکھ [illegible] سکھوں نے [illegible]

اندرونی [illegible] سکھوں کے [illegible] سکھوں [illegible] سکھ [illegible] سکھ [illegible] سکھ

انتہائی تیزی کے ساتھ نانک کے اندر پھیل گئی تھیں۔ اسی صرف پچاس سال قبل یہ خالصہ کی تعداد بڑھ رہی تھی، اور اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگی تھی۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں لکھا ہے کہ اگرچہ کیشیت مجموعی آبادی میں پچھلی مردم شماری کے بعد سے بیس فی صدی کا زبردست اضافہ ہوا ہے مگر سکھ رہ روبہ انحطاط ہے۔ وہ عام عیوب خصوصاً ذات پات، گرو ازم نے جن کے خلاف جنگ کی تھی پھر عام ہو گئے تھے۔ برہمن اور برہمن نے سندر اوت سر کے مقدس سرحدی صدر مقام میں ذات کے سکھوں کو داخل ہونے کی اجازت صرف مخصوص اوقات میں تھی اور انھیں گڑ پرشاد چھونے کی اجازت نہیں تھی اگرچہ یہ سب کیا کھایا تھا جو عوامی باورچی خانے سے بہ مشکل ملتا تھا اور شاذ و نادر ہی وہ ذات پات کی تفریق اٹھانے کے لیے ہوا تھا مگر مذہب کی حالت سکھ گرودوارہ کی حالت سے بڑی اچھی طرح ظاہر ہوتی تھی۔ انحطاط پایہ وہ عام تھا اگر اسے روکنے کی سعی نہ ہوتی تو وہ خود دین سکھ کو ہستی نابود کر دیتا۔

(۶)

پگڑی سنبھال جٹا

گوردواروں کا زبردست ظلم و ستم دیکھ کر گرنتھ صاحب کا مطالعہ کیا تھا۔ اسی وقت ۱۰ سال کے بڑے بیٹے بابا دیپ سنگھ نے واسی نامہ کے لیے قرآن کی بنیاد پر واسی نامہ کی طرح سیاسی نظام پر لکھا گیا۔ ان سیاستوں کو اس وقت دستور کہا جاتا تھا۔

یہ واسی نامہ گوردواروں کے انتظام میں مدد دینے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس میں ۱۰ سال کے لڑکے نے ان کے پیروکاروں کی روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ سکھ مسلمانوں کے خلاف سے خطرہ محسوس کر رہے تھے تو انھوں نے گوردواروں کو سکھوں کو دستیاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ سکھ حکومت سے لینے کے بعد گوردواروں کو لے جانا تھا۔ میں دی گئیں کہ مسجد میں کی آمدنی سے لیونگ کے لوگوں کی مدد کریں۔ ۱۰ ویں کی دیکھ بھال میں ان رقموں کو استعمال کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے خود ہی وہ دیا تھا۔ اس رقم سے خود انھوں نے اپنی مدد کی اور گوردواروں کا انتظام کیا۔ مورخین کے بعد انگریزوں نے ان کی تجدید تنظیم کی تو ان جنتوں نے ان ساری زمینوں کو اپنی موروثی ملک سمجھ دیا۔

یہ بالکل صاف تھا کہ سکھوں نے اپنی آزادی، اختیاری طاقتوں اپنے گوردواروں اور اپنے مقدر پر سے بھی اپنا اختیار کھو دیا تھا۔ گوردواروں کے منتظمین میں تبدیلی ہونے لگی۔ برائیوں کے گڑھ بن جانے لگے۔ تب دونوں تبدیلیاں ہونے کے ساتھ ہی مہنت وارم کی طرف مراجعت میں بھی تیز رفتاری آگئی تھی۔ سکھ قیادت نے رفتہ رفتہ مذہبی اور سیکولر تعلیم میں کمی اور اس کی وجہ سے سکھ عقاید اور سکھ شناخت پر فرد و نسل کے معدوم ہو جانے میں اگر سکھوں کو ایک الگ خود مختار مذہب کی حیثیت سے باقی رہنا تھا تو انھیں یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ ان کے مذہب کا مطلب کیا ہے؟ یکم اکتوبر ۱۸۷۳ کو امرتسر میں سری گرو سنگھ سبھا قائم ہوئی۔ سبھا کا مقصد سکھ سماج اور عیسائی مشنریوں کے اثرات سے اپنے عقائد کو محفوظ کرنے کا کام سب سے پہلے اسی تنظیم نے کیا۔ سبھا نے تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع کرنے، مقامی زبان میں سکھ تعلیم پھیلانے اور مرتدوں کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً نے جلدی ہی خالصہ اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا دیا۔ ۱۵۰ سے زیادہ ۱۸۹۲ میں۔ سب سے بڑا خواب اس وقت پورا ہوا جب امرتسر میں خالصہ کالج قائم ہوا۔ کالج میں باقاعدہ تدریس ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ سے شروع ہوئی۔ ۹۰۰ تک فنی تعلیم کی شدید ضرورت تھی۔ جیسے ہی زبان کے علاوہ سکھ فنکاری کی روح کے لیے سکھ بچوں کیلئے کالج قائم ہوا۔ ۱۸۷۳ کا سال جس میں سکھ سبھا وجود میں آئی سکھ تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ سبھا نے جیسے خالصہ دیوان ۱۹۰۲ء میں قائم کیا گیا جس پر صدی کے لوگوں کو غلط ہونے کا

گاڑی علیحدہ

ہو گیا ہے۔ اس نے مشن ہائی بشپ کاٹن اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی سمیت پاک کہ نہیں پر اس کی پرورش ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے جلیان والا باغ کے مقام پر ایک نہتے مجمع میں شامل مردوں عورتوں اور بچوں کے، جس میں زیادہ تر سکھ تھے، قتل عام کا حکم دیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس قتل عام میں ۳۰۹ افراد مرے تھے اور ۲۰۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ اخود ساختہ جنرل ڈائر بھی بدحواس ہو گیا تھا۔ جلیان والا باغ میں ڈائر نے صرف بادشاہ کے انتہائی خیر خواہ ملازم کی وفاداری ہی نہیں دکھائی بلکہ اس نے علاموں کے لیے آقا کی تحقیر کے جذبات کا بھی پورا اہتمام کیا تھا۔ سرکاری سکھ لیڈر بشپ کے رویے کے پیش نظر اس بات کا سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ گولڈن ٹیمپل کے سربراہ ارور سنگھ جیسے سکھوں نے جلیان والا باغ کے قتل عام کے بعد جنرل ڈائر کی عزت افزائی کیوں کی۔ دراصل جنرل ڈائر کی خدمت میں اعلیٰ ترین سند سروپا اور تلوار پیش کی گئی اور اسے ایک سونے کی سلسلہ بنایا گیا۔ صندر سنگھ کی کتاب دی اکالی موومنٹ (مسکین ۱۹۷۸ء) میں جس گفتگو کا اقتباس پیش کیا گیا ہے، وہ ایک ایسے چاپلوس خوشامدی کی جس کے لیے کوئی بھی تعریف کافی نہیں تھی اور ایک ایسے قاتل جو جوہڑوں پر طنطنہ کے ساتھ گھوڑوں کے ساتھ کھیل کرتا ہے۔ ایک مثالی بات چیت ہے۔ گفتگو کا اقتباس یہ ہے۔

"صاحب۔ آپ بھی نکلسین صاحب کی طرح سکھ ہو جاؤ"۔ نکلسین۔ جان نکلسن کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ یہ شخص ۱۸۵۷ء کا ایک انگریز ہیرو تھا۔ جنرل (ڈائر) نے اعزاز کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا مگر ساتھ ہی یہ اختلاف بھی کیا کہ "وہ انگریز افسر ہونے کی حیثیت سے اپنے بال نہیں بڑھا سکتا"۔ جنرل ڈائر نے یک اور اختلاف بھی کیا "میں سگریٹ بھی نہیں چھوڑ سکتا"۔ "یہ تو آپ کو کرنا چاہیے"۔ ارور سنگھ نے کہا۔ "نہیں"۔ جنرل نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے مگر میں سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا"۔ مصنف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "ہم آپ کو اسے آہستہ آہستہ چھوڑنے کی ہدایت دے دیں گے"۔ "میں وعدہ کرتا ہوں"، جنرل نے کہا "ایک سال میں ایک سگریٹ کے حساب سے"۔

مگر سکھ اور ان کے تہذیبی ایک نئے مرحلہ کے اوائل میں تھے جس میں وہ خود داری کے معنی از سر نو سیکھ رہے تھے۔ جلیان والا باغ کے بعد پنجاب انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ مہاتما گاندھی نے پنجاب کا دورہ کیا اور ان کی ہمت افزائی سے، انگریز دوست چیف خالصہ دیوان کے مقابلے میں 1919ء کے موسم سرما میں سنٹرل سکھ لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ لیگ نے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں ہی ۱۹۲۱ء میں یہ اعلان کیا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اس کا اصل مقصد ہے۔ اس نے اور سلسلہ وار مطالبہ کرلیا۔ جب اس نے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا تو سکھوں نے اس کا ایک عام ہڑتال کا سال (۱۹۲۱ء) میں ہی صحیح معنوں میں آغاز ہو گیا۔ سلسلہ کی سمجھ میں آگئی اور ۲۹ اگست ۱۹۲۰ء کو استعفیٰ ہو گیا

۱۹۲۱ء میں مرزوں سے ملے مصالحتی دبیش بامس میں کرداروں سے متعلق فیصلے کرنے کا حق دیا گیا اس
ورڈ لوسیا گیا۔ سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ ان کے مسجد مقامات سکھوں کو واپس کر دیے گئے۔ ان میں ملحقہ زمین بھی
انگریزوں نے جبدحوالی کی تھی اور اس کی قیمت بھی ادا کر دی تھی۔ اس صورت حال سے سکھ عوام بہت خوش تھے اور
جاری رہا انگریز پہلے ہی طرح پر مسلمانوں سے جب بیس بی پی سی کے ممبر ہر خوش ہو کر سکھوں سے جو نے ان
دستار لہراتے تھے گولڈن ٹیمپل کی چابیاں دے دیں تو انہوں نے پھر وفاداری کے لیے بیس بار دوں سے مصافحہ
سے بعد انگریزوں کو چابیاں واپس دے دیں مگر مجھ جی نے اس جیت کو قومی قریب کی حقیقی فتح قرار دیا۔ اصل فتح
کامیابی اگست ۱۹۲۲ء میں اکروڑ گاؤں گرداوارے پر قبضہ کرنے سے لیے جانے والا احتجاج تھا۔

امرتسر سے تیرہ میل دور واقع یہ مقام اس مقدس یادگار ہے جہاں پانچویں گرو ارجن کے تھے اس نے بعد
سندر داس کو بھی دسی عادتیں تھیں جن سے تو ہی اب واقف ہو چکے ہیں بہرحال جنوری ۱۹۲۱ء میں اس نے اس پی سی سے
کچھ مصالحت کرلی وہ خالصہ سکھ بنے پر راضی ہو گیا اور نئی عادتوں اور شوق کا کچھ جواز پیدا کرنے کے لیے اس نے پی ہیڈ
واشنگٹن سے شادی کو بھی منظور کیا۔ مگر جب اس قانون اور اس عہدیدار اس کی نظر پڑی جو انگریزوں نے نرائن اس
کو دی تھی تو اس نے معاہدہ توڑ دیا۔ ۹ اگست کو گرداوارے کے مقام پر سکھوں نے اپنا پر امن احتجاج شروع کیا اس بار
ان کے مقابلے پر صنعت کے غنڈے نہیں انگریز سامراج کی فوجیں تھیں۔

سکھوں نے اپنے کو جتھوں کی شکل میں منظم کیا۔ ہر جتھے میں زیادہ سے زیادہ سو افراد ہوتے تھے جتھا مسیح
کے وقت گوردوارہ ٹیمپل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی قسم کھاتا تھا اور پھر اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے لیے گرداوارے
کی طرف پیش قدمی کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو پولیس نے جتھوں کو گرفتار کرنا شروع کیا مگر جب جتھے ایک دوسرے کے
بعد لگاتار آنے لگے تو پھر پولیس والوں نے لاٹھیوں اور لاتوں کا استعمال شروع کر دیا۔ سکھ خاموش کھڑے پٹتے رہے
یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے اور انھیں گھسیٹ کر جیل پہنچا دیا جاتا تھا۔ پر امن مزاحمت کے اس غیر معمولی مظاہرے
نے نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر کی دنیا پر بھی اثر ڈالا۔ ایک امریکی فلم ساز کیمپبل اے ایل ورگیز آیا اور اس نے ایک دستاویزی
فلم "ہندوستانی شہادت کی معصومی تصویر" بنائی۔ انگریز حکام نے اس فلم پر پابندی لگانے کی بہت کوشش کی لیکن
انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ سوامی شردھانند اور علیم اقبال جیسے قوم پرست ہندو اور مسلمان لیڈر سکھوں کی
حمایت میں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ موقع فاروق یہاں لوگوں نے تقریریں کیں۔ کانگریس نے ایک تحقیقی مشن بھیجا
جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر ضرورت سے زیادہ قوت استعمال کی گئی اور بعض مقامات پر تو

لیڈر نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے ۵ اپریل ۱۹۲۱ء پر دی کونسل کے ۹۰۳ کے اس فیصلے پر رائے
جس نے سکھوں کے ہندو ہونے سے متعلق کیا تھا درکہا کہ "میں سکھ ازم کو ملی سطح کا ہندو ازم سمجھتا ہوں" یہ رائے عام
عوامی رائے میں ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیمات سے نہ تو کچھ کم ہے اور نہ زیادہ۔ اس بات سے آج سب ہی واقف
ہیں کہ دو بھائیوں میں ایک ہندو ہو سکتا ہے اور دوسرا سکھ۔ راجہ نرندر ناتھ کی یہ بدقسمتی تھی کہ سکھوں سے زیادہ
زیادہ کسی بھی شکل میں ہندو نہ ہونا چاہا۔ سکھ، ہندو سماج سے اپنے مقام سے متعلق کسی وقت میں بڑے حساس تھے
یہ کہ سکھ ہونے پر مطمئن تھے بلکہ سکھ رہنے کے لیے بے چین بھی تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی اس سوچ کو کہ ہندو
ہونے کی کیا ضرورت ہے، کبھی قبول نہیں کیا۔ سکھوں نے صرف اپنی شناخت کو برقرار رکھا بلکہ اپنی یہ حساسیت بھی
کہ آنکھوں دائیں بھی ان کی اصل محرک ہے۔ گرودوارہ تحریک کے ایک لیڈر مہتاب سنگھ نے ۸ اپریل ۱۹۲۰ء کی
بحث میں حصہ لیتے ہوئے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں بڑے واضح طور پر کہا تھا "ہم تک
میرا سوال ہے میں کہتا ہوں کہ سکھ اگر ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو ہندو اس سلسلے میں ان پر زور کیوں ڈالیں
زبردستی انھیں اپنے ساتھ رکھیں؟ ہر ملک میں لوگوں کو اپنی کمیونٹی میں تبدیل کرنے کی کوشش ہوتی ہے
یہی جذبہ ہے جو اس سارے جوش و خروش کی تہ میں ہے۔ ہندو کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمھارے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے
اتحاد چاہتے ہیں کہ تمھارے گرودوارے کچھ تمھارے ہیں اور کچھ ہمارے۔ ہم کہتے ہیں کہ اپنے مفادات کو تم خود
سنبھال سکتے ہیں اور سنبھالنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔"

اور جناب داس ۱۹۲۰ء کے جوش و خروش کی تہ میں حقیقتاً یہی تھا اور بیسویں صدی کی ساٹھویں دہائی کے ہندو
کی نہ میں بھی یہی فلسفہ ہے اور مہتاب سنگھ معتقد گروہ سے متعلق رکھتے تھے سکھ متعدد کی بیداری نے بہت سے
ہندوؤں پر ڈگمگر ڈالی۔ کالیوں نے درحقیقت سکھ ازم کو کیا۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں پنجاب کی
اشاعتی ریاستوں کو چھوڑ کر ۸۴ء۳ فی صدی آبادی نے اپنے آپ کو ہندو لکھوایا، ۵ء۴ فی صدی مسلمان اور
صرف ۲۲ء۱ فی صدی سکھ، اور سکھ مرید کہ ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں ۹ء۸ فی صد سکھوں کے مقابلے میں ہندو ۸ء۴
فی صد تھے۔ یہ بات ہے قرات کہ ہندو ازم کا نقطۂ عروج تھا مسلمان بھی اس دہائی میں ۵۶ء۴ فی صد سے
ہو کر ۳۹ء۴ فی صد رہ گئے مگر ۱۹۱۰ء میں سنگھ سبھا کی کوششیں ارآور ہونے لگی تھیں۔ سکھ ۶۳ء۱ فی صد
ہو گئے تھے ۱۹۰۱ء میں ان کی تعداد ۲ء۱۱ فی صدی، ۱۹۲۱ء میں ۲ء۳۹ فی صد اور ۱۹۳۱ء میں ۳ء۲۹ اور
۱۹۴۱ء تک بڑھ کر ۶۲ء۴ فی صد تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی تعلیمی کمیٹی کی مدد کے بغیر تعداد ۱۹

(۷)

پیچیدہ اقلیت

اس صدی کی تیسری دہائی میں سکھوں کے سامنے ایک مسئلہ تھا۔ ان کی تقدیر بہت حد تک غیر مقسم ہندوستان کی آبادی کا محض ایک فی صدی حصہ اور غیر منقسم پنجاب میں کھڑے ہوئے تیرہ فی صدی۔ اس دہائی کی سب سے بڑی بحث تقسیم ہوں یا تقسیم نہ ہوں۔ میں لوگوں نے اپنے آپ کو کناروں پر کھڑا ہوا پایا۔ اگر یہ اگر چہ اپنے صدی آخری سرل میں نئے مگر نئے گھروں کی بات سننے پر تیار ہو جاتے تھے۔ وہ لوگوں نے محسوس کیا کہ نظری طور پر وہ ایک آزاد رائے دہندگی رکھ سکتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی مخصوص علاقائی علاقہ نہیں ہے جہاں وہ اپنے خواب کی تعبیر کر سکیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صوبہ پنجاب میں سکھوں کی اکثریت والا کوئی علاقہ تھا ہی نہیں۔ درپردہ بات کانگریس، مسلم لیگ اور انگریز سب جانتے تھے

۱۹۲۰ء میں صدی کے نصف آخر کے تجربے اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں قابل اطمینان حد تک صدی حوالے کیے جانے والی جدوجہد نے سیاستدانوں (خاص لیڈروں) کو مرکزیت کی حالت میں خراب ہونے کے امکانات کی طرف سے بہت محتاط کر دیا تھا۔ مذہبی بنیاد پر کسی علاقہ کو ختم کرنے کے لیے محض آریہ سماج کا مدعا ہی نہیں بلکہ ۱۹۲۰ء کی دہائی سے بعد میں رونما ہونے والی تقسیمیں بھی تھیں اگر یہ دونوں کام ختم ہونے والے تھے اور مذہبی تعصب کی بنیاد پر ہندو صوبہ پنجاب کی تقسیم صدی کی بات ہو جائے گا۔ شہری علاقوں کو یہ صلاحیت (جیسے کہ تعلیم کی بنیاد پر) ہندو ہیں۔ اب اس میں اپنے آپ کو تیسرا سب سے بڑا گروپ رکھنے یا حاصل کرنے کے لیے تیار دہ سے زیادہ فائدہ مند ہونے کا بہتر وقت نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی کے اس دور میں ہندو اور اسلامی فرقہ بندی تیز ہو گئی۔ آبادی کے لحاظ سے ہندو کہیں بھی ہیں مگر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۱ء تک ہندو آبادی کے بعد کوئی سلسلہ وار صدی میں تیسرے کرنے کا نہ ہوا۔ اس حقائق میں ایک دلچسپی کی حقیقت شامل ہے اور وہ یہ کہ سکھ ہونے سے مذہب کے لحاظ سے ہندو ہی ہے۔ ہندو ہونے کا مگر مسلمانوں کے ساتھ ہونے سے زیادہ ہے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہونے والی

اگر پاکستان حقیقت بنا تو انھیں چھوڑنا پڑے گا

سکھ تعداد میں کم تھے مگر خوش حال تھے غدر کے بعد کی نگہبانوں کی مہربانیوں کی وجہ سے مرکزی اضلاع میں سکھ سب سے بڑے زمیندار تھے مثلاً لاہور ڈویژن میں زمین کے کل لگان کا تقریباً ۴۶ فی صدی حصہ یہ لوگ دیتے تھے تجارت اور سود پر روپیہ چلانے کے کاروبار میں اپنی فوقیت کی وجہ سے ہندو دوسرے نمبر پر آتے تھے اس کاروبار کرنے والے دو سکھوں میں بھی تھے جیسے اوڑہ تقسیم سے پہلے لاہور میں ۲۹/۶ کروڑ روپیوں کا سرمایہ لگا تھا اس میں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ۱۲/۵ کروڑ روپیہ تھے سکھوں کی نوّے شاخوں میں سے صرف تین مسلمانوں کی ملکیت تھیں اور ہر کمپنی کی نوّے شاخوں میں سے ۵۰ کے مالک مسلمان تھے۔ کرپال سنگھ اپنی کتاب "دی پارٹیشن آف پنجاب" اجناب یونیورسٹی پٹیالہ، میں لکھتے ہیں "زراعت کے بعد ساہوکاری سب سے اہم تجارتی سرگرمی تھی۔ مغربی پنجاب کے مسلمان کاشت کار میں حیثیت الجماعت متاں اور راولپنڈی ڈویژن کے ہندو اور سکھ ساہوکار ان کے ضامن رہتے تھے اس اقتصادی تسلط نے مسلمانوں کے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی تھی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے اقتصادی استحصال کے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵۰ لاکھ مسلمان مشرقی پنجاب میں ۲۰ لاکھ ایڈمنسٹریٹو آفیسر پاکستان سے دوسری طرف ۶۹ لاکھ سکھ اور ہندو ۶۷ لاکھ ایکڑ زمین پاکستانی پنجاب میں چھوڑ کر ہندوستان آئے اس حقیقت کو نگاہ میں رکھا جائے کہ مغربی پنجاب کی زمین کو الاٹی کے اعتبار سے بہتر تھی۔ تب بھی یہ اعداد و شمار فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخر میں سکھوں کی طرح مسلم لیگ نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زرخیز زمینوں کا بڑا حصہ مشرقی پنجاب کے مسلمان کاشت کاروں کو پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ اُس وقت ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کو یہ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ اس تسلط کی بھاری قیمت انہیں چکانی پڑے گی

پنجاب کے اس سب سے کٹھن مسئلے کے حل کی کوششوں کی داستان دو ماہ سے تھی۔ ۱۹۳۴ء کی گول میز کانفرنس میں سکھوں نے ایک بڑا سیدھا اور سلجھا ہوا تجویز کیا ان کا کہنا تھا کہ جن ضلعوں میں ۵۰ فی صدی سے زیادہ مسلمان آبادی والے علاقے راولپنڈی اور ملتان کے ۱۲ اضلاع کو خارج کر دیا جائے تو مسلمان اور غیر مسلموں کے مابین توازن برابر ہو جائے گا مسلم لیگ ایسی تجویزوں پر کان دھرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ ایک لمبے پاکستان کا خواب دیکھ رہی تھی جو جنوب میں افغانستان کی سرحدوں سے دہلی کے مشرق میں علی گڑھ تک، شمال میں کشمیر کی سرحد اور مشرق سے لے کر جنوب میں راجستھان کے صحرا تک پھیلا ہوا تھا یہی وہ تھی جو سوچ صاحب نے پاکستان حاصل کرنے کے بعد کہا تھا انھیں ایک "کرم خوردہ" پاکستان ملا ہے

۹۰ تک پنجاب سے بچے چھ پیشن سے تھا رہے تھے اور ان میں سے جو مسلمان ہوں ان میں سے
سلطنت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ ہے
میں ہیں کے کریک۔ سندھ یونیورسٹی میں ہے یہ مسئلہ جو اتنا پیچیدہ ہو جاتا ہے مڑیں وہیں ہی
ہو جاتے اس سے ہم اس میں سے ذاتی عورت میں ہو اس سے ہوتے ہیں یا نہیں ہے وہاں تک
رسد حیات خان، علی اس طرح رہ رہے تھے اس طرح ان کے ساتھ جس حق سکتا ہیں ایک دوسرے
کے ہیں ہے متوسط اور جو حق حل کے لیے کہ سال تھے ۔ ۔ ۔ ہے تو ہی ان کے ساتھ ان کی
ہوں ہیں ۔ ۔ ۔

[illegible] ۱۹۲۵ء میں [illegible] ۱۹۲۶ء میں [illegible] ۱۹۲۷ء میں [illegible] ۱۹۲۸ء میں [illegible] ۱۹۲۹ء میں [illegible] ۱۹۳۰ء میں [illegible] ۱۹۳۱ء میں [illegible] ۱۹۳۲ء میں [illegible] ۱۹۳۳ء میں [illegible] ۱۹۳۴ء میں [illegible] ۱۹۳۵ء میں [illegible] ۱۹۳۶ء میں [illegible] ۱۹۳۷ء میں [illegible]

سکھ تھے ہوتے تھے کہ ان کے ہیں نہ کوئی ایک مسلم اکثریت والے علاقے میں چھوڑ دیئے جائیں گے۔ کانگریس یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ سکھ اس سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو جائیں۔ حقیقت کے پیش نظر اس کمیٹی نے مشرقی پنجاب کے مقابلے میں انگریز کے ہیں زیادہ ۱۵۰ درجے۔ یہ ایک عجیب و غریب اور اہم فیصلہ تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر جناح کو مطلع کرنے کے لیے سکھوں کا ایک وفد روانہ ہوا۔ گیانی کرتار سنگھ اور ان کے ساتھی بھی اس وفد میں شامل تھے۔ ڈان کی ۱۵ اگست کی اشاعت میں ریوٹر نے لکھا ہے کہ "ماسٹر تارا سنگھ نے کہا تھا کہ اگر پاکستان سکھوں کے مرضی کے خلاف قائم کیا گیا تو وہ اس کو ختم کر دیں گے جس طرح گرو گوبند سنگھ نے مغل سلطنت کو پارہ پارہ کیا تھا۔" گرو گوبند سنگھ نے مغل سلطنت کو پورے طور پر پارہ پارہ نہیں کیا تھا۔ ان کی تلوار نے کرتار سنگھ پاکستان کے قیام کو روکنے کے لئے جس حد تک مسلمانوں کو محسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان وجود میں آ کر رہے گا، ایک خود مختار سکھ ملک کا قائم کرنا چاہا۔ یہ خیال ایک مضحکہ خیز مطالبہ تھا۔ اس وقت ان کے ساتھیوں نے ان کو منسوب دشمنات کے اجلاس میں کہا تھا کہ "ہم ہمیشہ کے لئے گرو گوبند سنگھ کی ساری زندگی کی جدوجہد اور مسلمانوں کو ختم کر دیں گے۔"

پاکستانی پنجاب کے چالیس لاکھ مسلمانوں اور مشرقی پنجاب کے اتنے ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا گناہ ان کا اُن نمائندوں اور رہنماؤں کے ذریعے طے پایا گیا جنہیں ان لوگوں نے دنیا کی تاریخ کے بدترین جرموں میں حق لینے کے لیے منتخب کیا تھا۔ مسلم لیگ تنہا نہیں تھی جس نے ان دنوں سے کام کیا تھا۔ ایسی کئی اور سیاسی جماعتیں بھی تھیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ ان میں سے ایک جماعت نیشنل ایوارڈ آف مسلمانوں کا ایک ہیں ۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کے یونائٹڈ کے ترجمان ڈان میں شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے کہا تھا کہ "ہندی مسلمانوں کی کیفیت اور اس کا انتہائی عملی حل تھا آبادی کا تبادلہ" ——— پاکستان کے خلاف کانگریس کی طرف سے بار بار پیش کی جانے والی واحد مکمل جواب ہوگا۔ ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے چند ماہ قبل تک، مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اگرچہ یہاں کے مسلمان لیڈر میں سب سے زیادہ فیصلہ کن تھے، اس وطن کی سرزمین کی طرف جانے کا ارادہ نہیں کیا تھا جو جناح صاحب انہیں پیش کر رہے تھے۔ دوسرے پنجاب میں مسلمان اور سکھ بھی اس مسئلے میں گرفتار تھے لیکن گمان تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ کہاں جائیں گے۔ وہ صدیوں سے رہتے بستے آ رہے تھے اس لیے یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کو اپنی جڑوں سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کی حفاظت اور ان کی مدد پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان کو ان کے ساتھیوں نے گمراہ کر کے، راہ سے ہٹا کر اور یہ سب کچھ چند مٹھی بھر سیاست دانوں کی حرص و ہوا پرستی

مارے ہیں مارتی مورہے ہیں یہ سے ۲ دن میں سطرف آگ ہے، دوسرے ھ میں مدد ر تقد ت
کو ہمیں تبدار سے ہیت معافی سے لکھا دلیم لھا د گست کو یہ ملک تھا، ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء
میدان جنگ بن گیا۔ سکھ درمسلمان دہائی جو بھی ۱۵ گست تک بھائیہ سے بدل دراندی سے جان تک
شقال گئیوں کے باوجود ساتھ ساتھ رہتے تھے جنہم راں میں مت گئے، اور اس کا انجام اس دقت جیسے
رب درتحمت کے ساتھ گھتا رہ جو کیا ناقابل یقین چیز ہو کچھ کر ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ آج بھی ملک میں سے
۔ ۔ ۔

(۸)

سودے باز

یونینسٹ پارٹی کے زوال سے جو خلا پیدا ہوا تھا وہ مذہبی بنیادوں پر پیدا ہوا۔ مسلم لیگ نے ۹۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۵ پر قبضہ کر کے زبردست کامیابی حاصل کی۔ کانگریس نے بھی ۲۰ نشستیں جیتیں اور مذہبی محفوظ نشستوں کا ایک اچھا خاصہ حصہ حاصل کر لیا۔ لیکن کانگریس جس نے مسلم اکثریتی نشستیں حاصل کی تھیں، مسلم لیگ یا اکالیوں کی طرح کسی ایک مذہب کی پارٹی نہیں تھی۔ اکالیوں میں ایک خالص سکھوں کی جماعت ہونے کے باوجود کانگریس نے اکالیوں کی باقی نشستوں پر کامیابی کے مقابلے میں دس سکھ نشستیں حاصل کیں۔ کانگریس نے ایک مسلم نشست پر بھی کامیابی حاصل کر لی۔ یونینسٹ پارٹی جو سر فضل حسین، سر سکندر حیات خاں اور سر چھوٹو رام کی موت کے بعد اپنی داخلی قوت کھو بیٹھی تھی، اب بھی اپنے نظریات کی پیروی تھی، اس کی حمایت مذہبی تفریق سے بلند تھی۔ جن نشستوں پر کامیاب ہونے والے اس کے امیدواروں میں ایک ہندو بھی تھا۔

انتخابات کے نتائج اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اکالیوں کے اس دعوے کو کہ سکھوں کی نمائندگی وہی اور صرف وہی کرتے ہیں، جھٹلا دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد ہندوستان کے انتخاب میں رائے دہندگی کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ ایسے دعووں کی قلعی کھول دیتی ہے مگر خود انگریزوں کے کرائے ہوئے انتخابات میں جب نشستوں کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر کی جاتی تھی اور مذہبی جذبات اپنی بدترین شکل میں سامنے آ رہے تھے، اس وقت بھی اکالی دل، اس سکھ نشست پر کانگریس کی کامیابی کو روک نہیں سکی۔ یعنی انتہائی سازگار حالات میں بھی اکالیوں نے محض ساٹھ فی صدی سکھ نشستیں جیتیں۔ باقی سکھ ووٹ سیکولر پارٹیوں، جیسے کانگریس یا کمیونسٹ، نے حاصل کیے۔ یہ سکھوں کے لیے خصوصاً آزادی کے بعد سے بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ اس کا جواب ان کے پاس صرف یہ ہے کہ وہ سکھی جذبات کو ابھار کر زیادہ سے زیادہ سکھوں کو اکالی صفوں میں لے آئیں۔ شکست سے بدحواس ہونے والی ان کی بے بسی اور مجبوری انھیں جو زاویے، فکریت کی طرف دھکیلتی ہے۔ سکھوں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہیں مان پاتے ہیں کہ جمہوریت میں مقدرات بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق سکھوں کو مستقل طور پر اکالی کے ماتحت رہنا چاہیے، کیونکہ وہ خالصہ کے جسے گرو گوبند سنگھ کی تائید حاصل ہے اور عقیدہ اسے توانائی بخشتا ہے۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ اکالیوں نے اس تبدیلی کا ساتھ نہیں دیا ہے جو ایک جمہوری نظام حکومت کی سیاست کو ان بھی سکتا ہے اور اس پر لیبک بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر جھگڑے کی صحت افزائی نہیں کر سکتا، تو بھی نہ تو جاگیردارانہ اور نہ ہی نوآبادکار۔ اکالی لیڈروں نے اس طرح عمل کیا ہے گویا وہ سکھ ازم کے محافظ ہیں، جس کے وہ جواں نمط سے ازلی ہیں۔ سکھوں نہیں نے مگر سکھ عوام نے اپنے وجود کو اکالیوں کے وجود سے نہیں کیا ہے۔ سکھوں کی

[illegible] ہیں۔

[illegible] ہیں۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] ہیں۔ [

مخالفت کی تھی نے تو انڈین یونین کے اندر ایک سکھ کی حیثیت سے سوبے کے سکھ صوبے کو بھی ۱۹۶۶ء میں
مان لیا گیا تھا ردکرا دیا تھا۔ مذہبی سکھوں نے انتخابات میں بڑی تعداد میں کے ساتھ اکالیوں کے حق میں ووٹ دیئے
اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ اکالی سکھ ووٹ حاصل کرنے کا کام انہی کی تعداد ووٹوں کی بنیاد سے شروع کرتے ہیں اور پھر
شہری اور دیہی کشمکش اپنے تضادات پیدا کرتی ہے۔ شہری سکھ سوائے غیر معمولی موقعوں کے اپنی آزادی کا
لیے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے سب سے زیادہ سکھ کاشت کار دیہی کمیونسٹوں کے زیر اثر مضبوط حلقے ہیں۔ تقسیم
کی تعداد کو اگر سامنے رکھا جائے تو کمیونسٹوں نے اس کی تعداد سے بڑے تسلسل کے ساتھ حاصل کیے ہیں۔ اس
صورت حال میں اگر مزید یہ حقیقت اور شامل کر لی جائے کہ خود جاٹ کاشت کاروں میں ایک حلقہ ہے جو اکالیوں کے
ایک مذہبی ریاست کے خواب میں شریک نہیں کیا تو ہمیں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اکالیوں کے لیے خود سکھ اکثریت
والے پنجاب میں جمہوریت کے ذریعے حکومت میں آنا کتنا مشکل ہے۔ دراصل سکھ تو صرف ووٹوں کا بنک ہے جو اکالیوں جیسی خالص
سکھوں کی کسی جماعت کو کبھی بھی ووٹ نہیں دیں گے۔

بہرحال جب تقسیم کا یہ حساب ۱۹۴۷ء میں اقلیتی ذہن سے بہت دور تھا۔ خواب غوری یا دوستک کے حامی
لسیاں برسا جیتے گئے تھے اور پناہ گزینوں کی بازآبادکاری کا کام انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ میں لے لیا گیا تھا۔ اس بھی
ایک گراں قدر کوشش کے ساتھ کام میں شامل ہوا۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی ازسرنو تقسیم سے زمینوں کی
ملکیت کے معاملے میں ایک انقلاب آگیا۔ غیر حاضر امیر مالکان زمین فاضل ہو گئے اور زمین کے روایتی حقوق رکھنے
جوتنے والے کاشت کار کے پاس آگئے۔ پناہ گزینوں کو معاوضہ 'معیاری ایکڑ' یعنی زمین کی پیداوار کی صلاحیت کے
لحاظ سے دیا گیا۔ ایک معیاری ایکڑ سے مراد اس ایکڑ زمین کے رقبے سے ہوتی تھی جس میں دس گیارہ من گیہوں پیدا ہو
جاتا ہو۔ اس عمل سے یہ ہوا کہ مہاجر سکھوں کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ زمینوں کا مالک بن گیا۔ کاشت بھی اس
نتیجے پر پہنچے چکے تھے کہ علاقائی کانگریس پارٹی سے سکھوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی صورت نہیں
ہے کہ ان کا تناسب بن جایا جائے چنانچہ ہوا تماز کاں لیڈروں نے اس بنا پر کے تقسیم کے بعد سکھ آبادی
کی کمی کر دی ہے اکالیوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور اب کانگریس کی حیثیت سے ہی کاشت کار مفاد کے
کاموں جوں کانگریس کے قریب آنے لگے۔ سکھ عام سیاسی طور پر پہلے سے سیاست سے سیاست رہے اور
اسی ساری توجہ مذہبی بیداری کی طرف مبذول کر دی۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں اکالی سٹوڈنٹ فیڈریشن کی
لیڈر شپ نے اکالیوں کو اسی اصل حیثیت پر برقرار رکھنے پر زور دیا اور اسی کی تائید حاصل کی

۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان کے داخلی حصّے کے بننے کا عمل طے ہو رہا تھا تو یہ طے ہوا کہ ۲۲ ریاستوں کو ملا کر ایک الگ اکائی بنا دی جائے گی۔ سکھ شاہی ریاستوں الشول، دیا کوٹ، مالیر کوٹلہ اور نالاگڑھ کو پیپسو (PEPSU) بنانے کے لیے ایک الگ اکائی میں شامل کر دیا گیا۔ پیپسو میں سکھ اور ہندو تعداد کے لحاظ سے برابر تھے۔ ۴۸/۱۹۴۱ء کے مقابلے میں ۴۹/۱۹۴۳ء کی مردم شماری میں سکھ آبادی غالب، اور ہندو غالب تھی۔ سکھ پیشوا گرنتھوں نے پیپسو سے ملحق اضلاع میں بسا شروع کیا۔ اس وقت امرتسر، لدھیانہ، جالندھر کی ذیلوں کے سربراہ ایسے سکھ تھے جو تقسیم سے قبل مشرقی اکالی رہ چکے تھے چنانچہ بدکاری کے اس نئے کچھ ہندوؤں نے بھی شمولیت کے عمل دخل کا شبہ شروع کر دیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان کشمکش سکھ ہندو مرکز یا ں کے مانوس مسئلے کے نام پر شروع ہو چکی تھی۔ سکھ عقیدے کے مرکزی عوامل ہیں: گرو گرنتھ اور گرو کھی پنجابی رسم الخط گرو کھی ہے۔ یہی وہ رسم الخط ہے جس میں سکھ مذہبی صحیفے لکھے گئے ہیں۔ اس رسم الخط کو اسی مقصد کے لیے دوسرے گرو انگد نے بنایا تھا۔ یہ آخر مذہب کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔ گرنتھ نے کہ بعد سے، ہندوؤں نے جو عام طور پر پنجابی بولتے ہیں، پنجابی زبان کو ریاستی حکومت کی سرکاری زبان بنانے سے رکنے کے لیے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ اس کی ادبی زبان ہندی ہے۔ سکھ چونک پڑے، جذب کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ یہ عمل پنجابی ختم کرنے کی اس سازش سے شروع ہوا تھا جس نے ایک چھوٹے پنجاب کا مطالبہ پیدا کیا جس میں کم از کم پنجابی زبان کے ساتھ ہندی سرکاری زبان ہو سکے۔ ڈیڑھ سو سال میں پہلی دفعہ سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ۱۹۵۱ء میں مردم شماری کے وقت علامت شروع ہو گئے۔ مقامی مسئلہ یہ تھا کہ ان فسادات سے ہندوؤں، سکھوں کے درمیان تقسیم ۱۹۶۱ء میں اس وقت ہوا تھا جب پنجاب کے صاحب منگھ اور دوسرے سکھ رہنماؤں کے سکھوں نے کمبھ کے میلے کے موقع پر ہندو مقدس اور زائرین پر حملہ کیا تھا۔ کمبھ کا میلا متبرک شہری دور کے مقام پر ہونے والا ایک عظیم ہندو تہوار ہے) سیکولر ہندوستان میں، پنجاب کے ہندوؤں نے ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ لگا کر ہندی زبان، ہندو مذہب اور ہندوستان کی فطرتاً یک تشیت کو جنم دے دیا۔ سکھوں نے اس کے جواب میں "خالصتی پنجابی سوبہ" کا نعرہ لگایا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے نہتا خاموش تھا۔ اب ایک بار پھر اس کے لیڈروں نے مذہبی قیمت کو زندہ کر دیا۔ چنگاریاں شروع ہو گئیں۔ "سکھ سیاسی ریاست کے محفوظ نہیں رہ سکتے۔" "سوبہ تھا" پنجابی سوبہ"

پنڈت جواہر لال نہرو کسی طرح بھی کٹر متعصب نہیں تھے۔ ان کے دشمن بھی کبھی ان پر اتنا زور دیے ہوئے الزام نہیں لگا سکے۔ مگر یہ ایک چیز ضرور تھی جس کے لیے وہ کٹر ہو گئے تھے اور وہ تھی ہندوستان کی علاقائی سالمیت۔

[illegible] اکالی دل [illegible] سکھ [illegible] ایک ذہانت [illegible] اس وقت [illegible] ذہانت سے بڑی تیاری [illegible] ۵۴۰ فی تیاری [illegible] سکھ جتھے [illegible] اسٹیٹ [illegible] پنتھک [illegible] رپورٹ [illegible] صورتحال سے [illegible] سیاست میں [illegible] اکتوبر [illegible] ایشن کی [illegible] ۳۰ ستمبر [illegible] ۱۹۵۱ء [illegible] حکومت ہند کے سامنے پیش کی تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ [illegible] آزادی سے [illegible] لکھ سکے [illegible] ان کے [illegible] سکھوں [illegible] سکھ [illegible] ان [illegible] ماسٹر [illegible] مطالعات [illegible] چرب [illegible] ان [illegible] پیچھے [illegible] حقیقی [illegible] ملکی [illegible] نہیں تھی [illegible] وہ [illegible] یہ [illegible] سکھوں [illegible] [illegible] [illegible]

اندرا نوجائزہ لینے کا کام کیا گیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو کابینہ کی کمیٹی نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا کہ ایک صوبہ جس میں پنجابی بولنے والوں کی زبان ہو بنایا جائے۔ اس فیصلے کا نفاذ ہو گیا۔ پنجاب ایک بار پھر تقسیم کیا گیا اس بار تین حصوں میں۔ ایک حصہ ہماچل پردیش کا صوبہ بنا دیا گیا جس کا علاقہ ۱۹۸۳۵ مربع میل اور جس کی آبادی ۱۹۵۳ء میں ۱۳۵ لاکھ تھی۔ اس میں پنجابی بولنے والے سکھ تھے ۲۱۵ ہزار ۱۰۳ مربع میل اور ۱۰۳ لاکھ افراد۔ اس کے دو اضلاع صاحبی اور مشتمل دوسرا حصہ ہماچل پردیش ہو گیا۔ اس تخفیف کے بعد پنجاب بقیہ ۲۰۲۵۴ مربع میل کے علاقے میں اور جس کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۱۱۲ لاکھ تھی۔ پنجاب میں ہندو اکثریت میں تھے۔ ان کی تعداد ۵۶ لاکھ تھی۔ ان کی زبان ہندی تھی۔ ان کے ضلعے اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر مشتمل ہریانہ کی نئی ریاست بنا دی گئی۔ اس کی آبادی ۱۱۲ لاکھ تھی اور یہ جس علاقے میں تھی وہاں سکھ اکثریت میں تھے۔ ان کی تعداد ۵۶ لاکھ تھی۔ ہریانہ کی وزارت نے اس وقت تک کے لیے چندی گڑھ کو جو پنجاب کی متنازعہ راجدھانی بنا دیا تھا۔ اپنی نئی ریاست کی راجدھانی تعمیر کر لی۔ سنت فتح سنگھ بہت خوش تھے۔ انھوں نے کہا کہ "یہ ہے گھر میں بیٹھے خوب صورت پھل" سنت جی نے اس کو "ہماری صوبہ بھر آخری مطالبہ" کہا تھا۔ انھوں نے نئے صوبے کے لیے جدوجہد کو "ہماری دھرم یدھ" کہا تھا۔ سکھوں کی بیل بوٹا ڈس کہہ کر رد کر دیا ماسٹر تارا سنگھ زیادہ سخت تھے۔ انھوں نے کہا کہ سنت ایک مذہبی آدمی ہیں اور سیاست کو نہیں سمجھتے ہیں۔ دہلی میں یہ افواہ عام تھی کہ جب ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے تو وہ اپنے کو ختم کر دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کی ایک دوسری مہم میں لگ گئے۔ یہ مہم تھی امتحانات جیت کر اپنی حیثیت کا اظہار کرنے کی۔

سکھ پنجاب کے قیام سے [illegible] اس کی قسمت میں سیاسی مقدمے لڑنے لکھے تھے۔ ۱۹۶۶ء کے بعد پنجابی سوبہ کی تحریک کے بعد اس صدی کی آخری دہائی میں سکھ جنگ پسندوں کے فتنہ کا مقابلہ کرنا اور [illegible] ایک بڑی قیمت چکانا تھا۔ ایک پرانے کانگریسی لیڈر جنھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک الگ سکھ صوبے کے قیام کی تحریک سے علیحدگی کی تھی وہ [illegible] زیر نظر ہی ہیں۔ جیت موقی نے کہا حالات کیسے کیسے بدلے [illegible] ہیں [illegible] کہ [illegible] کہیں زیادہ [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] ہیں

(۹)

عقیدے کی سیاست

کی پرورش ہوتی رہی۔

بادشاہ یا بادشاہ سے متعلق اس عظیم سفید بادشاہ سے متعلق جس کے گورے فوجیوں اور سول افسروں کو ہندوستان میں الاقوامی عظمت دلائی گئی۔ بعض عام کچھ کہہ رہیں کر رہے تھے اس صورت حال میں گرآپ کو کوئی علیحدہ موقع ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھنے والے ہوں نے رکاوٹ کی وقت کو کھل کھیلنے اور جانے کا عظیم کارنامہ کارنامہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

بہرحال یہی حال کردہ عسکری نسل سے ہیں اور اس معاملے میں سکھ راجپوتوں اور پنجابی مسلمانوں میں اپنے ہات بچوں کی طرح ہی ہیں جن کی پنے بارے میں یہی رائے ہے، ہتھیاروں کے مالکس خریدے ہوئے یا ہم ان کی آزادانہ تقسیم کے حکومت سے اکھاڑوں کے قاعدہ مطالبے کا سبب ہے اسکھوں کو انسس صرف بندوقوں کے لیے چاہیے کیوں کہ توپوں اور خچروں کے سلسلے میں تو آئین ہند کی دفعہ ۲۵ کی رو سے کرپان کے علاوہ سکھوں کا بنیادی حق ہے۔ "کرپان رکھنا اور پہننا سکھ مذہبی عقیدے میں شامل سمجھا جائے گا" ہندوستان میں عسکری نسلوں کے نظریئے کے بارے میں لوگ زیادہ بات نہیں کرتے غالباً اس رویئے کے پیچھے بعض حد تک کارفرما ہے کہ بھڑوں کے چھتے کو کیوں چھیڑا جائے مگر اس نظریئے نے سکھ قومی تحریک میں ایک مہلک بدامنی شامل کرنے میں ضرور مدد کی ہے۔ اس عقیدہ کو مذہبی جوش کی وجہ سے مزید تقویت مل جاتی ہے۔ گرو گرنتھ صاحب کی تعلیم بھی گرو کا دھرم یعنی عقیدے کا تحفظ راج اقتدار کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے سکھ پنتھ قدیم زمانے میں اور اب اپنے عقیدے، اپنی روایات کا اپنے کو کہتے ہیں۔ بہرحال اس اصلی مقصد کا رنگ خوبصورتی سکھ شریعت میں اس صدی کی پنجابی دوہائی میں موجود ہے سبز تھا۔

آزاد ہندوستان میں سکھوں کے تجربات کا سب سے دل چسپ نقطہ پنجابی صوبہ کی تحریک کے آخری دس سالوں میں سامنے آیا۔ یہ تحریک جس کا مقصد جان کیسوتی کی مختصر مگر گہری اور تاریخی نظر کی ترجمانی کرنا تھا یہ مسئلہ پیدا کر رہا تھا کہ پنجابی صوبہ کی تحریک میں سکھ فرقہ پرستی کی وجہ سے پیدا ہونے والی دولت کی تقسیم میں سیاسی اور تیسری دنیا سے ساتھ رابطہ کی وجہ سے اس سرزمین کے اس سرزمین کا استعمال کیا اس میں تامل ناڈو کے ہندو تھے جو ہندی کے نفاذ کے خلاف تھے۔ تاملناڈو کی وجہ سے ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہندی کے حامی ہندو تھے جو

ایک معلم خرم پیدا کر دیا

ہو گیا ریاست کی آمدنی کا ۱۲/۱۵ فی صد زراعت کی مد میں تھا اور کام کرنے کے لائق لوگوں کی کل تعداد کے ۵۹/۱ فی صد لوگوں کو اس پیشے سے روزگار مہیا کر رکھا تھا۔ اناج کی پیداوار جو ۱۹۵۰-۵۱ میں ۹۲ لاکھ ٹن میٹرک پیداوار تھی، اب ۲۴۳۲ لاکھ ٹن میٹرک پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ خوش حالی خود اپنے جلو میں بے تحاشہ آبادی تعلیم میں اضافہ، کمیت میں بھی لطف آتا ہے اور کیفیت میں بھی۔ مثلاً ۱۹۶۷-۶۸ء میں، سندی اسکولوں کی تعداد ۱۲۳۸۴ تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۱۲۳۸۴ ہو گئی۔ مڈل اسکول ۸۶۲ سے ۱۴۱۰ ہو گئے۔ ہائی اسکول ۲۰۸ میں ۱۹۰ تھے ۱۹۹۱ میں ان کی تعداد ۲۱۵۸ ہو گئی۔ آرٹس اور سائنس کے کالجوں کی تعداد ۱۹۶۸ء میں ۱۰ تھی ان میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۱ء میں ۱۶۱ ہو گئے۔ اور جہاں تک میڈیکل کالجوں کا تعلق ہے ۱۹۶۸ء میں تو ان کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ۱۹۸۱ میں ۸ میڈیکل کالج قائم ہو چکے تھے۔ کسانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے اپنے بچوں کو شہر کے اچھے سکولوں میں بھیجنا شروع کیا۔ خود پنجاب میں انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے والے بھی اسکولوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ورائٹی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ۵۴ ہزار سے زیادہ گریجوایٹ ان میں سے نصف دیہی علاقوں کے تھے۔ بائیں بازو کے مبصرین قنوطیت ابھی تک اگرچہ اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ آیا سبز انقلاب نے چھوٹے اور معمولی کسانوں کو مفلس کر دیا تھا اور متوسط درجے اور بڑے درجے کے کاشت کاروں کو سرمایہ داروں میں تبدیل کر دیا تھا مگر کسی بھی قنوطیت نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ بحیثیت مجموعی خوش حالی آئی ہے۔ یہ خوش حالی، جس میں انفرادی حوصلوں کی آبیاری کے یقینی متناسب کی اور جدید زرعی سائنس سے حیرت انگیز فائدوں کی۔ پنجاب کا کسان اس لفظ سے بھی واقف تھا کہ اس نے نئی حاصل کردہ خوش حالی کو تجارت، ٹرانسپورٹ اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں لگایا۔

مگر تمام اپنے ساتھ اپنے مسائل بھی لایا۔ سب سے بڑا مسئلہ سب سے قدیم مسئلہ تھا یعنی سکھوں کی آبادی کے تناسب کا مسئلہ۔ ۱۹۷۰ء میں ہندوستان میں ان کی آبادی ۶۱ فی صد کے لگ بھگ تھی گو وہ پنجاب میں اکثریت ہو گئی سکھ میڈیکل شپ کو اس سلسلے میں ۱۹۹۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ اس زوال کو خود دیکھ سکتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ خوش حالی، ترک وطن میں اضافہ کر رہی تھی کیوں کہ سکھوں کے پاس اتنے پیسے تھے اور وہ بیرونی ملکوں میں جا سکتے تھے جہاں ستر روزگار مہیا تھے۔ آزادی کے بعد کی تیس دہائیوں میں موقع سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ سکھ نوجوان ہندوستان سے باہر مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

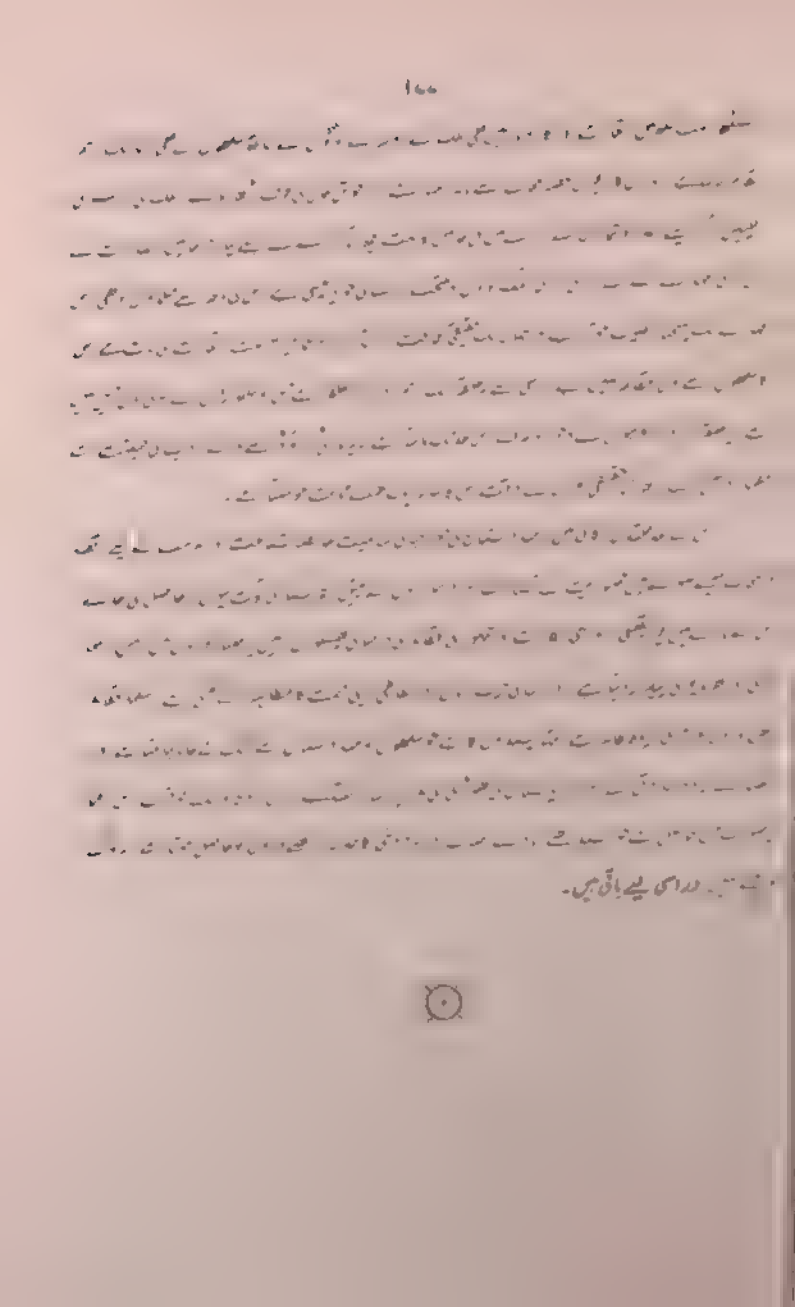

(۱۰)

خالصتان کی تلاش میں

یہ کیمبرج کے پڑھے ہوئے ایک صاحب تھے چودھری رحمت علی جنھوں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۳ء میں ایک مسلمان ملک کی جو پاکستان کہلائے گا، تجویز پیش کی تھی۔ یہ آکسفورڈ کے ایک طالب علم کیمور سنگھ تھے جن کی پیدائش ۱۹۰۹ء میں ہوئی تھی۔ آئی سی ایس کے لیے ان کا انتخاب مواقا اور چھ بعد الزمات کی بنا پر نہ ہونے کی درخواست کی گئی تھی۔ انھوں نے چیلنج دائر کیں، سکھوں کو ان کے مجوزہ آزاد ملک خالصتان ریک لوگوں کا ملک در حالیکہ قوم کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ وزیر اعظم سکندر حیات خاں نے بجٹ کی لیجس لیٹو اسمبلی میں نظریۂ پاکستان پر قرارداد پیش کیے تو چودھری رحمت علی کی سکیم سے متعلق ان کے طنزیہ جملوں پر ایوان کے تمام حصوں سے قہقہوں کی آواز آئی تھی۔ چھٹی اور ساتویں دہائی میں کیمور سنگھ کے خیالات کی تو خیر بھی کچھ اسی طرح ہوئی وہ لوگ جو سیاسی مقابلے کے بجائے عسکری تو جیح دیتے ہیں انھوں نے خالصتان کے معنوں میں لطف کا پہلو ڈھونڈ نکالا۔ سندھی میں خال کا مطلب خوا ہے جس میں کچھ نہ ہو اور استان کے معنی ہوتے ہیں جگہ کے

کالی دل اسٹرا سنگھ نے مئی ۱۹۶۵ اور دسمبر ۱۹۶۶ میں دو تجویزیں منظور کیں جن میں جمہوریہ ہند کے دائرے کے اندر ایک خود مختار حیثیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تجویزیں جمہوریہ ہند کا تذکرہ بڑا ملکا پڑا تھا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں خانہ کے دو حصے ہونے کے ساتھ ایک ڈرامائی کیفیت سے گذر رہا تھا۔ اسلام آباد نے خود بھی کے ساتھ سیاسی شطرنج کی بازی کھیل رہا تھا۔ ہندوستان کی دور رس چالوں کے مقابلے کے لیے پنجاب میں کچھ سیاسی لوگ آگے بڑھا دیا۔ اکالی دل کے ایک سابق سکریٹری ورائک قلیل مدت کے لیے ہونے

کو لفظ سے انکار کر دیا تھا۔

بھوپال، بھونشتور، پٹنہ وغیرہ میں متعدد مختلف پارٹیوں سے بعد میں جلدی متحدہ محاذ کی حکومتیں قائم ہوئیں اس وقت کمیونسٹ پارٹی حلیفوں کو مدد کرنے کے خلاف پارٹیوں کے لیے یہ بہت ہی موقع تھا مگر انھوں نے یہ موقع کھو دیا ۱۹۶۷ء میں دوبارہ برسر اقتدار آنے کا زمانہ کانگریس نے مخالف جماعتوں کی ان متحدہ محاذوں کی مدد کر کے حکومتوں سے دور ہی اور غیر کانگریسی جماعتوں کی ساکھ کو ختم کرنے کا کھیل بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلنے میں صرف کیا۔ صرف ایک جگہ کانگریس اس کھیل میں کامیاب نہ ہو سکی وہ تھی جنوبی صوبہ ستان کی ریاست تامل ناڈو جہاں ڈی ایم کے نے کانگریس کو بالکل پیچھے کر دیا تھا اور خود ایک دیرینہ زعیم قیادت کی طرف سامنے آئی تھی۔

سکھ کانگریس عہد وحی سنگھ اور اس کمیونسٹوں کے درمیان موجود سخت نظریاتی اختلافات کے میدان پنجاب کی اس اتحاد مخالف پارٹیوں کے ماہیں لیکشن سے قبل یک جہتی اور اتحاد و استوار تھا اور ان سب کے اوپر بھی اختلافات کی بیل بڑی ہوئی تھی تھی۔ اکالی سنت فتح سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے یہاں تک کہ کمیونسٹ بھی دو کمیونسٹوں کے نام سے اصل پارٹی سے الگ ہو گئے تھے۔ سنت فتح سنگھ کے گروہ کے اکالیوں نے الیکشن سے قبل صرف کمیونسٹوں سے ساتھ نشستوں کے سلسلے میں مفاہمت کی راہ نکالی تھی۔ اکالیوں نے اگرچہ انتخابات میں سب سے زیادہ یعنی ۳۲ء۳ فی صدی ووٹ حاصل کیے تھے مگر ۱۴۰ نشستوں میں سے صرف ۴۳ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ سکھ اگرچہ اکالی کا ۵۶ فی صدی حصہ تھے مگر دونوں اکالی گروہوں نے بحیثیت مجموعی محض ۲۵ فی صدی ووٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حسب معمول، اعتدال پسند اکالیوں کو اچھا خاصا حصہ ۲۰ء۴ فی صدی ووٹ اور ۲۴ نشستیں ماسٹر تارا سنگھ کے گروپ کو صرف دو نشستیں حاصل کرنے پر اکتفا کرنی پڑی۔ جن سنگھ نے جو بہت متاثر کن مہم چلائی تھی صرف ۹ء۱۵ فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ کمیونسٹوں کا حصہ محض ۹ فی صدی رہ گیا۔ دونوں گروہوں نے مل کر آٹھ نشستیں جیتیں۔ پانچ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اور تین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) نے۔

منشور میں اختلافات کے باوجود مخالف پارٹیوں نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا اور سنت اکالی دل کے گرنام سنگھ کو ایک بیٹھ جو ۱۹۵۱ء میں پنجاب ودھان سبھا کے ڈپٹی سپیکر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے اور یہ بھی حیثیت سے منتخب کیا (۱۹۶۷ء) پھر ۱۹۶۹ء میں وزارت قائم کر لی۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ سکھ ہندوستانی متحدہ محاذ کی سیاست کی نوعیت کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کل ہند جماعت موسم دیوں اور قومی مفادات نے بھی اپنا کام کیا۔ ہندوستان پر بار بار ہونے والے

یہی کیفیت لوگوں کی پنجاب میں تھی۔

اکالیوں کو چنڈی گڑھ سونپ دیا گیا۔

جب ۱۹۶۶ء میں پنجاب تقسیم ہوا تو ہریانہ اور چنڈی گڑھ کے تنازعہ میں سے تنازعہ کرنے کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم نے دورے کیے۔ اس ٹیم میں سوئٹزرلینڈ کے مشہور ماہر تعمیرات لی کوربوزیئے (Le Corbusier) بھی تھے۔ انہوں نے چنڈی گڑھ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس لیے ان کی رائے بہت اہم تھی۔ انہوں نے کہا کہ چنڈی گڑھ کو کسی صورت بھی پنجاب سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔ ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء کو سنت فتح سنگھ نے دھمکی دی کہ اگر چنڈی گڑھ فوراً حوالے نہ کیا گیا تو وہ ۷ دسمبر سے بھوک ہڑتال شروع کر دیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ انہوں نے اپنی اس دھمکی پر عمل کیا۔ لیکن ۱۹۶۹ء میں جنگ آزادی کے ایک سکھ سپاہی دشمن سنگھ بھنڈر کی یاد کے تحفظ کے لیے ۴ دن کا برت رکھا اور ۲۰ اکتوبر کو مر گئے۔ ان کی اس موت نے ان کی ساری مہموں کو شہرت کر دیا۔ حواریہ شہادت کا نام لیا کرتے تھے۔ حواریہ کے مرنے کے بعد ان کی خواہش کو بھانپتے ہوئے پنجاب کی گورنمنٹ نے چنڈی گڑھ کو پنجاب میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۷۰ء کو سنت فتح سنگھ نے اپنا برت توڑ دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ ان کا ساتھ بھی سب نے چھوڑ دیا۔ اکالیوں نے سنت فتح سنگھ کو بھلا دیا۔ انہوں نے چنڈی گڑھ کے علاوہ پنجابی صوبہ کے مطالبہ کو بھی بھلا دیا۔ اس کے بعد سنت فتح سنگھ نے پنجابی صوبہ کے لیے دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مرن برت رکھا۔ اس بار بھی وہ ۱۷ دن بھوکے رہے۔ اس بار بھی ان کی ہڑتال کامیاب نہ ہو سکی۔ اس بار بھی اکالیوں نے سنت فتح سنگھ کا ساتھ نہیں دیا۔ اکالی دل کے لیڈر پرکاش سنگھ بادل نے ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے خلاف ستیہ گرہ کیا تھا۔ اس ستیہ گرہ میں ۴۰ ہزار اکالی گرفتار ہوئے تھے۔ اس ستیہ گرہ کا سہرا بھی اکالیوں کے سر بندھا۔ اس ستیہ گرہ کی وجہ سے اکالی دل کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگر پرکاش سنگھ بادل چاہتے تو اس مقبولیت کی وجہ سے بھی وہ اکالیوں کو سنت فتح سنگھ کے ساتھ کھڑا کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے سنت فتح سنگھ کو بھلا دیا۔ اکالی دل کے لیڈروں نے سنت فتح سنگھ کو نہیں بھلایا۔ ۱۹۷۷ء میں جب جنتا پارٹی کی حکومت بنی تو اکالی دل کے لیڈروں نے سنت فتح سنگھ کو یاد کیا۔ ۱۹۷۷ء میں

کے لئے پیارا کیا رفیق نظر آیا، دونوں نے مل کر مغل بادشاہ کے خلاف ایک قومی بغاوت کو دبا دیا اور گرو تیغ بہادر کو گرفتار کر لیا۔ انھیں موت کی سزا ہوئی۔ اور ۱۱ نومبر ۱۶۷۵ء کو دلی میں اسی جگہ پر جہاں آج گوردوارہ سیس گنج ہے ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ان کے جسد خاکی کو دلی میں اس جگہ مذکر تشق کر دیا گیا جہاں آج پارلیمنٹ ہاؤس کے عقب میں گوردوارہ رکاب گنج بنا ہوا ہے۔ ان کے کٹے ہوئے سر کو نذر تشق کرنے کے لیے ان کے بیٹے و جانشین گرو گوبند آنند پور صاحب لے گئے۔

آنند پور صاحب دوسرے لفظوں میں ایک شہر جس میں سکھوں کے لیے اشارتیں در طلسموں کی بھرمار ہے خصوصاً پنجاب کے طاقتور جٹ کاشتکار سکھوں کے لیے یہی وہ جگہ ہے جہاں گرو گوبند نے خالصوں کا اپنا جداگانہ سلسلہ قائم کیا۔ یہ آنند پور ہی تھا جہاں گرو نے خالصہ کے اپنے نئے فرقہ کی ابتدا کی اور پھر سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا آغاز کیا پہلے تو نو مسلم راجپوت سرداروں کے حملوں سے جن کی قیادت مدعی پر کار اجا کر رہا تھا۔ اس کے بعد دریائے ستلج کے مشرقی کنارے پر مغل فوجوں سے جو سرہند کی زیر قیادت لڑنے دی مغل فوجوں سے جہاں ۱۷۰۴ء میں گرو کو بند سنگھ نے شہر چھوڑنے پر مجبور ہونے سے قبل دو سال تک محاصرہ کیا رہا۔ آنند پور میں پانچ تختوں میں سے ایک تخت بھی ہے جہاں سے مہاراجہ جاری کیے جاتے ہیں۔

۱۹۰۲ء میں اپنے نئے پرچم کا اعلان کرنے کے لیے اکالیوں نے آنند پور صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ بھی طور پر منسلک سیاسی اور مذہبی علامت کے بنانے کو ایک بار پھر مٹایا گیا مگر اس دفعہ بھی بنیاد اسی پرانے خوف پر رکھی گئی تھی کہ ہندو دل کے صدر ہندو سکھوں کو ہندو ہی بنا لیں گے۔ ہمارے ساتھ الحاق کرنا آپ پر دشمنی ہے۔ ہیں جو بعد کو پارلیمنٹ کے ارکان کو بھی بھیجی گیا تھا لکھا تھا۔ اس میں یہ بھی پیشگوئی کی گئی تھی کہ ۱۹۶۱ء میں ہندو مت کی طرح ۱۵۰ سکھ بھی برادست ہندو دائرہ حیات کے وسیع سمندر میں اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔ ایک بھیجی کہ رہے تھے کہ یہ سب سے بڑی قوت کے وہ بھی کبیر سینکڑوں کی طرح مضامین کا شکار ہوں گے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۰۲ء کو دلی میں سکھ لیگ کے سلسلہ نشستوں اور مظاہروں پر مشتمل ایک دلی کمیٹی تشکیل دی جس نے سکھ سیاسی مقاصد کے لیے اعلیٰ سطح کے وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمیٹی نے سکھ رہنماؤں کو وقت پر اقتدار میں آنے کے لیے سرحدی صوبہ کی حکومت کے رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں جس کی صدارت سکھ اور نمائندہ پارلیمنٹ گرمکھ سنگھ نے کی تھی۔ [illegible] سکھ حکومت سکھ گیان سنگھ راولپنڈی پریم سنگھ لاں پور، [illegible]

نے دوسرے دن اسے منظور کر لیا۔

دوسرے مذہبی دفعات میں الحاد و ارتداد کی فوری پریشانی کا پرتو نظر آتا ہے۔ مبلغین، درخشری، صدادر سیروں ہندکے گاؤں اور شہروں میں بھیجے جاتے۔ پیدائش نو کا پیغام (مرت پرچار) موتا حصہ اسکولوں، کالجوں وغیرہ میں پنجاب کی خوش حالی کے ایک نسبتاً کم خوش گوار اثر کو تسلیم کرتے ہوئے شراب نوشی کے مسئلے اور معاشرہ کی پاکیزگی پر پڑنے والے اثرات کے مسئلے کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ مگر مذہبی و سیاسی مقاصد کے لیے سکھ مفکرین تھے جو دلی کے لیے زیادہ پریشان کن تھے۔

ایک مایہ ناز تعارفی عبارت کو نسبتہ مبہم چھوڑ دیا گیا۔ پنتھ کی سیاسی منزل مقصود سکھ گرو کے اعلانات کی تاریخ کے صفحوں اور خالصہ پنتھ کے ایک ایک دل میں محفوظ ہے جس کا اصلی مقصد خالصہ کی فوقیت و برتری سے تہ بسی اکالی دل کی بنیادی دستور ایک سانگارا حوں اور ایک سیاسی ڈھانچے کے ذریعہ خالصہ کے لیے سیاسی برتری حق کا حصول ہے۔ دسویں گرو گوبند سنگھ کا کون سا حکم؟ خالصہ راج کرے گا؟ کیسا راج؟ ایک الگ سکھ ملک جہاں کہ جمہوریت سکھوں کو مستقل حکومت کا موقع فراہم کرے گی تھی اس لیے کیا وہ اب پاکستان کی طرح ایک مذہبی حکومت کو اپنائیں گے جہاں مذہب کے نام پر اقلیت کی حکومت کو جائز سمجھا جاتا ہے؟ سلام خطرے میں تھا لیکن غداروں نے اسے بچانے کے لیے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیا اسی طرح سکھ ازم کو اس وقت تک ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا جب تک کہ اکالیوں کو ان کا سکھستان یا خالصستان نہ مل جائے؟ کیا یہی اصلی مقصد تھا جس کا ذکر تو تھا مگر کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی؟ وہ کون سا بنیادی حق تھا اکالی جس کی بات کر رہے تھے؟ ایک سانگارا حوں اور ایک سیاسی ڈھانچے سے ان کی کیا مراد تھی؟

ریزولیوشن نے مدراحمد کے لگے رہنے کا خاکہ پیش کیا سب سے پہلی بات جو اکالیوں نے کی وہ تھی ان علاقوں کو بچانے والے ان علاقوں کو پنجاب میں شامل کرنا جنھیں جان بوجھ کر پنجاب سے باہر رکھا گیا تھا۔ مثلاً گورداس پور ضلع میں ڈلہوزی، چمبڈی گڑھ، بٹالہ، کالکا اور انبالہ صوبہ دہلی ضلع انبالہ میں نالاگڑھ کا "دیش" کا علاقہ، کرنال ڈویژن کے شاہ آباد اور گھاٹا ملاک، تھانیسر، دہلی تحصیل، ریتا ملاک اور حصار کی سرسا تحصیل اور راجستھان میں گنگا نگر ضلع کی چوتھائی تحصیلوں کو ایک انتظامی اکائی بننے کے لیے پنجاب میں ملا دیا گیا جہاں سکھ اور سکھ ازم دونوں کو خصوصی طور پر محفوظ کیا گیا۔

جہاں خیال تھا کہ "صدر شہریوں کے مفادات موخر کیے جا سکتے ہیں جہاں تک علاقائی مفادات کا تعلق ہے کون ہے جو دعووں پر روک لگا سکے؟ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مسلم لیگ کے خیمہ چلی، موجودہ پاکستان سے، دو گنے علاقے کے پاکستان کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ خالصستان کے خیال کی ہمت افزائی کرنے والے پاکستانی شاید یہ

تھا ۱۹۰۳ کے سکھوں نے سکھوں کی "مذہبی" اصلاحیت کو جدید سطح تک اٹھا دیا مگر یہ دفاع کس سے ؟ اس مطالبے کے لیے کوئی وجہ یہ جواز پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کیا انگریزوں کو یہ تجربہ ہو تھا کہ سکھ فوجوں نے بڑی تعداد میں سکھوں کو قتل کیا تھا جس کی بنا پر ان کو ان ہتھیاروں کی ضرورت تھی یقیناً ایسا نہیں تھا، پھر کہیں تو کہیں اب تو سمیں تھا۔ یہ ۱۔ پھر یہ سکھوں کے لیے خفیہ تیاری تھی جب مذہبی رہنما سکھ قوم سے بغاوت کرنے کے لیے کہیں گے ؟ مگر واقعات کے تسلسل میں دوسرے عناصر نے رخنہ ڈال دیا۔ مثلاً ۱۹۰۵ء اور یہ جنگی۔

یہ جنگی کے بعد کے تین دن کے مدراس اکالی دل کی ایگزیکٹو کمیٹی نے مسجد گنج شہید کی واپسی منانے اور رام کرنے کی کوشش کو مسترد کر دیا اور ایرجنسی و فاشسٹ جمہوریت کی بے حرمتی اور گرو گرنتھ صاحب کی توہین کی طرف ایک بڑا قدم قرار دیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات نسبتاً غیر متوقع ثابت ہوئے۔ ایک لحاظ سے صورت حال ویسی تھی جیسی کہ پانچویں دہائی میں کانگریس اور اکالی اتحاد کے نتیجے میں تھی اس دفعہ فرق یہ تھا کہ اب کانگریس کی مخالف جنتا پارٹی نے لے لی تھی۔ جنتا پارٹی کو اس شمالی ہندوستان میں بے مثال اور شاید دوبارہ نہ ملنے والی زبردست حمایت ملی جہاں کانگریس پہلے نشست بھی جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکی اکالی جنتا اتحاد نے پنجاب میں بھی کانگریس کو ختم کر دیا۔ اکالیوں کو ۱۹۶۷ کے اسمبلی کے انتخابات میں اتنے ووٹ نہ ملے تھے کہ جتنے اب کبھی ہیں ملے تھے۔ یعنی ۳۴ء۳ فی صدی، وہ لوگوں نے ۵۸ نشستیں بھی جیتیں مگر اب بھی اکالی جنتا ۱۹۷۰ء میں ملی ہوئی ۱۹ نشستیں نہ پا سکے۔ دوسری طرف کانگریس ۳۴ء۰۷ فی صدی ووٹ حاصل کر کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی بھی رہی مگر کامیابی اسے صرف سترہ نشستوں پر ہی ہوئی۔ نکسلائٹوں نے نام نہاد کمیونسٹوں نے ۱۰ فی صد ووٹ لیتے ہوئے تقریباً کوئی دس فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ جنتا۔ اکالی اتحاد کی مخلوط حکومت صرف پنجاب ہی میں نہیں دہلی میں بھی برسر اقتدار آئی۔ یہاں گورنمنٹ میں اکالیوں کو دو سیٹیں ملیں اور پنجاب میں پرکاش سنگھ بادل ان کے وزیر علی ہوئے۔ ان لوگوں کو نئی حمایت کی نوعیت کا اندازہ ان کے بیانوں سے ہوتا ہے۔ وہ چاہے چنڈی گڑھ ہو، دہلی، یا کبھی کبھی اکالی دل کے رہنما سکھ ہیں تھا۔

جنتا پارٹی نے لیڈروں میں جن لوگوں کا شمار ہوتا تھا، ان کو کہیے تھے تو مسز اندرا گاندھی کے مقدمے میں ان کے مطالبات سے سلسلے میں بھی سخت تھے۔ ۲ سال کے تین میں سے دو وزیروں نے ۱۹۶۶ء میں پنجابی صوبے کے مطالبے کو رد کرنے کی مخالفت کی تھی۔ وہ جنتا کی کامیابی میں تھے۔ ڈیسائی کے نائب رہنما جگجیون رام تھے اب سٹیل ایڈ مائنز کے وزیر تھے اور مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہو چکے تھے مرارجی کے نئے وزیر خارجہ چودھری چرن سنگھ تھے جو تبدیل مذہب کرانے والی جماعت آریہ سماج کے حامی ایک ہندو دانشور تھے چرن سنگھ سکھوں (سکھوں) کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد

کوئی ت قابل عورت نہیں ہے کہ مرد عورتوں کی طرح برتاؤ کرے۔ عورت اور کمزوری کو مترادف سمجھا جاتا ہے) ان خالصہ نے اس حقیقت کو رد میں نہیں رکھا کہ وہ خالصتان چاہتے ہیں اپریل ۱۹۷۹ میں دل خالصہ نے اسمبلی کے انتخابات میں اکالیوں کا مقابلہ کیا۔ جو اپنے بیدرد امیدوار کھڑے کیے مگر بعض بڑے بڑے سکھوں سے جن کا اثر و رسوخ بہت میں تھا لیکن کے باوجود وہ بری طرح ہارے۔ جولائی ۱۹۷۹ میں جب جنتا میں صنعت حکومت نے جو کہ سکھ کی اس کے بعد نہ ہے کی سیاست نے ایک بڑی کروٹ لی جرنیل سنگھ نے پارلیمنٹ کے ممبروں کا ایک متحدہ اقابل محاذ حکومت بنانے کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا اکالی لیڈروں میں اس مسئلہ پر کہ جنتا کے کس ہاروں کی حمایت کی جائے اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ لونگووال اپنا ایک اکالی دل بنانے کے لیے الگ ہو گئے۔ قومی دھارے سے دور ہونے والے تمام اکالی لیڈروں کی طرح انھوں نے بھی حمایت حاصل کرنے کے لیے غلط طریقہ اپنایا یعنی زیادہ جنگجو یانہ ہو کر، درحسب معمول یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوا لونگووال سکھوں کے لیے آزادی اور خود مختاری کے مطالبے کی حد تک تو نہیں گئے مگر انھوں نے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے سے بہت کم سن، زیادہ واضح، سادہ لوح اور ان کے ہر ایک کے مقابلے میں زیادہ بے رحم اور سنگ دل، جنگجو کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا شروع کیں۔ اس طرح عوام توجہ تمام حمایتوں اور سکھوں کو قتل کرانے کے لیے تقریروں کے ۱۰۰ دن کے فضا میں گونجنے لگا۔ ۱۹۸۰ء کے شروع میں بھنڈرانوالے کے ساتھ، جو ۱۹۷۹ء میں اس سے بہت غصے کے ساتھ اس سیبت اور آفرین خوف ۔ اس کے ساتھ اور بہت سے جنرنیل سنگھ بھنڈراں والا۔

(۱۱)

جرنیل سنگھ بھنڈران والا

کسی پولیس والے کو یا سیکورٹی فورس کے کسی آدمی کو داخل نہیں ہونے دیتے ۔ ان حالتوں میں صرف سکھوں کے مظہر ترین مذہبی پیشوا ہی نہیں رہتے بلکہ ان میں بہت سے معروف مجرموں کے بھی مذہب کی آڑ میں پناہ لے رکھی ہے ہمقیار مذہبی فقہ کل اکال تخت کی اجازت سے یا اس کے بغیر ہی تہ خانوں میں جمع تھے ۔ ہم لوگ دوری کے لیے کی ایک سرپہ موسم سرما کے سورج کی خوشگوار گرمی میں سرکی گرد داس صاحب کے لشکر میں بھنڈران والے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کی روشنی کے کرنے گھیرے سنت عام طور پر ہیں ہوا کرتے تھے ۔ عمارت کے سامنے بہت اجڑے اجڑے لان میں صدر وسطانی فوج کی ایک سیکرٹریٹ گن بھی ہوئی تھی ۔ وہاں پر متعدد ذہنک _____ پڑے ہوئے تھے وہاں تین مہاشے جیسوں کی یہ تصویر بھی تھی جس میں وہ بنے اور پیسے ہوئے سکھوں کو ذبح کر رہے تھے ۔ ان آدمیوں میں ہندو ایک خنجر بلف مسلمان تھا ۔ اس کے نیچے سن ۱۵۲۶ء یہ سن بابر کی فتح کا سنہ ہے ۔ سے ۱۹۴۹ء جب سلطنت ختم ہوئی ۔ لکھا ہوا تھا ۔ دوسرا بدمعاش بندوق لیے ہوئے ایک انگریز تھا ۔ سنہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۴۷ء ۔ قیام الاہی نے ہوئے ایک مند دکھا ۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ۔ ۱۹۴۰ء ___ تھوڑی خالی جگہ دوسری جگہ ۔ کچھ لکھنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی ۔ انوں کی واپسی کے بعد اگر تصویر کی ہوگی تو خالی جگہ کو غالباً پُر کر دیا گیا ہوگا ۔

جس چھت پر بھنڈران والا بیٹھے تھے اس کے چاروں کونوں پر مقدد خاص خاص جگہوں پر مندوقیں لیے ہوئے اور جدید قریب نیم خودکار ہتھیاروں سے لیس محافظ تھے ۔ یہ امتیاز پسند وقتاً فوقتاً گولی ٹیپ سے ہوا کی سڑکوں پر صدر وسطانی پولیس والوں سے گولیوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے ۔ رمیت کی بوریاں محاصرے کی کیفیت میں زیادہ اضافہ کر رہی تھیں ۔ بھنڈران والا خود وہیں رکھے ہوئے ایک ریوالونگ سے لیس تھے ۔ چھت میں داخلے کا راستہ تھا ۔ ان کے چاروں طرف نحیف مرد و عورتیں تھیں جو باتوں آہستہ آہستہ ان سے کچھ تعلیمیں لے رہی تھیں یا پھر ان کو تکتیر ۔ استقلال و احترام کے ملے جلے جذبات سے دیکھے جا رہی تھیں ۔ یہ سب کے سب کسان تھے ان بوڑھوں میں سے کچھ تو وہ تھے جن کے بیٹوں نے جائداد پر قبضے کے لیے ان کے مرنے کا انتظار نہ کر سکنے کی وجہ سے انھیں گھر سے نکال دیا تھا ۔ یہ لوگ اب گردوارے کے ساکن ہو گئے تھے ۔ بھنڈران والا کو ان لوگوں سے بات چیت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی ۔ وہ سیدھے قبضے کے مسئلے لیتے تھے ۔ بولتے ہیں ان کا منہ مستقل ہی کھلا رہتا تھا _____ ان کے پاس سوال کا فوری جواب موجود تھا ۔

دشواری کا فوری حل موجود تھا ۔ یہ مسئلہ جاتے ہی حوصلی کا ہو جانا بھی تھا ۔ لیکن وہ ایک سلسلہ تھا ۔ وہ بھی ان

۱۹۷۹ء میں دل خالصہ نے بھنڈران والا کی مدد سے ایس جی پی سی کے مذہبی انتخابات میں اکالیوں کے خلاف مقابلہ کیا۔ بھائی رکیب سنگھ بابس کے حلقہ انتخاب سے کھڑے ہوئے اور اکالی امیدوار جیوں سنگھ انبالہ سے بردست شکست کھائی۔ کانگریس نے انتخابات میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا مگر پنجاب میں اس کے لیڈر گیانی زیل سنگھ نے اکالیوں کو سبق سکھانے کے لیے مالی امداد کے ذریعے انتہا پسندوں کو بڑھاوا دیا جو خود بھی اکالیوں سے تنگ تھے درحقیقت ابتدائی دنوں میں یہ سرمایہ اکالی دل کی کانگریس ہی جس نے بھنڈران والا کو سرفراز کیا اس عمل کا سب سے بڑا خمیازہ لیڈر درملک دونوں کو اٹھانا پڑا۔

۲ نومبر ۱۹۷۹ء کو جگجیت سنگھ چوہان نے گولڈن ٹمپل میں ایک چھوٹا ٹرانزسیٹر لے کر ۲۰ بج کر ۱۰ منٹ سے سری گرو گرنتھ صاحب کا جاپ شروع کیا گیا۔ یہ روایت بالآخر مذہبی گیتوں کی نشریات کے لیے ایک مستقل ریڈیو سٹیشن کے مطالبے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ایک بار پھر یہ ایک دو دھاری تلوار ثابت ہوا۔ ایک دفعہ ایسا ریڈیو اسٹیشن قائم ہو جائے تو پھر ایسے ریڈیو کے ذریعے سے آزادی و خود مختاری کے مطالبے کو کون روک سکتا تھا یہ بات بیشتر نے گرودوارے کے سنتوں اور صلحتوں کو محض مذہبی شوشے کے لیے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں بھی لیوہ ۔ ۔ ۔

سے بچنے کے لیے بھاگ کر گولڈن ٹمپل میں پناہ لی۔ سنت بھنڈرانوالہ نے اس کے کو نمبر ۲۵ میں قیام پذیر ہوئے اور سکھ مذہبی قائدین پولیس کو گولڈن ٹمپل میں داخلہ کی اجازت نہیں دے سکے کیوں کہ یہ جگہ اتنی مقدس ہے کہ جیسے نظر و ضبط قائم رکھنے والوں کے ناپاک جوتوں سے بے حرمت نہیں کیا جا سکتا۔ اکالیوں کی نظر میں گولڈن ٹمپل کی حرمت پر اس وقت کوئی آنچ نہیں آئی جب قاتل اور مفرور مجرم وہاں پناہ لے رہے تھے۔

۱۹۸۱ء کی آخری چوتھائی میں جب پنجاب کو فیکٹریوں سے خالی کرا لے کے پروگرام پر عمل درآمد ہو رہا تھا تو انتہا پسندوں نے اپنی پُرتشدد توجہ کو عام شہریوں کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت تک وہ پولیس کے محکمے میں بھی داخل ہو چکے تھے اور دہشت پولیس والے مسلمان دہشت گردی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ہتیہ کو جاتی میں دوسرے ان ٹرن ٹارن میں اور ۱۹ نومبر کو سبھا کے مقام پر جو آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ وزارت داخلہ کے ایک نقطہ استفسار کے مطابق "اس سنسنی خیز جرم سے مجرموں کی شدت کے اشارے بھی ملے"۔ یہ پتہ چلا کہ گولیوں پر "RE M UMC 38" کھا ہوا تھا یہ گولہ بارود ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا جہاں 38 ریوالور صرف پولیس یا فوجی افسر استعمال کرتے ہیں تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس گولہ بارود کو ہوائی فوج یا پولیس نے کبھی بھی درآمد نہیں کیا اس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ سارا سامان چوری چھپے لایا گیا ہے چنانچہ ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ماہروں سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ بالآخر نومبر ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں ایک سیان میں مجرموں کی شناخت ہوئی۔ بدقسمتی سے انکشاف یہ ہوا کہ مجرموں کی مدد میں زید کوٹ کے سیوا سنگھ، کرنا سنگھ اور اداجیت سنگھ نیں پولیس کانسٹیبل ملوث تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کرنام سنگھ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھائی ارکیک سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ سنت بھنڈرانوالہ بھی اس والا کا قریبی ساتھی تھا۔

جال پھیل رہا تھا اور جس لیڈر کی حیثیت مستحکم ہوتی جا رہی تھی وہ تھا جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ۔ ہاتھ میں بندوق اور زبان پر غلط کے ساتھ ہی سنت نے مذہبی احتساب کا بھی آغاز کر دیا تھا ان کے پہلے حرف نہ تو ہندو تھے اور نہ حکومت ہند۔ ان کے کارندے تو اعتدال پسند سکھ تھے جو سنت کے ایک کے مقابلے میں ایک نرم گفتار تھے۔

۱۹۸۰ء میں بھنڈرانوالہ نے اس بات کی تبلیغ کی تھی کہ کوئی مشغل نہیں ہے اور اسی لیے اس کا نہ تو کوئی خوف ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شبہ انھوں نے مذہبی رسموں اور رویوں کا ادب و احترام بھی اتنا ہی بے معنی ہے۔ بھنڈرانوالہ کے ایک تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے آپ کو "حقیقی گرو" کہتے تھے ان کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا اور ان کارنامیوں کا فوجی ہندو اور سکھ کے درمیانی سلسلوں میں سب سے

ی ہدایت کرنے کے لیے، دوسروں کو بے جا تنقید کرنے والا مرنگا کہتے ہیں۔ وہ نرنکاریوں کو بھی، سکھ دھرم کے الگ تشخص کو تباہ کرنے اور اس تاج ایک حقیقی حالصہ راج کو روکنے کے لیے "منہ دوسا زش" کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

نرنکاری تحریک کے جاری کیے ہوئے ایک قطاس ابھیوں میں سکھوں کے خلاف اٹھایا جاتا ہے اس تحریک کا اصل زور اور اس کی اصل خصوصیت سکھ ازم کی مخالفت ہے۔ اس کی رہنمائی جس طرح کی حیثیت تانوی ہے۔ اس کا طریقہ سکھ رسوم و رواج کا حقارت آمیز انداز ہے۔ یہ سکھ مذہبی روایات اور سکھ مذہبی علامتوں کی تحقیر و بے عزتی ہے اس کی محرک سیاست ہے۔ اور یہ سیاست ہے اس سیاسی قوت کی جس کا مطمع نظر سکھ اور مستقل طور پر دلیل اور پست ہمت کرنے اور انھیں اپنی تاریخ، اپنی روحانی اقدار اور اپنی روایات سے خود ان کے اندر سے ہی توڑ کر بالآخر انھیں ہندو ازم کے وجود سے اندر ہی اندر ختم کر دینا ہے۔

نرنکاری سکھ مخالف رویے کی تاریخ کے حاشیہ ہمیں ۱۹۷۸ء کی بیساکھی کے دن ہی سکھوں کے لیے ایک محرک دن ہے کیونکہ اسی دن خالصہ کی عید دیکھی گئی تھی۔ انھوں نے امرتسر میں ہونے والی نرنکاریوں کی ایک کانفرنس کے خلاف ہونے والے ایک مظاہرے کی قیادت کی۔ نرنکاری بھی تیار تھے تھے۔ ٹکراؤ ہوا اور جھگڑے میں بھنڈراں والے کے تین حمایتی تین نرنکاری مارے گئے۔ اس واقعہ سے بھنڈراں والا کی حیثیت بدل گئی۔ انھوں نے نرنکاریوں کو ان کی بیت ہی جیسا ہوں کی مدد کو سمجھا کر بھلا کہنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ء دہلی میں نرنکاریوں کے سربراہ بابا گربچن سنگھ مارے گئے۔ سرکاری ذرائع نے قاتل کی شناخت کرنے کا الزام بھنڈراں والا پر لگا کر سیل رپورٹ میں ان کا نام رکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے تمام اخباروں میں شاہ سرخیوں میں بھنڈراں والا کا نام آنے لگا مگر عجیب بات ہے کہ گرپریت بھنڈراں والا نے کسی روک ٹوک کے آزادانہ طور پر گھومتے پھرتے تھے مگر انھیں اس کیس میں کبھی گرفتار نہیں کیا گیا۔ اس وقت کہیے کہ اس وقت مرکز کے وزیر گیانی ذیل سنگھ تھے قاتلوں کی گرفت سے اپنی اس طرح کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر بھنڈراں والا نے اپنے حمایتی بڑھائے انھوں نے گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں جماعتوں سے چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو امرتسر میں انھوں نے سکھوں کے اس مقدس شہر میں تھا کو اور سکھ پنتھ کی خودمختاری کے مطالبے کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم میں شریک ہونے والوں سے گرفتاری دینے کو کہا گیا۔ [illegible] کے اپنے حالصہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے کی یہ مہم اگلے کئی سال

تھے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا کسی بھی قسم کی سکھ تحریک کی قیادت کرنے میں کامیاب ہو۔ تو کیمونسٹ کے پیدا ہونے کا خاتمہ ختم ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ کانگریس اندرا کے لیڈروں کے اندر کھیل کھیلنے کے امکانات کو بھی دیکھ رہے تھے۔ دیکھیے کہ کانگریس حکومت سکھ رہنماؤں کو اسے گفت و شنید کرنے کے لیے کہاں لے جائیں گی۔ اس کا نتیجہ کہاں ہوگا؟ یہ صیاکہ حالات نے ثابت کر دیا کہ ایک افسوس ناک کمیں تھا کہ اچانک ہی ایک ایسی آگ سلگائی جو بہت جلدی ہی قابو سے باہر ہو گئی۔

اکالیوں کی حمایت یا ان کے تعاون کے بغیر نتیجہ پسندوں نے ایک متحارب تنظیم کے ذریعہ اقتدار حاصل کر لی۔ بہرحال اکالیوں نے علیحدگی کے مطالبے جیسے دلفریب نعروں سے متاثر ہونے سے انکار کر دیا۔ ۱۲ اور ۱۵ اگست ۱۹۸۱ کو جنرل سکریٹری اور کامل ان کے ہم خیال سکھ رہنماؤں نے جب حالستان کے مسئلے پر پنجاب میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا تو پارٹی نے ان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اکالیوں کے سامنے تین صورتیں تھیں یعنی یہ کہ انتہا پسندوں کے ساتھ تعلق رکھ کر کام کیا جائے۔ اس خیال کی اکالیت لیس دیس سنگھ صدر گرچرن سنگھ توہرا نے کی۔ دوسری طرف پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے بھنڈرانوالہ اور ان کے حامی موالیوں کو کیسر رد کرتے ہوئے پارٹی کو جنگجو مذہبی افراد سے بذریعہ دور کرنے کی اپنی خاموش کوششوں کو جاری رکھا۔ اکالی دل کے صدر سنت حرچند سنگھ لونگووال نے مسئلے کی نوعیت دیکھ کر اس سیاسی مقصد کو جس میں کہ فیصلہ لیا جاتا تھا پیش نظر رکھتے ہوئے کہ تعین کرتے ہوئے اب معتدل درمیانہ راستہ کی حمایت کی۔ بہرحال تمام لیڈر اس بات پر متفق تھے کہ اگر بالکل تنہا نہیں رہنا ہے تو پارٹی کو کچھ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ لونگووال نے آنند پور صاحب ریزولیوشن میں مذکورہ مطالبات کی تکمیل کے لیے ایک مذہبی جنگ کی بات کر دی۔ یہ مطالبات کیا تھے؟ یہ سارا کوئی وفاقی معاہدہ کیے بغیر چندی گڑھ پنجاب کو دینا چاہیے دوسرا پنجابی بولنے والے علاقے اور ہندو ضلعوں کے کچھ حصے، جو پنجاب سے باہر رہ گئے ہیں انھیں پنجاب کے صوبے میں شامل کیا جانا چاہیے تیسرا آب پاشی کا سارا نظام اور بھاکڑہ ننگل ڈیم کا انتظام پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ چوتھا پنجاب جو کہ دریا کے کنارے بسے ہوئے والی ریاست ہے اس لیے اس کو دریائی محصول سے زیادہ دریائی پانی کی حمایت ہونی چاہیے (یعنی دریائی فیصلہ کی ریاستوں، جیسے ہریانہ اور راجستھان کے لیے) پانچواں مطالبہ مرکزی فنڈ سے زیادہ بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری پنجاب میں لگانا یا صنعتیں لگائی جانی چاہئیں چھٹا حقیقی وفاقیت کے اصول کو مانتے ہوئے مرکز کو بقیہ اختیارات کو چھوڑ کر ریاست کے حوالے کر دینا چاہیے

اضافہ کر دیا۔

اشتعال انگیزی کے لیے یہ کافی تھا : اکالی دل جو ۱۹۲۰ء میں خاص طور پر سکھوں کے مذہب اور ان کے تشخص کے تحفظ کے لیے وجود میں لایا گیا تھا اس کے لیے سکھوں کو "ہندوؤں کے طبقات اور گروہوں" میں شامل کرنا ہمیشہ بے حرمتی سے کم نہیں تھا "ہندی جنگ" کو زیادہ وسعت دی گئی اور بڑے بڑے اکالی لیڈروں نے دستور کی دفعہ ۲۵ کو سر بازار جلا کر تلف کیا اور مارچ ۱۹۸۴ میں جیل گئے مگر تعجب کی بات یہ نہیں تھی کہ اکالی مطالبات کر رہے ہیں، تعجب اس پر ہے کہ ابھی تک دہلی اور اکالیوں کے مذاکرات کامل نہیں نکلا تھا۔ اعتدال پسند اکالی درحقیقت دہلی سے فوقیت یا فتح کے خواہش مند تھے تاکہ وہ میدان ہونے کے اپنے منصب کو بحال کر سکتے اور قیادت اور جسل کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے سکتے۔ دہلی میں جبانی سے محروم حکومت بھی اس بات کو سمجھ لیتی اور کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جاتا جیسا کہ پنڈت نہرو نے ماسٹر تارا سنگھ اور سنت فتح سنگھ کے ساتھ کیا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ حکومت نے اسے رہنما دو جنے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں اکالیوں کے مطالبات کا کوئی نہ کوئی حل نکالا جا سکتا تھا اور اعتدال پسند اکالی لیڈروں کے لیے مسائل کو آسان بنانے کے خواہش مند تھے اور ان مسائل کو حل ہوتے ہیں ہو پائے تھے انھیں سیریس کورٹ یا کسی ثالث کے سپرد کرنے کے لیے اکالی تیار تھے۔ اکالی اپنے مقصد پر سے اترنے کے لیے تیار ہی خواہش مند تھے جتنا کہ کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔ ان کے قیادت جھکنے سے جوں ان کی سیاسی ساکھ میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ یہ خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس وقت مقابلے میں ایک خطرناک عنصر بھی کارفرما ہو جائے گا۔ اس کے اوپر کوئی قابو نہ ہوتے اور نہ ہی ہو گا اور یہ عنصر تھا۔ منتشر و مسلح اور مالی طور پر مطمئن خلقہ گی کے سپاہیوں کا۔ جو نہ تو سکھوں کی اکثریت کی رائے کے پابند تھے اور نہ ہی کسی منطق اور دلیل کے۔ وہ دلیس اپنے محبوب کی حفاظت تھوپنے کے لیے بے چین تھے۔

حکومت کے ان بات کا علم تھا یہ اور وہ ان کے مطالبات کو ماننے کے لیے تیار تھی وہ جانتا تھا سیاسی چلو سے [illegible] اکالی [illegible] ۱۹۸۰ کے اوائل میں [illegible] بڑے واضح طور پر چنڈی گڑھ [illegible] تھا [illegible] کے لیے دس میل [illegible] تھے انھیں [illegible] کے ساتھ [illegible] اکالیوں [illegible] کے مسائل [illegible] ہے [illegible] حکومت [illegible] ہو سکے

اخر ڈالا تھا۔

لیے یہ بات کسی حد تک خود تسکین کی پیش کرنی بن گئی۔ اس لیے مسز گاندھی کے پاس کوئی متبادل پالیسی نہیں تھی علاوہ انتخابوں کے لیے ایک پالیسی یعنی تھیں جس کی توسیع انھوں نے پنجاب اور نہروں، کشمیر اور تقریباً ریاستوں تک کی تھی ان کی تقریروں میں اور ان کے بیٹے راجیو گاندھی کی تقریروں میں سکھوں، خصوصاً کالیوں کی تصویر کشی علیحدگی پسندوں کی طرح کی تھی اور نہروں، کشمیر کے مسلمانوں بہ مع ان کے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو بھی اس سے بھی بڑھ کر جھوٹے الزامات سے لوڑ گیا۔ یہ روایتی کانگریس کے روایتی رویوں سے بڑا اساسی فرق کا اظہار تھا۔ سکھوں یا مسلمانوں کا کوئی معقد اگر کبھی وطن دشمنی کا ارادہ کرتا تھا تو کہ مشورہ طور پر اس سے صرف اظہار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جو مسلمان یا سکھ لیڈر ہندوستان کے دستور کو مانتے اور اس کا احترام کرتے تھے ان کے ساتھ عیاں طور پر حقارت کا سلوک کیا جاتا تھا آج ہمارے سامنے اس کے بالکل برعکس صورت حال تھی۔ یہ طاقتور لوگ جو ہندوستان کے ہر کام کرتے رہے کہ وہ اول درجہ کے دوستانی اور محب ہندوستانی ہیں، اور یہ کہ یہ ہندوستان کا جزو لاینفک ہے۔ تو وہ سب طرف اندرا اور راجیو گاندھی، فاروق عبداللہ کی حب الوطنی کی گواہی کے ارسے میں کبھی علی الاعلان اور کبھی دبے لفظوں میں اظہار بیان کرتے رہے۔ یہ بھی ایک گریز داخلی پالیسی پر عمل درآمد کی ایک تباہ کن مشق تھی جو تمام ہندوستان کے عام مسلمانوں کی حد تک اذیت کا نتیجہ تھی۔

اور اسی طرح جواب میں ہوا جب اس کے کہ انتہا پسندوں کو بے سہارا بنانے کے لیے اکالیوں سے لڑائی لڑی گئی، ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کے طول و عرض میں کھلے عام متعصب ہندو تنظیموں کی سکھوں کو سبق سکھانے کے لیے تنظیمیں بڑھ گئیں جب وہ حکومت میں سکھ کی خوش فہمی ہوئی تباہ کار ہندو توا کی تنظیمیں بدمعاشی میں۔ یوں ہر ایک قیادت میں مسلح دستے ہندوؤں کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اس تباہ کار طاقت نے جو مواقع دیے اور جو قوت و حوصلہ کی وہ فروری ۱۹۸۴ء میں اس وقت سامنے آگئی جب کامیاب خفیہ مذاکرات کے بعد حکومت ایک سرکردگی میٹنگ میں جس میں حزب اختلاف بھی شامل تھا کالیوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ عین میٹنگ کے دن کمیٹی نے سیاسی خطوط کے بجائے نظر اکالی اور کانگریس کا معاہدہ ان کے لیے زہر قاتل کیسا تھا جب موہن داس دستاویز کے سارے امکانات کو اپنی شرارت انگیزی سے ختم کر دیا۔ مذاکرات جاری تھے کہ کانگریس کمیٹی نے ہر ہر میں سکھوں کے خلاف تشدد شروع کر دیا۔ تین دن تک جلا، اس میں بے سہارا سکھوں کی قتل کی گئی۔ انھیں ڈرایا دھمکایا گیا اور بے گھر کیا گیا۔ سکھوں کو جان سے مار گیا، ۱۰ آباد ناکام ہو گئے اور گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے پرسکون ماحول میں بیٹھے ہوئے ممبران دل مصروفیت کے ساتھ مسرور تھے صرف یہی نہیں کہ ممبروں نے معاملت کے مکالمات ختم کر دیے بلکہ اب بھی ان کا

مسرگانہ گی اس سے بات کرنا چاہتی ہیں تو وہ گورڈن ٹیمپل میں آ سکتی ہیں۔ وہ خود دلی نہیں جا سکتا۔ جیسے ایک شخص کی موت کیا ایک حیثیت تھی؟

میں نے پوچھا تھا "وہ کس چیز سے خوف زدہ ہے؟ کوئی بھی چیز مثلاً موت"۔ اس نے جواب دیا تھا "مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ ایک سکھ موت سے نہیں ڈر سکتا اور گرو وہ ڈرتا ہے تو وہ سکھ نہیں ہے"۔ چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر خوشامد اور چاپلوسی کی چمک تھی اور خود ستائی پنے فی البدیہہ فقروں سے انتہائی مسرور نظر آتے تھے۔

عقیدہ، جذبات، عزت، شناخت، خوف، لتو دما، خوش حالی، وردہ دار، موقع پرستی جیسے حرص شرافت، بے بسی، تعصب، دولے، یہ سب عناصر ہیں جو اس وقت اور الجھیں گے اور لطیف وہ تاب موت جب بیچاب ایک، بھرشورش سے گزرتا ہے۔

(۱۲)

پنجاب: ایک جنرل کی موت

سے کہے گی وہ اس حکومت کو اپنی وفاداری بھی دیں اور اپنے مسلح بھی اسی دوران ملک میں ایک خالصتاً ہندو فوج قائم کر دی جائے گا اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے حالات نہ تسلیم کرنے کی اپیل کی جائے گی اسی اپیل میں سرکاری حلقوں کا خیال تھا کہ حقیقت جب معلوم کیا کرے پر تیار رہتے)

اکالی حسب دستور کسی بھی ایسے لیڈر کے پیچھے چلنے کے لیے بے چین تھے جس نے ان کی مذہبی امنگ کو ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہو۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ مہنگا ندھی کی حکومت سے مقاومت کی کوشش میں جعیدہ طور پر مصالحتیں کر رہے تھے مگر کسی اور چیز نے نہیں جرگوں نے کامیابی کے امکانات کو ختم کر دیا وفیں نے ایک دوسرے پر بے ایمانی و تذبذب کے الزامات لگائے۔ بات چیت کے ذریعے کسی معاہدے کی توقع ایسا لگتا تھا کہ ختم ہو گئی ہے۔ اکالیوں نے اعلان کیا کہ وہ ۳ جون کو گرو ارجن کے یوم پیدائش سے عبدستان کے کسی بھی ہفتے میں جابات دیوالی اناج کی برآمد کو روکیں گے اور سکھوں سے کہیں گے کہ وہ کوئی بھی ٹیکس ادا نہ کریں صاف لفظ آرہا تھا کہ ڈرامے کا کوئی انجام سامنے آرہا ہے۔ یکم جون کو شعلہ بھڑک اٹھا جب گولڈن ٹمپل کے علاقے میں بنی ہوئی عمارتوں کی محفوظ چھتوں پر مقیم ہندو ان والا کے مسلح آدمیوں اور باہر تعینات فوج کے درمیان گولیاں چلیں اور اس میں گیارہ آدمی مارے گئے۔ اگلے دن میں دوسرے دن بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جواب کے مختلف شہروں میں بارہ قادیانی دھشت پسندی کا شکار ہوئے۔ ہوشیار پور میں انچاس سالہ سابق ایم ایل اے اوم پرکاش نگا کو اسکوٹر پر سوار تین دھشت پسندوں نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اسی شام اچانک ایک اعلان ہوا کہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ریڈیو پر قوم کے نام ایک خصوصی پیغام نشر کریں گی اور یہ وہ لمحہ تھا جب پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سوچا نہیں جا سکتا یعنی فوج سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گولڈن ٹمپل کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ اس سے پہلے آخری دفعہ سکھوں کے اس مقدس مقام میں فوج اس وقت داخل ہوئی تھی جب احمد شاہ ابدالی نے اپنے مال غنیمت کے کر افغانستان واپس ہونے والے قافلوں پر کیے جانے والے مسلسل حملوں سے تنگ آکر، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ، انتقامی طور پر گولڈن ٹمپل کو اڑا دیں مگر اس واقعے کو دو سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ گولڈن ٹمپل اور اس سے متصل بنی ہوئی عمارتیں سکھوں کے لیے مقدس ترین جگہیں۔ گولڈن ٹمپل جیسے مقامات کو جس کی بنیاد گرو ارجن نے رکھی تھی یا ان تخت جسے گرو ہرگوبند نے تعمیر کیا تھا، پہنچنے والے نقصان سے سکھ قوم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں انتہا پسندوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ... نے لیے وہ فی تھا دوسری طرف ... کی ... دوسروں کی شرافت کا پورا فائدہ اٹھا رہے

ھنڈ ان والا سے ملنے گئے۔ خانہ لی آرف کے فوٹو گرافر سنڈیپ تنڈ جو ھنڈ ں والا سے ملنے والے پہلے کے آخری آدمی تھے ان کا ہنا ہے کہ "وہ اکھنڈ ن والا خود اُنھلوں میں گولیاں جو بھر کر اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ اگر فوج اندر آئی تو وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ اس رات نو بجے سے ساڑھے تین بجے تک چھتیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا یہ وہ مدت تھی جو خالصتان چاہنے والوں کو تتر بتر کرنے کے لیے فوج کو دی گئی تھی

ترسیل کے تمام ذرائع معدوم تھے اور باقی ملک سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا دسمبر کی صبح صادقیوں سے ٹرکوں کے ساتھ یہ رہا گیا کر دوا اپنے ٹائپ رائٹروں کو کچھ آرام دے لیں۔ ان سب کو صاف پنجاب سے باہر بھیج دیا گیا جنرل ویال اور جنرل کے سُندر جی نے اپنے ڈویژنوں اور بریگیڈ کی مدد کرنے کے ساتھ گولڈن ٹیمپل کے صدر دروازے سے تقریباً بیس میٹر کے فاصلے پر اپنی کارروائی کے ہیڈ کوارٹر قائم کر لیے۔ انتہا پسندوں نے اپنے دفاع کے لیے تین دائروں میں یا تین صفوں میں انتظام کیا تھا۔ بیرونی سمت میں انھوں نے سترہ شاہ نشین گھروں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنا تھی۔ دفاع کی دوسری صف گولڈن ٹیمپل کی چار دیواری پر بنی ہوئی عمارتوں پر تھی۔ چھتیس گھنٹے گھر سہرے کے میناروں والی تمام عمارتیں جن پر سے راکٹوں اور بندوقوں کے ذریعے اس مرکزی صحن پر قابو رکھا جا سکے جہاں سے مسلح آدمیوں کے کمانڈو روم پر قبضہ کرنے کے لیے فوج کو بڑھنا تھا۔ تیسری دفاعی لائن کا تعلق ان ذخیرہ اندوزوں اور دفن اکالی تحت کی مقدس عمارت جہاں بڑے لیڈر اور خاص خاص لوگ جمع تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بھنڈ ں والا بھائی امر سنگھ، امر فن حرب شاہ نشین تھے۔ شاہ نشین سنگھ لفٹیننٹ جنرل ویال کی طرح ایک جنگلی ہیرو تھے۔ وہ میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ میں گورنر جنرل کا ایڈیس کیمپ ان ہی کا دماغ تھا مگر بدعنوانیوں کے الزامات کے پیش نظر انھیں فوج سے "چھٹی" دے دی گئی تھی اب وہ ایک رقاصہ کی فلم میں اداکاری کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک صحافی خاتون تولین سنگھ کو اپنی موت سے کچھ قبل بتایا تھا کہ آخری لمحہ جس نے مسز گاندھی کو ہلا کر رکھ دیا وہ تھا ۱۹۸۲ کے ایشیائی کھیلوں میں جاتے ہوئے دلی کے راستے میں ان کی تکفیر کا واقعہ)

فوجوں کی تعیناتی کو چار گھنٹے گزرے تھے کہ پہلی جھڑپ کا آغاز ہو گیا۔ پہلے مقابلے میں پانچ گھنٹوں تک گولیاں چلتی رہیں اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ ۵ بجے کو انتہا پسندوں نے لوہیاں چلانے میں ہیں کی فوج کو اس کچھ کا اندازہ موجود تھا۔ انتہا پسند کتنی اچھی طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس مقامیوں اور گولہ بارود کی کمی نہیں تھی۔ ان کے پاس

گئیں۔ انتظامیہ والوں نے اس کا جواب مینی فیسٹ الکشن سے دیا۔ کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ جٹ ال سے لوگوں کے پاس اس اعلیٰ معیار کے ہتھیار ہوں گے۔ آخر میں فوج ہیلی کاپٹروں والا بلائے بغیر نہ رہ سکی۔ جس علاقے میں بھی فوج کا ہیلی کاپٹر نظر آتا تھا وہاں تک وہاں کے کرے کے لیے پرواز ممنوع ہی قرار دی جاتی تھی جب فوج کا ہیلی کاپٹر میں داخل ہوتا تو وہ تک وہاں کے کرے کے لیے پرواز ممنوع ہی قرار دی جاتی تھی۔ فائرنگ کا سلسلہ دو بہ دو تک جاری رہتا۔ جس کی صبح کو فوج، آخر کار فائرنگ سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں ۱۹۸۴ء تک ۱۹۸۵ء تک ۱۹۸۶ء تک ۱۹۸۷ء تک ۱۹۸۸ء تک ۱۹۸۹ء تک ۱۹۹۰ء تک ۱۹۹۱ء تک ۱۹۹۲ء تک ۱۹۹۳ء تک ۱۹۹۴ء تک ۱۹۹۵ء تک ۱۹۹۶ء تک ۱۹۹۷ء تک ۱۹۹۸ء تک ۱۹۹۹ء تک ۲۰۰۰ء تک ۲۰۰۱ء تک ۲۰۰۲ء تک ۲۰۰۳ء تک

اسکان کے لیے ملک کو تیار کریں۔

نے جو اُن کے گھر میں ان کی حفاظت کرنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے۔ اُس وقت وہ چھوٹا کرتا پہنے ہوئے تھے۔ ایک اسٹین گن اور ایک بیوالو استعمال کرتے ہوئے اس سے پہلے کہ وہ اپنے محافظوں کو ہلاک کرتے، ان کے جسم میں پیوست کر دیں۔

جب سکیورٹی کے ڈپٹی ڈائریکٹر انسپکٹر سنوت سنگھ نے وقوعہ کا جائزہ لیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک باقاعدہ طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا قتل تھا۔ قتل کی مصلوبہ بندی میں یقیناً دونوں ملوث کیے گئے تھے۔ ذرا سی کے محافظ کارڈوں میں دونوں کا کوئی تسلی و تشفی۔ ہاں کی ذاتی حفاظتوں کا مظہر تو ہے ہی ان کی حفاظت کی ذمہ داری کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ مگر جس وقت یہ خوفناک واقعہ پیش آیا اس وقت لوگوں کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ اندرا گاندھی کے قاتلوں نے کیا کوئی سازش کی تھی؟ اس کے بارے میں مختلف رپورٹوں کے مطابق سنوت سنگھ اور بیانت سنگھ کے علاوہ بھی کچھ لوگ ملوث تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بڑی سازش کا حصہ تھے۔ اس سازش کے پیچھے کون تھا؟ اس کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سازش کے پیچھے کچھ سکھ رہنما تھے۔ جو اندرا گاندھی کے اقدامات سے ناراض تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اندرا گاندھی نے سکھوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس لیے وہ ان سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سازش کے پیچھے کچھ بین الاقوامی طاقتیں تھیں۔ جو اندرا گاندھی کی پالیسیوں سے ناراض تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اندرا گاندھی کی پالیسیاں ان کے مفادات کے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ ان کو راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ اس سازش کے پیچھے کون تھا؟ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے

علاوہ پٹنہ، کلکتہ، بھوپال، کان پور، دہرادون اور نہ جانے کتنے دوسرے مقامات پر۔

اس پر مزید یہ کہ وہ خوش حال تھے ان کی دوکانیں تھیں ان کے پاس کاریں تھیں جو چیز سکھوں سے عام دشمنی کی شکل میں شروع ہوئی وہ آخر میں کسی اور چیز میں تبدیل ہو گئی۔ شہری علاقوں کے متمول اور غریب لوگوں پر یہ عیاں ہو گیا کہ حملہ کرنے اور لوٹنے کی ان کو اجازت مل گئی ہے۔

لوٹ کا دائرہ منہ کو لگا تو انھوں نے خون کی تلاش شروع کی ساری دلی پر کیف طاری ہو گیا۔ تقسیم سے جو ہیجانی دھند سکھ اس مصیبت، اس ابتلا کی یقین ذمہ دارانہ تشدد کا نشانہ بنے جو اس ملک میں ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا سکھوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر زندہ آتش کیا گیا۔ بچے مارے گئے۔ دودھ میں لوتی گئیں، عورتوں کی آبرو لوٹی گئی۔ بار بار بتایا گیا ہے کہ مکانات جلا کر راکھ کیے گئے۔ ٹرینیں روکی گئیں۔ اس میں سفر کرنے والے مسافروں کو نیچے اتار لیے گئے اور تالیاں بجاتے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے یہ کل بلوائیوں نے انھیں موت کے گھاٹ اتارا۔

عوام الناس نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پولیس تماشائی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سارے ہلاکت میں ملوث۔ مشرقی دلی میں قتل عام ہوا۔ دلی، میرٹھ، سٹیشن پر ٹرینیں آتی رہیں کہ یہ مت ذہن نہیں، ہیبت ناک کہانیاں لارہی تھیں یہاں ایک بار ۱۹۴۰ء دہرایا جا رہا تھا۔ وہی سلسلہ وہی ترتیب۔ ایک نفسیاتی فرقے کے مذہبی رہنماؤں کی برسہابرس کی اشتعال انگیزی، ابتدا میں خود اپنوں کا لقمان ہو جانا بحران میں بتدریج اضافہ۔ ایک سہمی ہوئی پریشان کن صورت حال، ضبط کی آزمائش اور پھر اچانک ایک دن ایک واقعہ جس نے کرشمہ قوت کا کام کیا۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۰ء میں ایسا وقت آگیا تھا تو وہ یہ تھا اس دفعہ ہندوستان امریکہ سے لے، قسمت نہیں تھا یہاں لوٹنا نتیجہ از قبیل نہیں تھا جو ۱۹۴۰ء دیا۔

خالصتان یا ستان کی طرح آسانی سے حاصل ہونے والا نہیں ہے مگر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہندوستان نے خالصتان کے لیے جان کی دوسری جنگ کا پہلا مورچہ جیت لیا تھا یہ مورچہ سکھ محافظوں کی اندرا گاندھی کے درمیان ہوا تھا ۳۱ اکتوبر کو یہ تنازعہ اگلی نسل کے سپرد کر دیا گیا۔

پنجاب کی تاریخ کا ایک دور ہے اپنے اختتام پر پہنچا مگر اس کی یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات بنیادی طور پر تبدیل ہو چکے تھے اخوت اور بھائی چارہ قصۂ پارینہ ہو چکا تھا سکھ اب۔ لحاظ سے وجود شناختی طور پر ہندوستان میں اب اقلیت ہو چکے تھے۔ ملک کے صدر گیانی ذیل سنگھ ایک سکھ تھے کرپس نگھ اور اس محبت کے لیے جس نے ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں

کشمیر

①

جنت میں جمہوریت

جانے کے۔ اس کی اس تنہائی کو رنجیت سنگھ نے بہرحال، سے نواح کی عظیم سلطنتوں کی دست رس سے باہر نہیں تھا عرب میں دہلی متمال میں وسط ایشیائی حکومتیں، مغرب میں افغان اور مشرق میں تبتی اور چینی۔ کہ پہاڑ اچھے دوست تھے اور وفادار محافظ جب تاتاریوں کے سلسلے کے ایک بہبود ناک شخص زلفی خاں جو دیجو کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، چوتھی صدی کے اوائل میں اپنے گھوڑ سواروں کی معیت میں آیا تو اس نے سری نگر لوٹ کر قتل یا بے حساب مال غنیمت اور بیانچ ہزار غلام (کہانی یہی ہے) اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر یہ سب لوٹ کسی میں درہ دیوسار کے مقام پر ایک برفانی طوفان میں اپنی پیدل فوج کے ساتھ تلف ہو جانے کے لیے

۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مقدر، پیر پنجال کے جنوبی سلسلے کے پار کے صوبے جموں کے ساتھ منسلک ہو گیا جموں کے ڈوگرا راجہ نے پچھتر لاکھ روپیوں میں، کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا یہ کوئی سودا نہیں تھا مدت کے سکھوں کے خلاف انگریزوں کی لڑائی میں ڈوگروں کی خدمات کا صلہ زیادہ تھا۔ جموں و کشمیر کی سلطنت سو برسوں (اکتوبر ۱۹۴۷ء) تک ڈوگروں کے ہاتھوں میں رہی۔ سری نگر کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی اور جموں شہر موسم سرما کا دارالخلافہ بنا۔ ڈوگروں نے بانہال کارٹ روڈ اور جہلم وادی کو ملا کر وادی کے دروازے کھول دیے

جموں میں، جنوب کی طرف ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر بحیثیت مجموعی، سلطنت کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں تین اور ایک کی نسبت سے زیادہ تھے اسی لیے تقسیم کی مطلق کے بعد سے جموں و کشمیر کو پاکستان میں، جو ہندو سامی معاملوں کے پیش نظر، ہندوستان سے ملا تھا، شامل ہونا تھا مگر کشمیر پاکستان میں گیا جناح صاحب نے اپنے بس بھر حق کر لیے۔ پہلے تو انھوں نے ہندو مہاراجہ و مسلمانوں کے عوامی ریلے کو سمجھانے کی کوشش کی، اس میں وہ ناکام رہے۔ تب انھوں نے آزادی سے تین ہفتوں کے اندر حملہ آور اور اس کے بعد پاکستانی فوجیں بھیج کر وہ علاقہ کشمیر کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان لوگوں نے سری نگر پر قبضہ کر لیا تھا مگر انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ ہندوستان کے تصرف میں مغرب میں وادی کا ایک حصہ، سیاچن اور شمال میں، اقصائے چین کی سرحدوں پر ایک وسیع پٹی بنجر علاقہ رہ گیا۔ اس وقت کشمیر مقتدر سے اور جموں سے جس پر ۱۹۴۸ء کے آخری دن جنگ بندی ہوئی۔ وقت بدلنے سے وقت لوٹ جاتا ہے کشمیر کی اس وقت بڑی حد ہندوستان میں رہتی ہے اس کی [illegible] ہندوستان نے [illegible] کشمیر پر مظفر آباد کے [illegible] سے [illegible] ہوئے [illegible]

اپنے بس بو ششش کی۔ مہاراجہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور کے مالک سردار پٹیل بھی کشمیر پاکستان کو دینے پر بوے طور پر راضی تھے۔ اس معاملے میں کسی جذباتی خلط ملط کا کوئی سوال نہیں تھا کشمیر صرف ہی ہیں کرنے ملک کے ساتھ متنہ اور مہاراجہ کا تھا بلکہ اس کی بہت سی معدنی سیدانی اور خدمات وغیرہ اس علاقوں پر تھا جو پاکستان میں جانے والے تھے اس بطانہ منطقی منطق مانے میں مدد یہ رکاوٹ تھی

کشمیر کی پاکستان میں جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دو قومی نظریے پر یہاں نے سے انکار کر دیا۔ ہاں اس وقت بھی جس بیسویں صدی کی نویں معمولی چوتھی دہائی میں کشمیر کی سرحدوں پر تناؤ میں دشمنی معمولی سرحدی جھگڑے میں مسلمان ایک دوسرے کو ذبح کر رہے تھے کشمیر کی وادی میں متعصبانہ قتل و غارت کا واقعہ رونما نہیں ہوا اس کے برعکس کشمیر کی مسلمانوں نے ان پاکستانیوں کے خلاف لڑ کر انھیں جانے دیا جو کشمیر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے "جہاد" میں اپنے فوجیوں اور اپنے لیڈروں کو کشمیر میں بھیج رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء جب پاکستانی دراندازوں کے بھیس بدلے ہوئے تھے اور دل خالی تھے، دہلی میں مسلمانوں کے ایک مجمعے سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی کہ فوج کے ساتھ ہوائی

"میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری یا مولانا آزاد کی پیروی کریں۔ میں آپ سے ضرور کہتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں جو چودہ سو سال قبل تھے جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ مسلمانوں صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے محسن تھے آپ دو قومی نظریے اور اپنے مقصد کی حقانیت کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ ہوئے ہیں تم کشمیر کے لوگوں نے اس کا اثر نہیں لیا اس سے مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی مسلمان کی اکثریت میں رہ رہے ہیں اور آپ اور آپ کے ہزاروں بھائی ناقابل بیان مصائب سے گزر رہے ہیں آپ کو یہ فضیلت ہے امن و شانتی کے ساتھ رہیے اور پروپیگنڈے سے گمراہ نہ ہو جیے۔"

شیخ عبداللہ ایک متنہ کشمیریت کی نمایندہ اور گاندھی کے ساتھ رہے مگر اس وقت کیا ہوگا گر بھی ہیں یہ متنہ ریاست نہ رہے، اس وقت کیا ہوگا جب قوم پرستی اور جمہوریت کو دو مونا متنہ ہو جائے اور جمہوریت بنیاد مذہبی قوتیں یا ان سے لیں۔ اس وقت کیا ہوگا جب ملک کا آئین جو اس کے مختلف کے ہاتھوں میں ہونے لگے انڈین یونین کی اساس ایک خصوصی طاقت پر رکھی گئی تھی جو دفعہ ۳۷۰ اس کی آزادی بھی واضح کرتی ہے اور یہ ہندوستان کی سیکولر شکل سے ایک متنہ کر وفاداری کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسی لیے یونین کی اعلان ہی مذہب کے نقطۂ نظر سے یہ منفرد ہے دوسرے الفاظ میں ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو خطرات جتنے

[illegible]

سے آزاد قرار دے دے۔

[illegible]

[illegible]

(۲)

راجہ اور کسان

مدد و عقیدہ، حسب توقع کشمیر کے وجود میں آنے کے عمل کی بڑی نفیس اور خوب صورت تصویر فراہم کرتا ہے وہ ایک خوب صورت جھیل تھی۔ ستی سر، جس میں ناگا جنھیں سانپ والا کہا جاتا تھا رہتے تھے۔ ان پر ہالادیو کی ہیبت کا سایہ تھا۔ اس ہیبت سے جب ناگا تنگ آ گئے تو مجبور ہو کر اپنے سرپرست نیل ناگا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نیل ناگا نے اپنے باپ برگزیدہ کشیپ (جو دنیا کے خالق برھما کے دماغ سے پیدا ہوئے تھے) کے حضور میں درخواست کی کشیپ ناگاؤں کی نجات کے لیے طویدرا تشریف لے گئے۔ دیوتاؤں کو رحم آیا۔ لارڈ وشنو، بدن پر حاکستر ملے، جٹا باندھے کیلاش کی چوٹی پر اپنے استھان سے نیچے آئے اور اپنے زبردست ترشول کو پہاڑ کے ایک طرف بھینک دیا۔ پہاڑ میں ایک سوراخ بن گیا اور جھیل کا پانی باہر نکلنے لگا یہاں تک کہ زمین سوکھ گئی۔ شیوا کی ساتھی لکشمی نے ایک مینا کا روپ دھارا اور بڑی بلندی سے دیو کے اوپر ایک کنکر گرا دی، دیو اپنے گوشت پوست میں جذب کر رہ گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک پہاڑی کے برابر ہو گیا۔ یہ پہاڑی آج ہری پربت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہری پربت کی چوٹی پر شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے اور ڈھال پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے متبرک مقامات بھرے ہوئے ہیں۔

اس برگزیدہ مستی سے عقیدت اور احسان مندی کے اظہار کے طور پر یہ جگہ کشیپ امر کیشپا مار کہی جاتی تھی یعنی رہے جو مرتے مرتے کشیپ ہو گیا۔ کشیپ نے جنوب کے میدانوں سے اس وادی میں بسنے کے لیے لوگوں کو مدعو کیا سائنس اس ساری کہانی کی وضاحت شاید زیادہ آسانی سے کر سکتی ہے۔ ایک برفیلے عہد کی جھیل، ایک زلزلہ جس سے پہاڑوں میں شگاف پڑا اور ارضیاتی دھماکا ہوا جس نے زمین سے ایک پہاڑی الگ کی، فیروز فیروز ہے حال دیومالا زمدف خوب صورت ہے بلکہ لوگ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ کشمیر ابتدائی ہندوازم

جو عام کشمیریوں کا مقدر رہا ہے۔

کشمیریوں کو مفتوح بنایا اس کے زوال پذیر ہونے کے بعد ہی ہندو عقاید یہ پنپے۔

۱۴ویں صدی عیسوی میں یہ نمودار ہوئی فوجیں تھیں جنھوں نے کشمیر کو اسلام کی سیلی جھلک دکھائی۔ گرمسلم خود صوفی بزرگ بلبل شاہ کے ساتھ آیا جن کا سب سے مقتدر نومسلم پیرو بت شکن سہادیو یا رنچنا تھا جو کہ صدر راجہ سہادیو (۱۳۰۱-۱۳۲۰ء) کے دربار میں پناہ کے لیے آیا تھا۔ ۱۳۲۰ء میں میگی خاں کے اسلاف میں سے ایک زلفی خاں نے راجہ دُلچو کہلاتا تھا، مشہور و موصوف تاتاری انداز میں کشمیر کو لوٹا۔ سہادیو بجائے دفاع کرنے کے بھاگا جب دُلچو کی رفی ہوئی تباہی کا فائدہ اٹھا کر تخت پر قبضہ کر لیا۔ وہ اب مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے صدرالدین نام اختیار کیا تھا اس کے سریر حکومت پر بیٹھنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ——

مسلمان بادشاہوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی ابتدا ۱۳۴۳ء میں شاہ میر سے ہوئی ان لوگوں نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ان میں عظیم ترین زین العابدین۔ آج بھی ان کے نام سے کشمیر میں لاتعداد مقامات ہیں۔ زینا لول، زینا پور، زینا گیر اور زینا دب وغیرہ۔ ۱۵۸۵ء میں کشمیر مغل شہنشاہ اکبر کے قبضے میں آیا۔ کہ کے بیٹے جہانگیر کو اگر نہیں اور نہیں تو کم از کم کشمیر میں آج بھی شالیمار اور چشمہ شاہی نسیم باغ اور ویری ناگ کے خوبصورت باغات تعمیر کرانے کے سلسلے میں یاد کیا جاتا ہے۔ جہانگیر بستر مرگ پر تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ کشمیر میں دفنایا جانا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کو چھوڑ کر مغل عہد کو خوش آمدید کہنے والوں کے پاس بہت تھا یوں کہ ان لوگوں نے جزیہ جیسے تعزیری ٹیکس ترک کر دیئے تھے ۱۶۵۲ء میں۔

شاہ جہاں کی زیر حکومت ازبک نوبیدار ہونے والے افغان آئے اور مقامی کمانڈروں کی یقینی وفاداری کے پیش نظر تمام زمین کو سمیٹ زدہ کر دیا مگر عہد جدید کا آغاز مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی سلطنت میں تبت کے، غام اور رہبیا ولی کے زمین وطبع نیلے کلاب سنگھ کے عروج سے ہوتا ہے۔ اس وقت تک تبت کی نوے فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ صرف کشمیری پنڈت اپنے صبر، مکر و فریب، استغنائی صلاحیت اور اپنے زور کے ساتھ وادی کشمیر میں رہتے تھے۔ سلطنت کے دوسرے حصہ دار جموں کے میدانوں میں تھے جس پر ۱۴ویں صدی میں ان پر مسلسل دغہ نوں کی لائی ہوئی آفت سے پہلے راجپوتوں کا تسلط تھا۔ انھوں نے دوبارہ اپنے آپ کو مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد بحال کیا۔

لفظ راجپوت کے لفظی معنی ہیں "راجہ کا بیٹا"۔ سیتھین اور آریاؤں کے ملے جلے خون والا یہ فرقہ اپنے آپ کو سورج اور چاند کے خاندانی سلسلے کے اجداد کے خلف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ عقیدہ یہ کہتا

کیس اور اس کی حیثیت پر پوری طرح غور ہو گا اس کا یہ رویہ ایک طے شدہ پالیسی کے مطابق تھا۔"

یکم اپریل ۱۸۴۵ء میں اس وقت شروع ہوا تھا جب گلاب سنگھ کے ایجنٹ شیوورت نے لاہور میں انگریزوں کے نمائندے میجر براڈفوٹ کو بتایا تھا کہ وہ پہاڑوں پر سے "چالیس ہزار سپاہی جمع کر کے سکھوں پر حملہ کر سکتا ہے۔" جون ۱۸۴۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گلاب سنگھ کا ایک خط انٹیلیجنس ای۔ ایک ڈگورنر جنرل کے اسسٹنٹ ایجنٹ کو دیا تھا جس میں کہا گیا تھا "وہ جو ملک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی آرزو دل میں رکھتا ہے اسے علی الصباح سفر شروع کر دینا چاہیے۔ اگر وہ دیر کر دیتا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کے دل کی مراد پوری ہو رات آ جاتی ہے۔" گلاب سنگھ نے یقیناً اپنا سفر علی الصباح شروع کیا تھا اور اس کے دل کی مراد ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو اس وقت بر آئی جب انگریزوں نے معاہدہ امرتسر کے تحت تیس لاکھ روپوں کے عوض اسے کشمیر دے دیا۔ پچہتر لاکھ روپوں (جو مالک شاہی کہلاتے تھے) کی حقیر رقم کے بدلے انگریزوں نے جموں اور کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بہر حال اس نے ساتھ گلاب سنگھ کو تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ یہ کبھی نہ بھولے کہ کشمیر اسے کس نے دیا ہے۔ معاہدہ امرتسر کی دفعہ (۱۰) میں کہا گیا تھا "مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی معلمت و برتری کو تسلیم کرتا ہے اس برتری کے اقرار کی ایک علامت کے طور پر وہ ہر سال برطانوی حکومت کی خدمت میں ایک گھوڑا، بارہ کمریاں اچھی زرد رنگ کی اور کشمیر کی شالوں کے تین جوڑے نذر کیا کرے گا۔"

سو سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں جب کانگریسی جی کشمیر گئے تو اس وقت بھی انھوں نے پچہتر لاکھ روپوں کی بستیہ کے اس سودے کی مذمت میں لگائے جانے والے نعرے سُنے تھے کشمیریوں کو اتنا ناراض کسی اور بات نے نہیں کیا اس طرح بیچے جانے اور خریدے جانے کے خیال ہی سے ان کو اپنی تذلیل کا احساس ہوتا تھا اور ڈوگرہ راج کے ۱۰۰ سالہ ظالمانہ نظام کی مخالفت کے اُن جذبات کی زیادہ ذمہ داری اسی خیال پر ہے جنھوں نے تقسیم ملک کے دوران کشمیر کے معاملے میں نئی اُلجھنیں پیدا کیں۔

انگریزوں کے لیے یہ ایک اچھا سودا تھا۔ ۱۰۰ اب کشمیر جیسی ریاست میں اپنا ایک وفادار ایجنٹ رکھتے تھے انھوں نے ۹ نومبر ۱۹۴۶ء میں کشمیر پر قبضہ کرنے میں گلاب سنگھ کی مدد کی۔ ۱۰۰ کروڑ نے ہمیشہ انگریزوں کی توقعات پوری کیں۔ ان سے اپنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑنے اور سلطنت کو جب بھی مدد کی ضرورت پڑی آدمیوں اور روپے سے ۱۸۹۰ء میں ۱۸۴۹ء میں گلاب سنگھ نے حد بندی کے وقت گلگت اور لداخ اور رنبیر سنگھ کی حکومت میں سکھوں نے ساتھ اس معاہدے میں ترمیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ انگریزوں نے اس موقف کو ناپسند کیا

میں شائع ہوا) لکھتے ہیں کہ سری نگر عاشر، دوسری دہائی کے اوائل میں بڑی تشویش ناک تصویر پیش کرتا ہے۔ "یہ سارا اور گندگی کھلی میں طوائفوں کے دواڈے، صبح و شام چوریاں اور بھیک مانگنا اتنا عام کہ ایک ایک وقت میں لوگوں کے ہجوم ٹوٹ پڑتے۔ مرد راستے سستے کہ ایک کھیوا را تقریباً ۸۰ پاؤنڈ) یا ایک من شالی محض چار آنے کی اجرت سے گھر صاف کرائی جا سکتی تھی۔ گھروں میں کام کرنے والی عورتیں تقریباً مفت۔ ناخواندگی ایسی وبا کے چند محبوب ہے کے علاوہ کوئی پڑھ لکھا عنا مشکل۔ بے روزگاری کی وہ شدت کہ دس بارہ افراد پر مشتمل خاندان میں ایک کما نیوالے کا ملنا دشوار۔ شرح پیدائش کم، شرح اموات بیماریوں کی وجہ سے جن کے علاج کا انتظام بھی نہیں، زیادہ۔ تقریباً اور دل بیسی کے سامان عنقا۔ چکٹ کپڑے ایک عام بات تھی، صابن قیمتی اور کمیاب۔ سکھوں کی حالت بھی تقریباً ہی زار تھی، پنڈت بحیثیت ایک طبقے کے نسبتاً بہتر نظر آتے تھے۔ بڑی بڑی جگہیں تو بے فیصد مسلمانوں کے گھر ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھے۔"

کشمیری مسلمانوں کو غم و غصے کے اظہار کے لیے بہر حال راہ ڈھونڈنا تھی۔ یہ لاوا پھٹے کیوں نہیں پھوٹتا، اس کی وجہ اور تے کی انتہائی پس ماندگی تھی اور اس کے ساتھ ہی تشدد سے جبلی کراہت تھی۔ سول سروینٹ وائٹ لارنس نے صدی کے آخری زمانے میں لکھا تھا کہ (مختصراً) "کشمیری کسان کے ساتھ اچھی سے اچھی سلوک ہوتا رہے اور وہ حقیقت جو تنے ہونے کا کام اس سے جبراً کرایا جاتا ہے۔ انھیں اپنی زمین سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ انھیں خطرہ بھی ہر لمحہ گھیرے رہتا ہے کہ کب انھیں حکام بار بار سوخ لوگوں کے یہاں بیگار کرنے کے لیے بلوا لیا جائے۔ (لیکن) گاؤں میں جبراً کام نہیں ہے۔ جائداد اور ملکیت بالکل محفوظ ہے اور میں نے فصلوں کی چوری جیسی بات کبھی نہیں سنی۔ جسمانی اذیت دہی شاذ و نادر ہی ہوتی ہوگی۔ کشمیری جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ اگر کبھی بات بہت بڑھ گئی تو ہاتھا پائی نوچ بیٹھتے ہیں یا پھر منے کو کھسوٹتے ہیں۔ خون دیکھ کر انہیں گھن آتی ہے۔"

دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کی اولین بغاوت ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں ہوئی جب سری نگر سلک فیکٹری کے مزدوروں نے بغاوت کی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے زمین کے ایک پلاٹ پر قبضہ کر لیا۔ جو حکومت کی ملکیت تھا۔ فوج بلا لی گئی اور مہاراجہ نے تحریک کے لیڈروں کے خلاف کارروائی کی۔ سعد الدین شال کو نکال دیا گیا اور ایک دوسرے لیڈر نور شاہ النقشبند کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ مگر یہ سب محض تمہید تھی۔ بھوکے کسان اس زمین پر اپنا حق طلب چاہتے تھے جس پر وہ صدیوں سے غلام رہے تھے۔ عوام اپنی غربت ناک مفلسی سے چھٹکارا چاہتے تھے اور عبادت کا حق چاہتے تھے جس نے ان کو اتنے دنوں سے محکوم رکھا تھا۔ عوام تیار تھے۔ وقت آنے پر کوئی اٹھتا اور ان کی راہنمائی کرتا۔

●●

(۳)

شیرِ کشمیر

تپ رہا تھا۔ وہ حالات کو بدلنے کے لیے عزم مصمم کے ساتھ کمربستہ تھے چنانچہ انھوں نے سیاسی کام شروع کیے شیخ عبداللہ کے ایک تقریباً ہم عصر ڈی این۔ کول نے جو آخری عمر میں شیخ عبداللہ کے وزیراعلیٰ ہونے کے زمانے میں ترقی کر کے پولیس کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے تھے، ان دنوں کو یوں بیان کیا ہے: "میرے بڑے بھائی جن کو انھوں (شیخ عبداللہ) نے سائنس پڑھائی تھی یاد کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتنے طویل القامت اور دبلے پتلے تھے۔ ترکی ٹوپی پہننے والے سائنس کے استاد سائنس کی بہت سی اصطلاحوں کو کشمیری روزمرہ میں بتایا کرتے تھے تاکہ ان کے لیکچر کو سننے میں ذوق نوجوان طالب علم انھیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ طالب علموں میں ان کا رعب بھی تھا اور احترام بھی۔ طالب علموں کا یہ ردعمل صرف اسی وجہ سے نہیں تھا کہ وہ نظم و ضبط کے معاملے میں بڑے سخت تھے بلکہ علمی مرتبے کی وجہ سے بھی تھا۔ ان کا یہ مرتبہ جسمانی بھی تھا اور تعلیمی بھی، اور وہ بھی صرف طالب علموں کے مقابلے میں نہیں بلکہ دوسرے استادوں کے مقابلے میں بھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے انھیں سری نگر کی تنگ گلیوں میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر نعرے لگاتے ہوئے پُرجوش جلوسوں کی قیادت کرتے دیکھا۔ عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے ان کی بہترین اور پُرشکوہ آواز میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہے۔ ان کی عوامی تقریریں عموماً قرآن کریم کی تلاوت یا علامہ اقبال کے شعروں سے شروع ہوا کرتی تھیں۔ کیمونسٹ مسلمان سامعین اور یورپی ورثے کے اثرات کے غلبے کی وجہ سے شیخ عبداللہ نے اپنے وقت کے مسائل کے حل کے لیے مسلم کانفرنس تنظیم دی۔ مگر مستقبل کے رجحانات اسی زمانے سے نظر آنے لگے تھے انھوں نے لہاتھ کو تعلیقی جنگ، جاگیرداری کے خلاف اور سیلف رول اور اصلاحات اراضی کے لیے ہے

پہلی جنوری جولائی ۱۹۳۱ء میں جموں کی مسلمان غصے سے بھڑک اٹھے جب انھوں نے مسجد جموں کے ایک جلسے میں کیمونسٹوں نے قرآن کریم کی بے حرمتی کی ہے۔ مہاراجہ کے خلاف جو غیر غصہ ابھی تک قابو میں تھا وہ اس واقعے سے بے قابو ہو گیا۔ شیخ عبداللہ نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی اور کسانوں، مزدوروں اور دستکاروں کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مطالبات میں سیاسی حقوق اور سماجی اصلاحات مزید شامل کر لیں۔ انھوں نے [illegible] کی ایک تحریک کا آغاز کیا اور رضاکاروں کے پہلے جتھے کی قیادت کی، جو گرفتار ہوا [illegible] پر بہت سے قصے میں قید [illegible] ۱۹۳۱ء ایک قصبے سے [illegible] میں سنٹرل جیل پر حملہ کیا اس موقع پر [illegible] سے [illegible] شیخ عبداللہ نے تحریروں پر [illegible] میں [illegible] نے اس [illegible] [illegible] [illegible]

مذہب کے نام پر خطرناک قسم کا تعلق میاں شروع کر دیا تھا

1939 میں انھوں نے مسلم کانفرنس کو اتنا عدہ طور پر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا۔ اس نئے روپ میں جناب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا تاکہ یہ مسلم لیگ اور نیشنلسٹ تحریک کے نظریاتی فرق کو واضح کر سکے۔ شیخ عبداللہ نے اپنے شمالی پڑوسی سوویت یونین کے تجربات کے سلسلے میں اپنی پسندیدگی کا اعلان بھی شروع کر دیا۔ نیشنل کانفرنس کے جھنڈے کا رنگ دانستہ طور پر لال رکھا گیا۔ جو انگریزوں کے لیے مزید تشویش کا باعث بنا۔ جھنڈے کے درمیان میں ایک ہل کی تصویر تھی اور کسانوں کو جو نعرہ دیا گیا تھا وہ تھا "الیاں بالی ملّا کاری، دشمناں چلّا کاری"۔ کشمیری زبان کے اس نعرے کا مطلب ہے کہ جب ہل چلتا ہے، دشمن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ساتھ شیخ عبداللہ قوم پرست مسلمانوں کے عظیم نمائندے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر مسلم لیگ کا خاص ہدف تھا۔ شیخ عبداللہ نے انتہائی فعال طریقے پر لیگ کی فلاسفی اور اس کی سیاست کو یہ کہتے ہوئے للکارا کہ دو قومی نظریہ ایک زہر ہے جو جب پھیلے گا تباہ کر دے گا اگر ہم اس منظر کو ذہن میں رکھیں جس میں شیخ عبداللہ نے اتحاد و یک جہتی کی وکالت کی تو ان کے کارنامے اور بھی زیادہ قابل قدر ہو جاتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کشمیریوں کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ تھی ان کی تعداد۔ سیاسی اور اقتصادی دونوں اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ مسلمان اپنے غم و غصے اور ہندوؤں سے انتقام کی خواہش رکھنے میں پورے طور پر حق بجانب تھے۔ 1947 میں کشمیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد و تباہی کا برقرار رہنا جو بڑی حد تک شیخ عبداللہ کی قیادت کی وجہ سے تھا، اسے ایک قابل ذکر زندگی کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھا جانا چاہیے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں جیسا شخص بھی کشمیر سے متصل شمال مغربی سرحدی صوبے کے پٹھانوں کو فرقہ پرستی کے جال سے بچانے میں ناکام رہا تھا، لیگ نے اپنے بس بچہ کو کوشش کی۔ جناح صاحب نے شیخ عبداللہ کو پاکستان میں اقتدار اور وقار دونوں کی پیشکش کی اور جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو مسلم لیگ نے اپنے قدیم حلیفوں یعنی ملّا اور جماعت اسلامی کی مدد سے وادی میں کی کوشش کی۔ جماعت اسلامی کے کشمیری یونٹ نے تمام تر بر صغیر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو نہیں مانا ہے۔ اس کی وفاداریاں پاکستان کی جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ان سے متنبہ کیا کہ سالوں کے لیے ان کا پیغام سیدھا سادہ تھا: "اچھے ہندو اور اچھے مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ برے ہندو اور برے مسلمان نہ صرف یہ کہ جھگڑے پیدا کرتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے خلاف متحد بھی ہو جاتے ہیں جو کہ ان کی بات کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۲۲ء میں شیخ صاحب نے شیخ سے مستعفی ہونے کے بعد جائداد کا انتظام کیا شیخ صاحب نے جائداد کی
[illegible] میں [illegible] سے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کی
[illegible] کی

میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں کانفرنس کے مقاصد اور اس کا مطمح نظر بالکل واضح تھا "کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ایک ذمہ دار حکومت کا قیام نہیں ہے بلکہ وہ ڈوگرہ خاندان کے تاناشاہی اقتدار سے اپنی مکمل نجات اور آزادی کا حق بھی طلب کرتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اسی خاندان کی حکومت کے خلاف تھی اور گاندھی اور نہرو کی مکمل حمایت کے ساتھ تھی۔ کانگریس نے جو صرف ایک قریبی حد تک اپنے وجود کو برطانوی ہند تک محدود رکھا۔ اسی ریاستوں اور جاگیروں میں کانگریس کی ہم پلہ جماعت آل انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس تھی اور مختلف ریاستوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں اس کے تحت چلتی تھیں ۱۹۳۹ میں نہرو اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اور شیخ عبداللہ نائب صدر۔ اسی سال مئی کے مہینے میں شیخ عبداللہ نے ڈوگروں کے خلاف اپنے عوامی احتجاج کی لے کو خاصا بلند کر دیا تھا۔ ۱۵ مئی کو سری نگر میں، انھوں نے ایک تقریر کی جس نے جاگیردارانہ حکومت کو ہلا دیا۔ تقریر کے کچھ اقتباسات سے اس کے تاثر اور لطف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

"یہ مطالبہ کہ راجہ کے خاندان کو ریاست چھوڑ دینا چاہیے دراصل "ہندوستان چھوڑ دو" کی اس یا لیسی ہی کی توسیع ہے (جسے انگریزوں کے خلاف ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے اپنایا تھا۔ ہندوستانی راجے ایک معاہدے کی رو سے انگریزوں کے اتحادی تھے اور ان کی ریاستوں کی حیثیت "مطلق زیر حمایت" کی تھی، جب تحریک آزادی، انگریزی حکومت کی مکمل واپسی کا مطالبہ کرتی ہے، تو منطقی ہی کہتی ہے کہ برطانوی استعمار کے چھوڑوں کو بھی جانا چاہیے اور اقتدار اعلیٰ کو اس کے اصلی حق دار یعنی عوام کے حوالے ہونا چاہیے .. دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے ہندوستان کی آزادی کے مقصد سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ ایک انقلاب نے زار روس کی حکومت کا تختہ پلٹا اور انقلاب فرانس نے فرانس کے حکمراں طبقے کا خاتمہ کر دیا۔ امرت سر عہد نامے کے پرخچے اڑانے کا وقت آگیا ہے اور کشمیر چھوڑنے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اقتدار اعلیٰ مہاراجہ ہری سنگھ کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ "کشمیر چھوڑ دو" بغاوت یا سرکشی کا سوال نہیں ہے۔ یہ حق کا سوال ہے۔"

پنڈت نہرو اگرچہ کرپس مشن سے متعلق کاموں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے مگر کشمیر کے واقعات پر اپنے جوش و خروش کو دبا نہ سکے۔ انھوں نے اپنے نائب صدر کو وہاں کے حالات بتانے کے لیے دہلی بلا لیا۔ شیخ عبداللہ کو جوں ہی پیغام ملا انھوں نے فوراً ہی سری نگر سے راولپنڈی کے لیے رخت سفر باندھا جہاں سے انھیں دہلی کے لیے ہوائی جہاز مل سکتا تھا ابھی وہ سری نگر سے کوئی سو میل دور گھاری کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ ہری سنگھ حکومت نے انھیں وطن دشمنی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ تحریک میں ان کی ۱۵ مئی والی تقریر پیش کی گئی۔ وہ کوائے

فاروق نے یہ دل چسپ کرداروں کو جلاوطنی سے واپس کشمیر میں داخل کرنے کے بجائے جیلوں میں مقید کر دیا۔ خوف و دہشت پھیلا رکھا تھا اس پر یہ کہ سخت غصہ" انھوں نے سری نگر کو "شہر خموشاں" کہا اور کہا وہاں کے حالات جنرل ڈائر کے پنجاب کی یاد دلاتے ہیں جہاں لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل چلایا جاتا تھا یا شخصوں کی ٹوپی پر ڈانٹا جاتا تھا۔ "حالات بدلے" شیخ عبداللہ کی نوید کے ان کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے "ہر شخص کشمیر کو جانتا ہے وہاں کا شیخ عبداللہ کی شخصیت کو بھی جانتا ہے۔ وہاں ہر کشمیر میں، دور دراز دیہات تک کے لوگوں کے وہ چہیتے ہیں۔ نہ جانے کتنے عوامی گیت اور کتنی کہانیاں ان کی شخصیت کی گرد بن گئی ہیں۔ ریاستوں کی تحریک آزادی میں وہ میرے ایسے قابل قدر ساتھی رہے ہیں، آج بھی ہیں جن سے تمام مسائل میں مشورہ لیا جاتا ہے۔ کیا کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان کو چھوڑیں گے؟" مسٹر جنسن کی پبلسٹی کمیٹی کے سکریٹری سید میر نے صحافیوں کو بتایا کہ "کشمیر کی تمام پولیس نے اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں پر لاٹھی چلانے سے انکار کر دیا۔ اس حکم عدولی کے نتیجے میں، کشمیری پولیس والوں میں سے چالیس کو ڈوگرا فوجوں نے حراست میں لے لیا اور کشمیری پولیس کو برخاست کر دیا گیا۔ ایک نئی ترشی ہوئی پولیس میں دو دو سال کی تعلیم ختم ہو چکی ہے۔ ان میں سے آج بھی دو دو کی تعلیم کا نئے کشمیر کی تعمیر میں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شیخ عبداللہ کے دعائے خیر سے بدلت خود کو کبھوں کی ایک جماعت کی سربراہی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا جب تک کہ شیخ عبداللہ کو رہا نہ کیا جائے۔

ان دنوں سے ان کی صحت بہت خراب رہتی ہے۔ کشمیر جانے کی وہ ہر کوشش کرتے رہے مگر وہ ہر دفعہ روک نہیں سکے کامیاب نہیں ہو سکے۔ ۱۹۴۶ء میں کابینہ مشن کے مذاکرات میں ان کی صدارت سے گفتگو اس سب کے باوجود کشمیر گئے۔ ۱۵ جون کو سری نگر سے واپس ہونے سے پہلے انھوں نے ایک تار بھیجا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ کشمیر آ رہے ہیں۔ سری نگر سے ہدایت سردار ہری کشن کول کو جواب آیا انھیں ریاست میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹ جون کو سہ پہر میں ایک بجے وہ آصف علی، دیوان چمن لال، ملک ن اور چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کار کے ذریعے لولاب پہنچے۔ یہ سری نگر سے تقریباً ایک سو چالیس میل دور سری نگر اور راولپنڈی روڈ پر واقع ہے۔ وہ یہ کے مقام کے حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک سب انسپکٹر نے ایک سرکاری حکم نامہ پیش کیا جس میں ان کو ریاست میں داخل ہونے سے روکنے کا حکم تھا۔ ان کے ساتھیوں نے اسے جاری رکھا نہ دینے پر اصرار کیا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے پہلے ہی ریاست میں ہر طرح کی حکومت کے کسی حکم کو نہیں مانا ہے، اور ہری سنگھ اور ان کے مظالم و جبر و

شیخ عبداللہ کا مقدمہ ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو شروع ہوا۔ پنڈت نہرو مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے ۲۵ جولائی کو آئے۔ یہ دن تک ٹھہرے رہے اور چار ہی دفعہ اپنے دوست سے ملے۔ شیخ عبداللہ کے صفائی کے وکیل ستیاں سروپ دھون اور آصف علی تھے اور استغاثہ کی طرف سے لاہور کے جے گوپال سپیشل مقرر ہوئے تھے۔ مسئلے کو خود شیخ عبداللہ نے اس وقت حل کر دیا جب انھوں نے اپنے آپ کو مجرم قرار دیتے ہوئے تین گھنٹے کے الفاظ پر مشتمل ایک بیان دیا۔ اس بیان میں انھوں نے کہا "میں آج بھی ان تمام باتوں کو صحیح سمجھتا ہوں جو میں نے قوم اور کشمیر کے عوام کے حقوق سے متعلق کہی یا لکھی ہیں۔ کشمکش اور بغاوت کا یہ مقدمہ میرے خلاف نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے خلاف ہے۔ حقیقت میں یہ مقدمہ مقبوضہ اور کشمیر کی ساری آبادی کا مقدمہ ہے۔ ۲۴ گھنٹے کے گفتگو کے بعد شیخ صاحب نے اپنے بیان کے آخر میں کہا کہ میں اس کی تیاری میں دو بڑھ ہفتے صرف کر چکا ہوں۔

بیان سے شیخ عبداللہ نے جو کچھ کہنا چاہا تھا وہ کہہ چکے تھے۔ ساتھیوں کو ایک خط لکھوایا جو ان کے اندر فکر کا مقصد پیدا کرنے کے لیے بہت اہم تھا۔ "ہمارے ساتھیوں پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم نے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہونے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا اس میں ہمیں بہت سی مشکلات پیش آئیں اور ہمیں اب بھی مشکلوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی تھی کہ ہمارے راستے میں کانٹے نہیں ہوں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہوں گی۔ ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ہم نے ان کا مقابلہ کیا اور اب بھی ہم ان کا مقابلہ کر رہے ہیں

گاندھی جی کو پاکستان کے جنم سے محض دو ہفتے قبل، مسلم اکثریت والے کشمیر نے ناقابل یقین طور پر خوش آمدید کہا تھا ان کا استقبال کیا تھا۔

شیخ عبداللہ کو بالآخر ایک نسبتاً آرام دہ مقام پر رکھا گیا اور ان کے دوست جواہر لال نہرو کی زیر قیادت آزاد ہندوستان کی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے بالآخر انھیں ستمبر ۱۹۴۷ میں چھوڑ دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ کشمیر سرمستی و سرخوشی میں ڈوب گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی پہلی عام تقریر کے موقع پر مجمع میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شریک ہوئے تھے۔ اس پہاڑی ریاست کی مختصر آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد غیر معمولی تھی۔ ۴ اکتوبر کو حضوری باغ کے مقام پر شیخ عبداللہ نے عوام کو ایک بار پھر وہ سب کچھ بتایا جس پر پیشہ سے ان کا ایمان رہا تھا۔ ان کی سولہ مہینوں کی مراسلت کے زمانے میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آچکا تھا کشمیر کے سامنے انتخاب کا مسئلہ آگیا تھا۔ ہری سنگھ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس ملک سے الحاق کریں گے شیخ نے یہ بات صاف کر دی کہ ہری سنگھ کو کشمیریوں کی نمائندگی یا ترجمانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے فیصلے کا حق عوام کو دیا جانا چاہیے نہ کہ کسی جاگیردار کے کہ یہ وہی اصول تھا جس پر ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے جوناگڑھ اور حیدرآباد کے مسلمان راجاؤں کو چیلنج کیا تھا، جو اپنی ریاستوں میں بہت بڑی ہندو اکثریت کے باوجود خود مختاری یا ہی ملک پاکستان سے الحاق کے اعلان کی دھمکی دے رہے تھے شیخ عبداللہ نے کہا کہ کشمیر میں بھی اسی اصول کا نفاذ ہونا چاہیے۔

اس وقت یہ سوال سامنے آیا کہ عوام کے حق میں کیا بہتر ہوگا، ایک مسلمان ملک پاکستان سے مل جانا چاہیے یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے۔ ایک سیکولر ملک ہے۔ اس سوال کا جواب شیخ عبداللہ نے اپنی تقریر میں دیا۔

"پنڈت جواہر لال نہرو میرے دوست ہیں اور گاندھی جی کے لیے میرے دل میں انتہائی احترام ہے ہم دو قومی نظریئے پر جس نے اتنا زہر پھیلایا ہے یقین نہیں رکھیں گے اس موقع پر کشمیر نے روشنی دکھائی جب سارے ہندوستان میں بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔ کشمیر نے ہندو مسلم اتحاد کی اپنی آواز بلند کی۔ میں ہندوستان کی اقلیتوں کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک ان کی زندگیاں اور ان کی عزت بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے" خود اس وقت جس وقت شیخ عبداللہ یہ تقریر کر رہے تھے ہندوستان اور پاکستان میں کیا ہو رہا تھا اس مہینے اور اس دن ہندو مسلم فسادات انتہائی جنون تک اور بھیانک شکل میں ہوئے تھے دردناک کشمیر میں جشن کا عالم تھا یہ نعرے "ہندو مسلم اتحاد کی جے" سے مسلم لیگ کی سرکوبی کا اعلان کر رہی تھی۔

نکل جوا ایک بھی طرف ہدایت آسانی کے ساتھ کشمیر کو پاکستان میں ہی سکتا تھا اور دوسری طرف بھی کشمیر کو ہندوستان میں جانے کی خوشی اجازت دے دیتے مگر اس سے جناح اور جواہر لال کو ہندوستان میں رکھ جو اس موقع

۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ جو مولانا سے ملنے کے لیے دلی آرہے تھے جب وہ راستے میں تھے۔ ہری سنگھ کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اب شیخ صاحب کشمیر کے غیر متنازعہ ہیرو تھے اور ہندوستان کے۔ یہ عظیم نہ دے انھیں آرام کرنے کی غرض سے دلی آنے کی دعوت دی تھی ظاہر ہے کہ دلی میں صرف ایک جگہ تھی جہاں یہ ٹھہر سکتا تھا اور وہ جگہ تھی ۱۶ پارک پیلیس، ہندوستان کے سب سے عظیم الشان محل کا شیخ کے قیام کے سلسلے میں نہرو کو جو مسئلہ پریشان کیے ہوئے تھا وہ شیخ صاحب سے اچھے طریقے سے ملنے کا شوق دکھانے کے معاملے میں شیخ صاحب کی خوش مذاقی اور خوش خوراکی دونوں بہت مشہور ہیں۔ اس زمانے میں آزاد سے آزاد قوم کے سلسلے کے انتظامات لوگوں نے اپنے ذہن میں لیے وقت پھر تک ان گنت طوفانوں کے گزرنے کے بعد یہ عمل پھر دہرایا جائے گا اور شیخ صاحب ایک طویل مدت کی حراست سے رہا ہونے کے بعد جلد ہی عوام تو یہ کریں گے کہ جلدی سے کشمیر کا ایک چکر لگائیں گے، پھر اپنے "ہم زیرِ ہن دوست" کے گھر ٹھہرنے کے لیے دلی آجائیں گے۔ یہ سب کچھ ۱۹۶۴ء میں ہوگا۔ نہ شیخ صاحب ہری سنگھ کے حکم سے ہی ہوئی نہیں بلکہ نہرو حکومت کی دی ہوئی حراست سے رہا ہو رہے ہوں گے۔ مگر یہ دوستی سیاست کے بے رحم اثرات سے غیر متاثر ایک غیر معمولی دوستی تھی جو صرف اس نسل میں ممکن تھی جسے کبھی ذلت کرنے اور کبھی نہ خوف کھانے کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ یادگاری جلد میں بی کے نہرو اس رشتے کی کوالٹی کو یاد کرتے ہیں "۱۹۴۸ء میں ایک بار جواہر لال، نہرو اور شیخ عبداللہ نے میری رہائش گاہ (۱، صفدر جنگ روڈ) پر میرے اور میری بیوی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس وقت تک ہم نے کھانے کے لباس اور طور طریقوں کو جمہوریت کے منافی سمجھنا شروع نہیں کیا تھا۔ حفاظتی اقدامات نے بھی اس زمانے میں حکمرانوں کی زندگیوں کو آج کل کی طرح ناممکن نہیں بنا دیا تھا۔ کھانے کے بعد کناٹ پیلیس کے ریگل سنیما میں ہم چاروں سادہ سے کے ناول پر مبنی ایک فلم "ای ریزرس ایچ" دیکھنے گئے۔ ہم لوگ بالکنی میں بالکل دوسرے عام لوگوں کی طرح بیٹھے۔ میرے خیال سے یہ آخری موقع تھا جب جواہر لال نہرو نے کسی طور پر ایک عوامی جگہ پر فلم دیکھی۔

طوفان آرہے تھے اب نہرو اور شیخ عبداللہ کی دوستی کی ایک ایسے بحران میں کڑی آزمائش ہونی تھی جس نے ترجیحات کے نوٹ بدل دیے اور نوجوان ملکوں کو نہ صرف بدل کر رکھ دیا بلکہ وہ قیمت طلب کی جو آج بھی وہ چکا رہی ہیں جن کا اس گناہ سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔

(۴)

"فردوسِ گم شدہ" - بازیافت کی سعیِ ناکام

۲۲ [illegible] ۱۹۴۷ء کا [illegible] پاکستان کے [illegible] ہندوستان میں [illegible] بڑے [illegible] جیسے [illegible] ان سے [illegible] رضا [illegible] ایک [illegible] ان [illegible] ان [illegible] لوگ [illegible] کہتے [illegible] کہ [illegible] اس [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] ہے

کے، جو کہ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ پاکستان سے الحاق کیا جائے، مہاراجہ نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ تک کسی کاغذ پر دستخط نہیں کیے تھے اس کی جگہ پر کشمیر نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ توقف کا ایک معاہدہ کر لیا ہندوستان مذہبی فسادات کے علاوہ حیدر آباد، جونا گڑھ اور ریاستوں کے مسائل کی وجہ سے پریشان تھا اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے کشمیر پر قبضہ کرنے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

۲۴ اگست کو جناح صاحب نے اپنے ملٹری سکریٹری کو حکم دیا کہ وہ وسط ستمبر میں کشمیر میں دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے انتظامات کر دے مگر یہ سن کر انھیں بہت زبردست دھکا لگا کہ ہری سنگھ انھیں وادی میں قدم بھی نہیں رکھنے دیں گے۔ معاصرین کا خیال ہے کہ اس تحقیر نے جناح صاحب میں کشمیر میں چھٹیاں منانے کا عزم اور مکم کر دیا۔ ستمبر کے وسط تک کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے صوبہ سرحد کے قبائلیوں کو کشمیر بھیجنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پاکستان کے لیے یہ حمل اس وار کی حیثیت رکھتا تھا جس سے بیک وقت تین شکار ہوتے تھے۔ اوّل یہ کہ اس کارروائی سے پٹھانوں کی توجہ کو کابل کی طرف سے ہٹایا جا سکتا تھا (جب ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کو اقوام متحدہ میں داخل کیا گیا تھا، افغانستان واحد ملک تھا جس نے اس کی مخالفت کی تھی) دوم یہ کارروائی اس پاکستانی فوج کا استعمال کیے بغیر ہی کشمیر کو پاکستان میں شامل کرا دے گی جس کی سرزمین کشمیر میں موجودگی آئینی طور پر کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی اور سوم یہ کہ یہ کارروائی قبائلیوں کو ان کے پسندیدہ شغل یعنی لوٹ مار کا بھی موقع فراہم کر دے گی جو بہت دنوں سے ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ قبائلی لیڈروں کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ لڑائی صرف یہی نہیں کہ ایک ہندو راجہ کے چنگل سے اپنے مسلمان بھائیوں کو آزاد کرانے کے لیے جہاد ہو گی بلکہ غنیمت حاصل کرنے کے بھی بے پناہ مواقع فراہم کرے گی۔ یہ قبائلی ۲۲-۲۳ اکتوبر کی رات میں جہلم کے پار کشمیر میں داخل ہوئے۔ سرحدی موچے پر نہایت آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ سری نگر تقریباً ایک سو چالیس میل دور تھا جہاں پہنچنے کے لیے موٹر کے لائق ایک سڑک تھی جموں و کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی پر ٹیکنیکی طور پر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر قبضہ ہو سکتا تھا مگر جب لٹیروں کے سربراہوں نے سیدھے سری نگر جانے کا فیصلہ کیا تو اس انکشاف سے انھیں ایک سخت بڑھکا لگا کہ ان کے پیروؤں کے ساتھ ہی نہیں۔ یہاں رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے تھے وہ لوگ قریب کے قصبہ بارہ مولہ میں لوٹ مار کے لیے چلے گئے۔ اس میں ۵۰ دن لگ گئے۔ مقدمہ کیا ہے؟ اس حرص و ہوس کی داستان ہے۔ سری نگر پر دھاوے میں چند ابتدائی دنوں کے لیے فصل پڑ گیا اور اس طرح کشمیر کی تاریخ میں ایک بار پھر سے لکھی گئی۔

نہیں تھی۔ نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال کے مطابق یہ وہ نکتہ تھا جس نے استصواب رائے عامہ تو کیا تھا اس وقت نہ تو الحاق کے عارضی ہونے کا پہلو اور نہ ہی توثیق کا خیال کوئی مسئلہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے لیے یہ تین معاملات کی وجہ سے کسی قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ یہ صاحب صاحب نہیں پنڈت نہرو تھے جنھوں نے یہ بات کہی تھی۔ علی الاعلان کہی تھی کہ الحاق کے فیصلے میں یہ نکتہ مشروط طور پر کبھی گئی تھی۔

۲۲ جولائی آل انڈیا ریڈیو پر ایک نشریے میں جس کے الفاظ جب بھی کشمیر پر بحث ہوتی ہے دہرائے جاتے ہیں۔ نہرو نے کہا "آج کی رات میں آپ لوگوں سے کشمیر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں مشہور وادی کے حسن کے بارے میں نہیں بلکہ اس وحشت کے بارے میں جس کا اس نے ابھی حال ہی میں مقابلہ کیا ہے۔ ۲۴ اکتوبر کی رات تھی جب ریاست کشمیر کی جانب سے ہم سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ ہوائی جہاز بلکہ پورے کشمیر کا نقشہ تذبذب کا شکار تھا۔ ہم کو متعدد پیغامات بھیجے گئے۔ صرف مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عوام کے نمائندوں خصوصاً کشمیر کے عظیم لیڈر شیخ محمد عبداللہ، جو اس وقت جیل کے اندر تھے، کی طرف سے بھی۔ کشمیر کی حکومت اور جیل کانفرنس دونوں نے ہم پر اور ہندوستین یونین سے کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کے لیے زور ڈالا۔ ہم نے اس الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ اپنے سپاہی بھیج دیئے مگر ہم نے ایک شرط بھی لگادی کہ اس الحاق کی، جب نظم و ضبط اور امن و شانتی قائم ہو جائے گی تو عوام سے بھی توثیق کرانا ہوگی۔ ہم اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ جہاں کی اس گھڑی میں عوام کو اپنی بات کہنے کا موقع دیئے بغیر کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہے کہ سر حال ان کا کام ہے اور مجھے یہ بات بھی صاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس پورے معاملے میں ہمارا یہ موقف رہا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے بارے میں ایک تنازعہ ہے اور فیصلہ ریاست کے عوام کو کرنا چاہیے۔ یہ ہماری اس پالیسی کے مطابق تھا کہ ہم نے کشمیر کے الحاق کے معاملے میں یہ شرط بھی بڑھادی۔"

دراصل یہ صاحب صاحب تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ کے خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں ریاست میں ہیں، وہاں ایمان داری کے ساتھ رائے شماری ہو ہی نہیں سکتی۔ صاحب صاحب کو یقین تھا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی حمایت سے کشمیری ہندوستان کے حق میں ہی رائے دیں گے

اسی تقریر میں جس میں پنڈت نہرو نے الحاق کی توثیق کے لیے "اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم کے تحت عام رائے معلوم کرنے" کا وعدہ کیا تھا اسی میں انھوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ کشمیر کیوں علاقائی طور پر ہندوستان

جوانے پر فخر کر رہے تھے۔

میں لگا دیا گیا تھا۔ ان جہازوں نے کشمیر کو بچا لیا۔ ۳۱ اکتوبر کو نہرو نے وہ تاریخی تار پاکستان بھیجے جس میں امن و شانتی قائم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تاروں کا کوئی جواب نہیں ملا ظاہر ہے کہ پاکستان کو بھی یہ خیال تھا کہ وہ اس لڑائی میں جیتنے والا ہے، مگر جلد ہی لڑائی کا رُخ بدلنے لگا اور حملہ آور گیدڑ سے جو اچھی طرح مسلح بھی تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے، پیچھے دھکیلے جانے لگے۔ چودہ مہینہ بعد جب تک جنگ بندی ہوگی تو اس وقت ان کے پاس مغرب میں رہیں کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور شمال میں دور افتادہ بخر راضی موگی مندوستانی فوج کے کمانڈر دں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ انھیں روک دیا گیا نہیں تو انھوں نے اپنے ملک کے لیے کشمیر کے مسلے کو تقریباً حل کر دیا تھا۔ سری نگر کے کنارے سے انھوں نے پاکستانی فوج کو لیہ کے مغرب میں اس جگہ تک دھکیل دیا تھا جہاں سے پاکستان نظر آنے لگا تھا اور وہ شمال میں گلگت پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے مگر سیڈیٹ نہرو نے اقوام متحدہ کے استصواب میں جنگ بندی کو قبول کر لیا بہرحال کشمیر کا اصل مسئلہ نہ تو پاکستان کے رویے کا تھا کہ یہ توں سے مختلف ہوسی سکتا تھا اور نہ ہی اقوام متحدہ کی شانتی کی کوشش کا تھا۔ کہ یہ بھی اس سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی تھی مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو اقدار جو ۱۹۴۷ء کے جنوبی دستان میں اُن اقدار کی علامت تھے جو ملک کو متحد رکھ سکتی تھیں، شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے۔

۱۹۴۷ء کے ستمبر گلگت کو جن جذبات اور جس اقتدار نے جنم دیا تھا وہ شاید اکتوبر کو سری نگر سے زیادہ کہیں اور ظاہر نہیں تھا۔ اکتوبر کو پنڈت نہرو دہلی سے کشمیر کے دورے پر گئے۔ اس وقت تک سری نگر کے نوحی علاقے خالی کرائے جا چکے تھے اور بریگیڈیر ریں ذی سین کے فوجیوں نے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس وقت کی کیفیت اور موج کی تصویر کشی کی تھی جب لوگوں نے ۱۵ نومبر کو شائع ہونے والے روز نامے مندوستان ٹائمز کو اخبار دیوتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کی فوجوں کی کشمیر میں کھودی جائے گی۔ انومبر کو جمیع احمد قادری، جیوت پٹوردھن اور پرمی مینی اندرا گاندھی کے ساتھ پنڈت نہرو سری نگر پہنچے ایک بار پھر پرجوش استقبال ہوا۔ ہوائی اڈے سے شہر تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کے ہجوم تھے۔ اسی دن عصر عام میں آپاں سی سے ہوئے مجمع کو پنڈت نہرو نے بتایا کہ "جس کی طرح مستقبل میں بھی وہ ساتھ کھڑے ہوں گے۔ وہ شمس کامل کر مقابلہ کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے پھر بڑے اور امتنانی جذبات میں بیا ہاتھ شیخ کی طرف بڑھا دیا جو اس کی بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ نے فوراً پنڈت جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیر تک محبت اور دوستی کی عالمی علامت کے طور پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے رہے اور مجمع خوشی سے جلائے جا رہا تھا

پنڈت نہرو جنھیں ہندوستانی موقف کے آئینی طور پر جائز ہونے کا یقین تھا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسئلہ

میں لڑی گئیں، پھر ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مذاکرات میں۔ شیخ عبداللہ نے چاہا کہ بنڈت نہرو ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء میں پاکستان کو سٹی سیم دیں اور اس ملک کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں مگر بنڈت نہرو نے ان کے اس خیال کو رد کر دیا۔ اقوام متحدہ میں برطانیہ اور امریکہ نے بڑی بے شرمی کے ساتھ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی دلیلوں کی تائید کی۔ برطانیہ نے جنرل صاحب کا یہ نظریہ کہ ہندو و مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، اس لیے تھا، وہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ غلطی پر تھے اور ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آسکتی تھی کہ کشمیر جیسا بڑی مسلم اکثریت والا علاقہ ہندو اکثریت کے ساتھ اپنے الحاق کو ترجیح دے سکتا ہے۔ ڈرمنڈ ہیتھ نے تو یہاں تک کہا کہ وہ جولائی ۱۹۴۸ء میں جب کشمیر گئے تاکہ ہمارا راجہ کو پاکستان کے ساتھ الحاق پر تیار کر سکیں۔ مگر شیخ عبداللہ نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ہندوستان کی طرف ہیں۔ مسئلے کے اقوام متحدہ میں جانے کے پورے ایک سال گزرنے پر جنگ بندی کے بعد پاکستان نے "آزاد کشمیر" کی حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی اپنے مقبوضہ علاقہ مطلقہ آزاد پتن جیسے حملہ آوروں نے لوٹا تھا، میں مانی۔ جنگ بندی سے درحقیقت لڑائی کو ختم کر دیا اور اس کو اس بات کا موقع دیا کہ ان وعدوں کی طرف توجہ مبذول کر سکیں جن کا انھیں پاس رکھنا ہے

ہندوستان کے آئین نے مسئلے کی حد میں اور توضیح طلب کر دیا تھا، خصوصی پوزیشن کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیر کو آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے ذریعے ایک خصوصی حیثیت عطا کی۔ اب شیخ عبداللہ نے الحاق کے لیے عوامی حمایت کے حصول کا عمل شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں مشیل کا مقدمہ کی حد کا دسل نے ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام سے پہلے انتخابات کا انعقاد مطالبہ کیا۔ نتیجہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات ہوئے۔ نیشنل کانفرنس نے ۷۵ فیصدی ووٹ حاصل کر لیے۔ دوسری کشمیر اور متنازعہ ہیئت تمام حصوں میں سے صرف ۱۰ پر یا ۱۱ فیصدی کے امیدواروں کے خلاف امیدوار کھڑے ہوئے اس زبردست کامیابی پر جواہر لعل نہرو نے کہا کہ یہ کامیابی پاکستان کے ان دعووں کا کہ کشمیر کی پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں کشمیری مسلمانوں کی طرف سے سکت جواب تھا۔ اپنے دوست کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے بنڈت نہرو سری نگر گئے، وہاں کہ کشمیر کا مستقبل "نہرو و عبداللہ" ہمیشہ "کشمیر جنگ" دونوں کے ساتھ ہیں بہہ کے ساتھ جائے گا" جیسے نعروں سے ہوا۔ پاکستان نے جب دیکھا کہ پاکستان دوست امیدواروں کی جیت کے کوئی امکانات نہیں ہیں تو اس نے ان انتخابات کے منعقد ہونے میں تسکوک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ امیدواروں کو اپنے کاغذات پیش کرنے چاہئیں اور یہ بھی کہا گیا کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ پاکستان یہ دعویٰ کر سکے کہ انتخابات میں بے ایمانی ہوئی ہے۔ مگر شیخ عبداللہ کی حکومت نے کہا کہ اسے اپنی

اس کا منفی جواب دے رہے تھے۔"

مدیر دیکھتے ہیں۔ میں یہ فی دہلی میں کسی مگہ ہے شیخ صاحب زید راست، چھٹی دائی میں۔ تھے مگھوگر رہا تھا یہ ہی
یہ ملاقات، خود بخود خصیہ، میں نے ان دیرت کے نظریے میں ہونے والی ملاقاتوں میں سے ایک تھی۔ میں
ان تاسف ہی جی کی موت کے ایک سال بعد دیس کی جیب میں گیا تھا اور ان گھگو جب میں لے دلی معاملے کا
ذکر کیا تو شیخ صاحب نے نیا عذابی ہوتے ہوئے مجھے بتایا کہ خود انہوں نے بہت سی باتوں کو طے کرنے کا کام کشمیری اوساً
کھلے پھیلانے یہ نہ معلوم کی نظر کی تھی اور یہ ہے کہ ہی طے ہوئے رہے پریشان نہ ہوئیے کہ آپ کو سوے
کی کمیوں سے بعد میں کے۔ سوے کی کمیٹی ایک سال بعد ان میں سے ایک کے اجلاس منعقد ہوئے
میں یہوں کی تبدیلی ہوئی، شیخ نے اس گفتگو کے دوران مجھ سے کہا کہ صاحبت یوں کی کہ یہ اصل دائیں ہے
ان میں بہت سستی دکھائی گوں کی مذہبی تھی، انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے خیال میں وہ بہت پرست
مسلمان ہیں یہ ہے ہے کہ ہے کے ہے میں ہیں کہ دوسری جگہوں پر یقیناً شیخ نے زندگی کر
ہے میں دہ سے دیگر گوں کو مجھ پر بالکل ہے نہیں تھا۔ ہے نے شیخ میں مجھے مدام کرنے کی
کوشش کی معاملہ کیا۔ ہے ہاتھ سے بھی تھا۔ ہے دیئے۔

۱۹۷۰ء کے تجزیات میں ہے کہ ہے نے بہت تھا ہے کہ ہندوستانی مذہبی متعصبین نے ہے پر جملہ
کی مقصد طریقہ تھا۔ یہ ہے جس پر وہ سمجھتے تھے کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنی جیت کر سکتے ہیں۔ ہے
شیخ ہے یہ کی سمجھ سے جو کہ وہ ہے یہ ہے میں سے اس لیے انھوں نے یہ ہے شیخ کو بنایا اس سے
میں بھی بھی ہے میانی حاصل ہوئی۔ اس میں ہے ہندوستان ہے بھی مسلسل یہ دیکھنے سے بھی بہت مدد کی
ہے ہیں۔ ہے شکست کا جیلا تھا۔ ہے ہے کی ہے ہندوستانی قوم کی شکست کی وجہ سے میدان
ہار میں وہ تک رہ گئے۔ ہے ہی سنگھ ہے ہندوستان سے ہے ہے کی ہے ہے ہے ہے ہے ہے
ہیں ہے ہے ہے ہے ہے ہے

[illegible] نے [illegible] ایک [illegible] ہی [illegible] اور [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] تھا
نے [illegible] کا [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] [illegible] [illegible]

ہیں وہ ایک آزاد کشمیر چاہتے ہیں.....

آخر ارشد کو ذمہ داری کی بنیاد پر موجودہ کیبنٹ کا کام کرنا ممکن ہو گیا ہے اور اس سب کے نتیجے کے طور پر مید
ہونے والے تنازعات نے ریاست کی ایک جہتی خوش حال اور استحکام کو بری طرح مجروح کر دیا ہے ۔۔۔ میں
شیخ عبداللہ کو جموں کشمیر کی ریاست کی وزارت عظمیٰ سے برطرف کرتا ہوں اور ریجنٹ ان کی سربراہی میں ۔۔۔ کابینہ
آف منسٹرز بھی اس کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔"

۹ اگست کی تمام کا موسم اسٹیکسپیئر کے ڈرامے میکبیتھ کا سین تھا جب کرن سنگھ کے ۔۔۔ ہاتھ سی میجر
بی بس باجو نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آنگ ٹگ کی طرف سے گگرگ جانے دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔
رات کے گیارہ بجے جب میجر باجو نے دروازے پر دستک دی تو اس وقت شیخ اور ان کی بیگم سو رہے تھے پولیس
نے گھر کو گھیرے میں لیا تھا۔ انھیں ٹھیک دو گھنٹے کی مہلت دی گئی جس میں سامان باندھیں اور نماز ادا کر لیں۔ علی الصباح
انھیں لے جایا گیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جس کے بعد سے بیلوں کی وہ دس سالہ آمد و رفت اور بے سمتی کے تقریباً بیس سال
گزرنے تھے جنھیں شیر کشمیر کے ایمان اور ہمت کی آزمائش کرنا تھی۔ مرزا افضل بیگ جیسے ان کے ساتھی اور عمدرد
بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی رات کی تاریکی میں، صبح طلوع ہونے سے قبل ہی غلام محمد کی قیادت میں ایک نئی
حکومت نے حلف لے لیا تھا۔ مرید حکومت پر آنے سے پہلے بخشی غلام محمد نے صرف ایک شرط رکھی تھی اور وہ یہ کہ
شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیوں کہ اگر شیخ آزاد رہے تو وہ کشمیر کو قابو میں نہ رکھ سکیں گے۔ اخباروں میں یہ
پروپیگنڈہ کرایا گیا کہ ہندوستان کو بچا لیا گیا ہے اور شیخ عبداللہ کو اس طوفانی رات میں عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا
ہے جب وہ سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے تھے۔

پنڈت نہرو کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ ان کے دوست کو جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ ہندوستان بھر میں، سیاست
داں حتیٰ کہ حزب اختلاف کے بھی بڑے حیرت زدہ طور پر نہ بہ لب تھے۔ ملک بھر میں اقتدار کی ایک کمی سی پڑے
واضح طور پر نظر آ رہی تھی اور ایک خوف کو شاید بجا اور یک جہتی کے لیے یہ قیمت دینا ضروری تھی۔ سوشلسٹ لیڈر
رام منوہر لوہیا بھی جو کسی بھی بات پر نہ بہ دیر تنقید کر سکتے تھے۔ اپنے تاثرات کے ضمن میں بڑے زمزم سے تھے۔ بعد کو
جے پرکاش نرائن اور اشوک مہتا جیسے کچھ لیڈر تھے جنھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ شیخ کی گرفتاری تباہ کن حماقت تھی اور
درحقیقت وہ عمل گی پسند نہیں تھے (اگر شاید ۱۹۵۲ء کی خاموشی کا جرم ۱۹۸۴ء میں اس وقت دھویا گیا جب
فاروق عبداللہ کی حکومت کو بالکل اسی طرح اور بالکل ویسے ہی بہانوں پر برطرف کیا گیا تھا ملک بھر کے حزب اختلاف
کے لیڈر، شیخ عبداللہ کے بیٹے کی حمایت میں جمع ہو گئے) شیخ عبداللہ کی گرفتاری کا حال بیان کرتے ہوئے گندیو

کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔

بہت دیر بعد ۱۹۷۸ء میں مصنف سے بات کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ ان کے بچپن کے دن بڑے کٹھن گزرے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی زندگی کا رخ اس وقت تبدیل ہوا جب ان کی ملاقات سری پرتاپ کالج سرینگر کے ایک امریکی استاد سے ہوئی۔ ان کے بقول ان استاد نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنا مستقبل کیسے بنایا؟ خود شیخ صاحب کے بقول انہوں نے جواب دیا کہ ۱۹۲۰ء میں اس وقت جب ان کا خاندان مکمل طور پر مفلوک الحالی کا شکار ہو گیا تھا، ان کے چاروں طرف فاقہ کشی کے حالات موجود تھے۔ بچپن میں انہیں اپنے ہوش سنبھالتے ہی سیوک شاہ کی طرف سے قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں۔ ان کے گھر والوں کو بھی دھمکیوں سے گھیرے ہوئے تھے۔ ان سے ان کی زندگی کی آگ کے خلاف آواز بلند کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ سیوک شاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کا مطلب تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو للکارنا۔ ۱۹۳۱ء میں قید کا تکلیف دہ تجربہ بھی تھا۔ جب سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم پر ہمارے یہاں دلچسپ بحث آزمائش کا وقت پڑا تھا۔ اس وقت جیل میں میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اب آپ کیا کہتے ہیں؟ یہ بھی تجربہ ہے تو ہمارے ہندوستان کے ساتھ کیوں حالات ہیں؟ ہمیں پاکستان جانا چاہیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں لے کر ہم کھڑے ہوئے تھے زیادہ تر تھے۔ پاکستان سے بھی زیادہ ہندوستان سے بھی زیادہ۔ ہم ہندوستان کے ساتھ ہے تو اس کے سیکولرزم اور سوشلزم کے نظریات کی وجہ سے۔ ہندوستان نے ایک ایسا ملک تعمیر کرنا چاہا تھا جہاں سب انسانیت کا درد رکھتے ہوں گے۔ جب تک ہندوستان ان نظریات کا پیروکار رہے گا اس وقت تک ہمارے ملک کے لوگ دوسری طرف نہیں ہیں سوائے ہندوستان کے۔

۵

کچھ بھی ثابت نہ ہوا

شیخ عبداللہ کی سیاسی زندگی نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے۔ اس مدت میں وہ ۱۲ برس جیل گئے بحیثیت مجموعی پندرہ سال سات مہینے دریا کی دل حرست میں گذرے۔ ہری سنگھ کے جیلوں میں رہنے کی مدت سب سے کم ایک دفعہ تو شیخ عبداللہ سے جیل کے کھانے وردوں کی مراعات کے طلاف بھوک ہڑتال کی۔ ہری سنگھ کی حکومت میں زیادہ سے زیادہ منظور رکھتے تھے تو ان کے لیے یہ کھانا دستر خوان نہ دھیما ایک دوست ان سے ملنے آیا، قیادیں ختم کرنے اور پھر آزادی و جمہوریت سے متعلق طویل ہے ہوئے پیوں والا کوئی ڈیوکریٹ کیسے سطر در گزرے ہوں کے دوران کے طلاف ڈھنڈورے ۱۹۵۰ء طوفان مچا دیتا۔ وہ تو نمک چھڑکنے کے مترادف ہے ہو سکتا تھا اس بات کو کہ شیخ عبداللہ کشمیر کو پاکستان سے جانے کی کوشش کر رہے تھے بار بار دہرانے کے علاوہ اور بھی زیادہ شرارت آمیز اضافات تھے مثلاً یہ کہ شیخ عبداللہ کو پاکستان سے بڑی بڑی رقوم مل رہی ہیں۔ بخشی غلام محمد کی موجودگی میں جو یہ بات کرتے رہتے ہوئے تھے کہ کھوسے جو کچھ کیا وہ قومی مفاد کے پیش نظر کیا۔ فلیٹ حقیقت کی یکسیاں و دہلی میں وزارت و خلد میں جس میں سے لوگوں کا خیال تھا جو شیخ عبداللہ سے کوتاہ کرنے کے درپے تھے، وطن پسندی کی شہادتیں فراہم کرنے کی کہ ہر دوست کو کوشش کرتی۔ چار سال تک مقدمہ چلا جس میں جو بھی الزام لگائے گئے کبھی کچھ ثابت نہ ہو سکا اور بھی طے کہ شیخ عبداللہ جیل میں رہے۔

شیخ عبداللہ کی بیوی بیگم اکبر جہاں عبداللہ نے ایک موقع میں آپ بیتی ۱۹۶۵ء کو یہ بتایا ہے کہ کھوسے سے ملنے کے بعد وہ بہت دلچسپ باتیں سنائی۔ بیگم عبداللہ نے

ہونے کا الزام لگا کر ان سے الگ ہو چکے تھے۔ بخشی غلام محمد کی مالیتی میں آزادی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے میر صادق اور ڈی پی دھر نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ شیخ کے حامیتی نئے نئے بنے ہوئے مستصواب محاذ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ فرنٹ کی قیادت مرزا افضل بیگ کر رہے تھے۔ اس پارٹی کے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ ۹۔ اگست ۱۹۵۳ کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے جمہوریت کو قتل کر دیا گیا تھا، قانون ساز اسمبلی عوام کی نمائندہ نہیں رہ گئی تھی اور اس لیے اس کے لیے ہوئے تمام فیصلے کالعدم ہو گئے تھے۔ نتیجتہً یہ بات لازمی تھی کہ عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے ایک نیا استصواب رائے ہونا چاہیے جس کا الحاق سے متعلق بھی۔

شیخ عبداللہ کے لیے تو کشمیر کی گھڑی ۸۔ اگست ۱۹۵۳ کی نصف شب سے ایک گھنٹہ قبل ہی رک چکی تھی اور وہ اب دہلی کے ساتھ کسی ایسے معاہدے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے جو "اسٹیٹس کو" کو بحال نہ کرتا ہو۔ شیخ عبداللہ کے حقیقی نظریات کا کیا ہوا؟ کیا چار سال کی بے وجہ اور من مانی سزائے قید نے انھیں تبدیل کر دیا تھا۔؟

۱۰ جنوری ۱۹۵۸ کو انھوں نے پریس والوں سے ملاقات کی۔ کالی شیرانی اور سعید پاچا نے میں موس، وہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پہلے سوال کا ان کا جواب یہ تھا کہ ان چار برسوں میں، جیسا تا گاندھی پر ان کا عقیدہ اور پختہ ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی اور ان کے تجربات، مشکل دنوں میں "روشنی کی کرن" رہے تھے۔ انھوں نے اعادہ کیا کہ میں آج بھی ۱۹۴۷ء ہی جیسا عبداللہ ہوں۔ جب لوگ کہیں اور مارے جا رہے تھے۔ میں نے گاندھی جی کے آئیڈیل کو بچائے رکھنے کی کوشش کی۔ میں آج بھی بدستور یہی کر رہا ہوں۔ میں تبدیل نہیں ہوا ہوں۔ میرے خیالات پختہ ہیں۔ میں اس قسم کا سیاست داں نہیں ہوں جو حقائق کو دوسروں سے چھپائے۔ میرے خیالات سب ہی لوگ جانتے ہیں .... قدرتی طور پر، عوام ہی آخری فیصلہ کرنے والے ہیں۔ میں آخری ثالث نہیں ہوں۔ میرے پاس لوگوں کو زیر کرنے کے لیے بندوقیں نہیں ہیں انھیں دینے کے لیے روپیہ بھی نہیں ہے میرا طریقہ تو صرف سمجھانے کا قائل کرنے کا ہے۔"

شیخ عبداللہ میں اگر تلخی تھی تو صرف ان لوگوں کی طرف سے جن کے بارے میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان لوگوں نے ۱۹۵۳ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ غداری کی تھی "میں نے دوستوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا نہیں سیکھا ہے۔ دوستوں میں بہت سے وہ ہیں جنھیں میں نے پروان چڑھایا اور انھیں اپنے ہی خاندان کا ذمہ سمجھا میں نے سازش کر یا دوستوں کے ساتھ غداری کرنا نہیں سیکھا ہے۔"

کی کارروائی کو صحیح اور برداشت قرار دیا تھا۔ آپ نے کہا کہ بعد کی دوسرے دوسرے دلی وابستگی لے کر کشمیر کو ایک دوسرے کو ریاست تبدیل کرنے کے لیے کچھ مستقل قوتوں کے ساتھ سازش کرنے کا الزام لگایا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ان الزامات کو ثابت کرنے کے لیے حکومت کے قبضے میں کافی شہادت موجود ہے۔ گو یہ تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ان فیصلہ دہندہ زبانات کے دعوے ثبوت ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں۔ شیخ صاحب نے مزید کہا کہ اگر کشمیر کا یہ مقدمہ کہ وہ ہندوستان میں ہے تو ہمارا طریقہ یہ ہوتا کہ ہم شیخ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لاتے اور یوں ہمیں رائے شماری کے ذریعہ شیخ کو حکومت سے ہٹانے کا مطالبہ کرنے کا موقع ملتا۔ شیخ نے کہا "میں نے پیشکش کی ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں نے ہندوستان کے ساتھ بے وفائی کی ہے تو میں اس کے لیے ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ مگر یہ موقع کبھی نہیں دیا گیا۔ ہاں یہ کہ جو ہوا وہ یہ ہے کہ ہندوستان نے بھی جمہوریت کے ساتھ بے وفائی اور دھوکہ دہی کی ہے اور دنیا کے سامنے اپنا موقف کمزور کیا ہے۔ ہندوستان کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ ہمارے ساتھ اپنے وعدے پورے کرتا۔ مگر شیخ نے کہا کہ اس بات کے لیے اپنے دوست پر برسر عام کیچڑ نہ اچھالا۔ اگرچہ ابھی گفتگو ہو سکتی ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ اٹھایا ہو۔

بحیثیت مجموعی سیاست کے میں تو جواہر لال نہرو کی شخصیت کو اس سے بہت زیادہ حقیقت پسندانہ ہی سمجھتا ہوں۔ کیا حالانکہ جو انھیں ایک ایسے شخص نے پیش کیا جو ابھی ابھی چار سال سے زیادہ عرصہ جیل میں گزار کر آیا تھا۔ میں اس محبت اور اس خلوص کو کبھی نہیں بھول سکتا ہوں جو انھوں نے اپنے خاندان کا ایک ذمہ کے طور پر میرے ساتھ برتاؤ میں کچھ سکتا ہوں۔ بہت سی قومیں ہر سال ہوتی ہیں جب کوئی کسی جدوجہد کی تاریخ ہوتی ہے۔ اس پر بہت سے تبصرے بھی ہوتی ہے۔ خود خاص مفاد پرستوں کی طرف سے قومی اور بین الاقوامی معاملات کی طرف سے کوئی خاص تعلقات کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو وہ میں صرف پنڈت جی کا نام صورت حال میں کا فرمانبردار کیا جاتا ہے۔ کشمیر رسائل، معاشی حل کے کاموں سے کچھ نہیں ہو سکا۔

۲ فروری ۱۹۵۸ء کو شیخ محمد عبداللہ سری نگر پہنچے۔ سارا شہر "شیر کشمیر" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ہزاروں کے ہجوم نے شیخ کا استقبال کیا۔ ۳ فروری کو انھوں نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اس کی تفصیل میں اپنے ۱۹ جون کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ لوگوں پر جو کیفیت طاری تھی اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ شیخ صاحب نے سری نگر کے اس دن جو تقریر کی تھی اس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہ

شیخ عبداللہ نے نہرو کے اس خیال کو درست کرنے کی کوشش کی، وی نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار اے۔ یہ روز منٹھان نے شیخ کے اس خط کا حوالہ دیا جو انھوں نے نہرو کو جیل سے لکھا تھا: میں اس سب کو خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں تاکہ میں خود یہ معلوم کر سکوں کہ ریاست کے مسلم کمیونٹی والے حصے میں ہمدوستانی جمہوریت کس طرح چل رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں اس پالیسی سے بالکل اتفاق نہیں کرتا جس پر حکومت ہند عمل پیرا ہے ..... اس سارے تنازعہ کشمیر کے عوام کو وہ حق خود اختیاری دے کر ہی حل ہو سکتا ہے، جس کی خود آپ نے پرزور حمایت کی تھی .. میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ مسئلے کے حل کی کنجی آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہوں، جو بہرحال ہم سب کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ بخشی اور ان کے حامیوں سے دھوکہ نہ کھایئے۔ امید ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک ہوگی۔"

پچھلے واقعات پر غور کرتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو شیخ عبداللہ کی بار گرفتاری پہلی گرفتاری کے مقابلے میں زیادہ منطقی اور زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ شیخ عبداللہ کی دوسری گرفتاری کے لیے بخشی غلام محمد جو دلیلیں دیتے ہیں انھیں غیر ذمہ دارانہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر شیخ عبداللہ کو فرقہ پرست کہنے پر نہ تو دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان نے ان پچیس برسوں میں کتنی تمنا اس بات کی کی ہوگی کہ کاش شیخ عبداللہ درحقیقت وہ سب کچھ ہوتے جو ان کے نقاد کہتے تھے کہ وہ ہیں۔ ابھی تک شیخ عبداللہ کا ایک بیان بھی کوئی ایسا نہیں ڈھونڈا جا سکا جس میں شیخ نے کشمیر کے پاکستان سے مل جانے کی وکالت کی ہو یا کہا ہو کہ کشمیریوں کی مستقبل میں پاکستان کے حق میں ووٹ دینا چاہیے۔ مگر آزادی اور عزت کے ساتھ یا مستقبل طے کرنے کے کشمیریوں کے حق کے سلسلہ میں وہ ذہنی طور پر کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اپنے عوام کو سب سے بڑی چیز جو وہ دے سکتے ہیں وہ خود فتاوی اور افتخار ہے جو سکھ یا ڈوگرہ حکمرانوں کے بعد بگڑے تباہ کر دیا تھا اور خود اپنی بے وجہ برطرفی کو انھوں نے نوآبادکاری نظام اور نیم جاگیردارانہ قوتوں کی واپسی اور عوام کی خواہشوں کی تحقیر تصور کیا جسے قبول کرنے کے لیے انھیں وہ سب کچھ تج دینا پڑا جس کے لیے وہ زندگی بھر لڑے تھے، جدوجہد کی تھی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر ۱۹۵۳ء میں انھیں آزاد چھوڑ دیا جاتا تو عوام کی خفگی کا مقابلہ کرنا حکومت ہند کے لیے مشکل ہو جاتا۔ ۱۹۵۲ء میں یہ جانے والا فیصلہ برحق تھا مگر جب وہ ایک دفعہ لے لیا گیا تو پھر ہر روز کو ایک برے فیصلے کی منطقی کے مطابق عمل کرنا ہی تھا۔ غلط پر مزید غلطیوں ہی سے تو پردہ پڑا جا سکتا ہے۔

یہ مقدمہ ہے کس لیے؟ ... لوگوں نے کہا کہ یہ بات صاف ہے کہ اس مقدمہ کے پیچھے ایک سیاسی چال ہے۔ مقدمہ سوائے سیاست کے اور کچھ نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ "ایک سازش ہے جسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک سازش ہوئی کا کہا جاتا ہے حکومت مجھ پر سال اس بات کو ماننے میں ہے کہ شیخ مجیب اللہ صحیح تھے۔ حکومت کی ساری قوت کی نیت پاتی دراڑوں میں ... ہم کرنے سے ... مقدمہ کے ساتھ ... شیخ صاحب کے ... ایک ... ججوں نے ... ام تھے۔ شیخ صاحب ... ایک ... سے ... گے اور سر اٹھائے ہوئے ... سے

شیخ صاحب کے زمانے میں جب اگرتلہ کی حکومت نے تھوڑی ہوئے کی ... ق ... ق ... ق

یوں ۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ کو شیخ محمد عبداللہ نے حضرت بل سے واپس گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر اعلان کیا کہ "موئے مبارک" مل گیا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ریڈیو کشمیر سے بار بار یہ اعلان ہونے لگ

۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو عدالت [illegible] نے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] کی [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

انتظار خواب صرف صہ دستان، پاکستان اور ستیہ کا ایک وفادار تھا۔ شیخ عبداللہ اس وقت ڈسے ہوئے تھے اور ان تھے۔ عالمی حالات درست کے بعد عملی تبدیلیوں پر ملک کی سیاست میں یہ کہ مسئلہ ہوتا ہے ہی

ہوئی ہے ایک درخواست کا احساس کرتے ہوئے اور اس سارے حقیقتوں میں پاکستان پہنچے جھٹا دے ایوب خاں نے شیخ عبداللہ کو ایک خط لکھا جس "آپ علامہ ہے، صہ دستانی لیڈروں کے ساتھ ستیہ کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے ہیں اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ستیہ کے عوام سے ایک وعدہ کیا ہے کہ ریاست کا مستقبل ان کی خواہشات اور اقوام متحدہ کی تجاویز کے مطابق ہوگا اور پھر یہ حقیقت کہ ستیہ میں ہمارے بھی سرحد عادات فضا میں اس سلسلے میں ہمارے مشورے اور ہماری مدد کے بغیر کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ ہماری تشویش کا اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے مشوروں کے لیے اب وقت آ گیا ہے تو ہمیں آپ کا یہاں استقبال کرنے اور آپ کے ساتھ مسئلے پر غور کرنے میں بڑی مسرت ہوگی۔"

دعوت قبول کر لی گئی۔ شیخ عبداللہ یہ جانتے ہوئے کہ ستیہ کے مستقبل کے بارے کے فیصلے کے لیے پاکستان کی رضامندی کے بغیر کوئی بھی کارروائی عمل میں نہیں آ سکتی، عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے ان سب میں کچھ ضرورت سے زیادہ مصروف ہو گئے۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان اس خیال پر راضی نہ ہوگا اور یہ خیال محض ایک وہمی رد عمل حاصل ہو کر رہ جائے گا ایوب خاں یہ کہیں گے کہ یہ پاکستانیوں کو ایک بار پھر صہ دستان میں مداخلت کرنے کی ایک چھپی ڈھکی کوشش ہے شیخ عبداللہ اس کی کامیابی کے لیے زیادہ پر صہ دستھے انھوں نے ایوب خاں کو جو خط لکھا اس محبت آمیز دعوت پر خود ہی یہ نتیجہ کوئی قطعی شکل اختیار کر لیتی ہے "دہلی آنے میں ابتدائی مسرت محسوس کریں گے۔ خیر خواہ نے تو یہاں تک تجویز کر دیا کہ وہ کشمیر کی جنگ بندی لائن کو پار کر کے پیدل اسی طرح پاکستان جائیں گے جس طرح مہاتما گاندھی نے صہ دستان اور پاکستان کی سرحد کو، انھیں تسلیم کر کے ختم کرنا چاہا تھا نہرو نے جب یہ سنا تو وہ خود دہشت زدہ ہو گئے کہ اگر شیخ نے ایسی کوئی حماقت کی حرکت کی تو کہیں ان پر بھی ویسی ہی بیتے۔ ان کی سلامتی کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ شیخ عبداللہ نے جب یہ سنا کہ سرحد پیدل پار کرنے کے منصوبے کی مخالفت ہو رہی ہے تو اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس کا الزام براہ راست پر رکھا۔ انھیں یہی راستہ بدلنے پر مجبور کرنے میں کافی دشواری پیش آئی مگر وہ جب ۲۴ مئی کو پاکستان پہنچے تو پاکستان میں لوگوں کی ایک تعداد نے ایک تعداد سے پہنچے۔ پاکستان عوام کی آمد کو ایک بہت بڑا اور اہم واقعہ قرار دیتے ہوئے تھا اس نے ان کا بڑے عظیم پیمانے پر استقبال کیا ہوائی اڈے پر انھیں

(۶)

مرنا — ایک ہندوستانی کی حیثیت سے

[illegible] ہے ہم مدت سے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں اس [illegible] میں [illegible] کھڑے ہو جانا چاہیے اور تحریک کے ہندوستان سے تعلقات کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں اور [illegible] کرنے۔ فلسفہ ہمیں اس قطعی صورت حال پر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو ریاست اور ریاست سے باہر اس وقت [illegible] ہے۔ [illegible] خصوصاً ریاست کے مقاصد سے تھی اور ان کی وقف میں کہ پچھلے بیس برسوں میں ہندوستان کے ساتھ [illegible] کے اتحاد [illegible] ۱۹۴۰ء میں مواخاۃ، قطعیت دینے کے لیے ہم نے پوری [illegible] کی۔ خوش گوار حالات میں بھی اور ناخوش گوار حالات میں بھی ہم نے اسے ناقابل تنسیخ اور مکمل کہنے میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھا اور نہ ہی اس مقصد کے حصول کے لیے کسی قربانی سے گریز کیا۔ بدقسمتی سے ہماری یہ تمام کوششیں مطلوبہ نتیجے کے حاصل [illegible] ہیں بالکل ناکام ہیں۔ . . . . ریاست کے اندر عوام نے دلوں میں تبدیلی [illegible] علامت ظاہر ہیں کی۔ وہ مصائب سے گذرے، انھوں نے تکلیفیں جھیلیں اور ہندوستان، پاکستان اور اقوام متحدہ کے لیے ہوئے وعدوں کے ایفاء کے مستقل مطالبہ کرتے رہے اس صورت حال کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی بے یقینی اور عدم تحفظ کے احساس نے دہلی کرب میں سیاسی اور اقتصادی تباہی مزید شامل کر دی ہے۔ اور عوام ریاست کی تاریخ کے نازک ترین اور انتہائی تکلیف دہ مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

شیخ عبداللہ کی اپنی قوم کے لیے [illegible] ایک اور مثال ہیں ہیں یہ بیان کشمیر کے علامہ محمد اقبال نے ۱۹۲۴ء میں اس وقت دیا تھا جب انھیں [illegible] سے جلا وطن کیا گیا تھا ۱۹۶۳ء میں ایک پرجوش [illegible] نے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] تکلیف ان کے دل و دماغ پر [illegible] ان [illegible] سے ایک زبردست کشمکش شروع کی جس قدر کے زمانے میں

یہ بات نے ی دعوت دی ہے صدر دستان میں، جہاں ایک مدار کی حیثیت سے ان کی خدمت ہوتی ہی تھی ۔ نے
میں مطابق ۔استور ہوا اسی کے ساتھ صدر دستانی پارلیامنٹ میں اس درخواست کی تکمیل کے حوالے سے شیخ
کے علاوہ ری فر کو شتیں ہوئیں حوالہ نے اپنے اس پاسپورٹ کو حاصل کرنے کے لیے، دی تھی جو خیں مئی ۱۹۶۰
ن ن سب دستان صدر سے پیٹ یہ ت دی حکومت نے دیا تھا ۔ درخواست کے نام میں قومیت کے خانے
میں شیخ صدر نے اپنے آپ کو کشمیری مسلمان لکھا تھا صدر نے اسے رکھ کر نظر انداز کر دیا تھا ۔ شیخ عبداللہ
صدر دستانی پاسپورٹ پر سفر کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ایسا کرنا کافی ہے مگر اس سے پہلے کی حکومت
کے عہد میں اس بات کو عداوی کا ثبوت قرار دیا گیا اور پارلیامنٹ میں ایک نہ کے عدد دوسرا صدر دستانی حکومت
پر اس علیحدگی پسندی کی حمایت کرنے کا الزام لگا تا ۔ یہ واقعہ ابھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے کہ اگرچہ نہ وہ قدم
نہیں لیا گیا تھا مگر جب ۲۹ مارچ کو اسپیکر نے ایوان کو یہ بتایا کہ شیخ کے پاسپورٹ کی منظوری نہ دی کی حکومت میں
اعلیٰ ترین سطح پر ہوئی تھی، تو پارلیامنٹ میں نہرو ٹرے تمسخر آمیز حقارت انگیز طور پر ہنسے تھے

۲۰ مارچ کو کشمیر اسمبلی نے کشمیر جسے ابھی تک گورنر و زیر اعظم کے ناموں کی جگہ پر دوم سے خصوصی نام
رکھنے کی خصوصی رعایت حاصل تھی، ملک کی دوسری ریاستوں کے مماثل درجہ ابھی تک تو توں اور کشمیر میں گورنر کے
بجائے صدر ریاست یا صدر ہوا کرتا تھا اور ریاست کا وزیر اعلیٰ وزیر اعظم کہلاتا تھا ۔ مزید یہ کہ صدر کو صدر دستان
کا صدر مقرر نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا انتخاب اسمبلی کیا کرتی تھی ۔ اب یہ سب کچھ بدل گیا تھا ۔

۲۱ مارچ کو وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ہند دستان کی پارلیامنٹ کے موڈ کی نمائندگی کرتے ہوئے شیخ
عبداللہ کو آگاہ کیا کہ اگر انھوں نے ہیں کا دورہ کیا تو سخت اقدامات اٹھائے جائیں گے ۔ حکومت نے پاسپورٹ
کے مسئلے میں جو کوتاہی ہوئی تھی اس کے لیے معافی چاہی اور یہ وعدہ کیا کہ اس قسم کی بات اب آیندہ نہیں ہوگی ۔ مگر
اسی روز شیخ عبداللہ کوئی ایسی بات کرنے میں مصروف تھے جو ان کے دشمنوں کو ایک اور مہتیار فراہم کرنے والی
تھی ۔ ۲۱ مارچ کو ایک دعوت کے دوران شیخ عبداللہ نہیں کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے ملے اور گھلوگی ۔

دوسرے دن لال بہادر شاستری نے پارلیامنٹ کو بتایا کہ حکومت نے اس ملاقات کو سنجیدگی کے ساتھ
محسوس کیا ہے ۔ ۲۲ مارچ کو کانگریس پارلیامانی پارٹی کو بتایا گیا کہ شیخ عبداللہ و جواہر لال کی اس
ملاقات کو حکومت کے معاملات میں کھلی مداخلت سمجھتی ہے ۔ شیخ عبداللہ کا پاسپورٹ اس وقت بھی بدستور معطل کر دیا گیا تھا
لیکن آئندہ کے لیے اسے منسوخ نہیں کیا گیا تھا ۔ اگر انھوں نے ہندوستان کا دورہ کرنے کی درخواست

کوڈلی کناں میں گذاری دو مہینے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں [illegible] ان دنوں آنے سے قبل تقریباً ایک سال دہلی میں تین کوارٹرز میں۔ ہر ان کی ہمت اور تحمل تعجب [illegible] ان کا خیر مقدم کرنے والوں نے اس پر بڑے جوش میں ان کا ساتھ دیا۔ عوام ان کے لیے آخری امید تھے۔"

شاید یہ اچھا ہی تھا کہ شیخ عبداللہ پاکستان سے ہونے والی جنگ کے سال میں حراست میں تھے۔ ایوب خاں نے جو تاریخ سے کوئی مسبق نہیں سیکھ سکے تھے۔ وہی چالیں اپنائیں جو نہرو صاحب نے کشمیر پڑھنے کے لیے اپنائی تھیں۔ قبائلی لٹیرے حملہ کا نعرہ لگاتے ہوئے آئے ان کے پیچھے پیچھے پاکستان کی منتظم فوجیں۔ ورنہ کشمیر کے مسلمانوں نے نہیں سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کو کبھی نہیں کہا کہ سکاکر کشمیر کے الگ ریاست ہو سکتے ہیں مگر پاکستان سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ درحقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی مسلمہ تزویراتی حیثیت رہی ہے ہندوستان نے زور پر پاکستان کے اتحاد کا ایسا مسئلہ کارخ موڑ دیا۔ مسئلہ کشمیر کے وقت تک اس نے پاکستان کو معتبر صورت حال میں پہنچا دیا تھا۔ ایوب اس مسئلہ کے بعد خرافات سے جانہ نہ سکے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ٹیڑوں اور نوجوانوں کے خاکی مدد سے وہ حیثیت بن گئے

۱۹۶۵ء میں شیخ عبداللہ نے ایک صاحب رد سے اس جنگ کے دوران پاکستان کا دورہ کیا گیا۔ دونوں نے جھیلیں کشمیر کی سیاست میں بڑا کردار ادا کرنے سے، بڑے فاروق عبداللہ اور چھوٹے طارق عبداللہ دونوں اس وقت انگلستان میں رہتے تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنے دوست کے بیٹوں فاروق اور بھیجوں میں ذاتی دلچسپی لی تھی۔ انھوں نے ہی فاروق کو جے پور میڈیکل کالج میں داخلہ دلوایا جہاں سے انھوں نے میڈیسن میں ڈگری لی۔ [illegible] لندن میں رہنے اور پریکٹس کرنے گئے۔ طارق عبداللہ بھی تیار کے بعد سے لندن گئے۔ [illegible] انڈین ڈائی کمیشن میں ایک ملازمت حاصل کر لی۔ میں ان کی مدد کی مگر جب ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی طارق عبداللہ نے پاکستان ڈائی کمیشن میں نوکری کر لی۔ پاکستان ان کی [illegible] پوسٹ تھی۔ ہائی کمیشن سے بے [illegible] سارتھا۔ طارق عبداللہ کو [illegible] میں پاکستانی [illegible] کا ایک رکن سمجھا گیا۔ طارق عبداللہ کے [illegible] کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خود شیخ عبداللہ کے لیے یہ [illegible] کا وقت تھا۔ شیخ عبداللہ اور [illegible] ہوئے تو انھوں نے اپنے بیٹے کو ایک [illegible] کی [illegible] ایک [illegible] کا [illegible] ۳۲۶ [illegible] ۱۹۶۵ء کے [illegible] کے [illegible] ہندوستانی [illegible] ۱۹۶۵ء کے [illegible] سے [illegible] کیا تھا۔

نہیں رہتا ہے اس پر تو ہنسی آتی ہے تو دوسروں کو کیسے بچا سکتا ہے؟ ... میں شیخ عبداللہ کی رہائی کی وکالت کیوں کرتا ہوں، کیونکہ اس سے ہمیں وہ واحد موقع مل جائے گا جو کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمارے پاس ہے۔"

۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو رہائی ملی مگر مسئلے کے حل کے لیے جیسے اب ہندوستان اور پاکستان کی ایک اور فیصلے کا منتظر تھا۔ ملک کی تقسیم جو اسلام کے نام پر ہوئی تھی اور دونوں ملکوں کی طرف سے یہ وعدہ کیا جا چکا تھا کہ اقلیتیں کہیں بھی رہیں، کشمیر میں جنگ بندی لائن کو عملی طور سے سرحدی سرحد تصور کیا جائے گا۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں حالات جو کچھ بھی مگر متبادل کوئی نہیں ہوئی۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ عبداللہ نے ایک بیان کو تیار کرانے میں مدد کی تھی جو ان کے ۱۹۶۴ء میں موت کے بعد جہاں سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا وہیں سے جوڑ دیتا۔ اس بیان کی تیاری کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے دو باتوں سے زور دیا تھا کہ ہمیں ہندوستان کو ایک ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ ہمیں ہندو بھائیوں کے دل جیتنے چاہئیں۔ ۳ جنوری کو ایک پریس کانفرنس میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے چین لداخ والی کہانی کا ایسا رُخ دکھایا۔ وہ چین لداخ سے اکسائی چن میں گئے تھے، وہاں انھوں نے کشمیر کے اس حصے کے بارے میں ان سے پوچھا جو چین کے قبضے میں ہے اور ہندوستان سے چین کے تعلقات کے متعلق معلوم کیا۔ شیخ صاحب نے تیار بعد کو انھوں نے اندرا میں ہندوستان سے بھی گفتگو کا متن سنا دیا تھا تاکہ وہ حکومت ہند کو مطلع دے سکیں۔

۱۹۶۹ء میں نے سامنے جواب اور اہم حقیقت سوال یہ تھا کہ کشمیر کی گتھی کو کس طرح سلجھایا جائے اور الحاق کے آئینی مصرعت کو متاثر کیے بغیر کشمیر میں شیخ عبداللہ کے لیے کیونکر کوئی حکمرانی جائے جیسے کرنے پر اتفاق رائے ہو۔ شیخ عبداللہ کے بہت قریب تھے۔ اس بات کو لے کر تھا کہ شیخ صاحب کی رہائی ہندوستان کی حکومت کی طرف سے کشمیر کے ساتھ خیر سگالی کا ایک جذبہ ہے مگر یہ اس کا صرف ایک اہم پہلو ہے۔ زیادہ اہم بات اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کے عوام کی، کشمیر کی حیثیت سے متعلق تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا کرنا ہے جو ساری ہندوستانی کمیونٹی نے ایک حصے کے طور پر سیلف گورنمنٹ اور حق خود ارادیت کا مطالبہ کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں شیخ عبداللہ دورہ سرحد کا بھی سے لے ظاہر ہے۔ کرات کا فائدہ ہوا گمان کے بارے میں ہونے کے لیے ابھی مزید کئی برسوں کی ضرورت ہوگی۔

مسئلے کے حل کی تلاش میں شیخ نے اب اپنی کوششوں کو ایک فرد کے جہاں تک محدود رکھنے کی بجائے

نے کہا کہ یہ کارروائی بڑے پیمانے پر تخریبی کارروائیوں کو روکنے کے لیے ضروری تھی جلد ہی متعلقہ وزیر سے عام معافی کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ ۵ جون ۱۹۷۲ء کو ہندوستانی فوج کی دسمبر ۱۹۷۱ء کی مشہور فتح سے جلد ہی شیخ صاحب کو کشمیر اپنے گھر واپس آنے کی اجازت ملی اس وقت شیخ عبداللہ کو کشمیر سے باہر رکھنا بڑی شرمندگی کا باعث ہوتا کیونکہ مسٹر بھٹو کے آخر میں شملہ میں امن کی بات چیت کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

اس وقت تک شیخ عبداللہ کو اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ سکے کے کسی حل کی توقع صرف ہند کے ساتھ براہ راست بات چیت کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے پاکستان اپنے سہارے کھو چکا تھا۔ ۳ جون کو حضرت بل کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ انھوں نے کشمیر کے لیے نشانِ راہ خود مختاری کے بارے میں مرحوم گاندھی کے کسی بھی سائنسدے سے بات کرنے کا پورا پورا اختیار مرزا افضل بیگ کو دے دیا ہے اور انھوں نے دونوں حیثیتوں سے کام کرتے ہوئے ہمیں ایک باوقار مقام حاصل کرنے کی نئی جدوجہد میں مدد کے لیے پاکستان کی دوسری طاقت کی طرف نہ دیکھیں۔ ۲۵ جون کو مقبوضہ کشمیر پاکستان میں ہندوستان کے سامنے "گھٹنے ٹیکنے" کی مذمت میں شیخ عبداللہ کے خلاف مظاہرے ہوئے ظاہر ہے کہ ان مظاہروں کی قیادت ملا کر رہے تھے۔

۲ جولائی ۱۹۷۲ء پیر کے دن علی الصباح دو افراد علی بھٹو اور مسز اندرا گاندھی نے اس دستاویز کے ذریعے جو "شملہ معاہدے" کے نام سے مشہور ہے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ جموں و کشمیر میں ۱۹۷۱ء کی جنگ بندی کے وقت قبضے میں رہنے والی لائن کی جانبین بغیر کسی تعصب کے دونوں فریقوں کی سرحدی تنظیم دی ہوئی حیثیت کا احترام کریں گے۔ کوئی بھی فریق اپنے طور پر یا باہمی اختلافات اور آویزشوں سے قطع نظر اس میں کسی تبدیلی کی کوشش نہیں کرے گا۔ دونوں فریق اس لائن کی خلاف ورزی میں طاقت کے استعمال کی دھمکی سے اجتناب کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اس کا اشتہار نہیں کیا مگر ہندوستان اور پاکستان دونوں نے اس دستاویز کی رو سے کشمیر حتمیاً تقسیم کر دیا۔

شیخ عبداللہ اپنے آپ کو بالکل خاموش تو رکھ سکے مگر وہ جانتے تھے کہ کشمیر کے لیے ایک آزاد حیثیت کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا یہاں سے ۱۹۷۵ء کے کشمیر معاہدے تک صرف وقت کا سوال تھا اس معاہدے کو کرانے میں جن لوگوں نے اہم اور کلیدی رول ادا کیا ان میں مقبول سیاست دان ڈی۔ پی دھر بھی تھے جنھوں نے بنگلہ دیش کے معاملے میں بڑا کامیاب اور اسم کردار ادا کیا تھا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے مسز اندرا گاندھی کو بیسیوں راز ایک تحریر بھیجی جس میں انھوں نے ان باتوں کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جو وہ سمجھتے تھے کہ شیخ عبداللہ سکے کے حل سے

شیخ عبداللہ سے آخری مذاکرات کرنے کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالی گئی تھی وہ مسز گاندھی کی حکومت کے ایک انتہائی ذہین اور مستعد فرد تی پاتھا سارتھی تھے۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۵ کو جیسا کہ شیخ معاہدے کا اعلان کیا گیا "جموں کشمیر انڈین یونین کا ایک حصہ، جس پر بدستور آرٹیکل ۳۷۰ کے تحت حکومت ہوگی ریاست کو آئین سازی کی بقیہ حقوق حاصل ہوں گے کہ یا پارلیامنٹ، ملک کی علاقائی یک جہتی سے متعلق معاملے میں خاص مانے کا اختیار اپنے پاس رکھے گی۔ اختیارات کی تقسیم اس معروضے پر ہوگی کہ مرکز کی ذمہ داری ملک کا تحفظ ہوگا اور ریاست اپنی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہوگی

اس وقت ریاستی کانگریس کی حکومت تھی اور میر قاسم وزیر اعلیٰ تھے میر قاسم ۱۹۵۳ میں شیخ عبداللہ کے خلاف تھے۔ اب وہ شیخ عبداللہ کے لیے راستے سے ہٹنے پر نہ صرف رضی مند بلکہ اس کے مشتاق تھے۔ ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو شیخ عبداللہ کو ایوان کے لیڈر چنے جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف دلایا گیا۔ وہ عہدہ جو ان سے ۱۹۵۳ میں چھین لیا گیا تھا۔ اکیس سال سے زیادہ کی مدت کے بعد۔ یہ واپس ملا۔ اکیس برسوں کی اس مدت میں انھوں نے مصائب کا مقابلہ اس ہمت، وقار اور عزم سے کیا تھا جو ہیرو افراد میں سے اکثر میں ہوتا ہے۔

مگر شاید یہ سفر کا ایک نسبتاً ہموار مرحلہ تھا اسی دن شروع ہوا تھا۔ تامل ناڈو میں ڈی ایم کے نے اس صدی کی چھٹی دہائی میں خود مختاری اور آزادی کے خیالات کو خیر باد کہا تھا۔ جیسٹل کانفرنس نے یہی بات ساتویں دہائی میں کی مگر دونوں ریاستوں میں جمہوریت کے کامیاب تفاوت سے یقین و ایمان کی تصدیق ہوتا تھا۔ عوام آزادی و خود مختاری سے زیادہ اور حقیقت خود اپنی حکومت کا احساس اور اپنے مقدر پر اپنا قابو ہونے کا احساس چاہتے تھے۔ صدیوں کے جاگیر دارانہ نظام اور استعماریت کے بعد عوام کی خواہش اور بیدار روح فطری تھی۔ جنوبی کے بعض علاقوں میں یہ خوف چھایا ہوا تھا کہ وہاں جمہوریت میں، غلبے اور تسلط کی کوئی دوسری شکل جاگیر دارانہ نظام اور استعماریت کا مثل ہو جائے گی مسلم لیگی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ایک جمہوری ہندوستان، ہندو قدر یستوں کی حکومت کا مترادف ہوگا مسلمانوں میں شرکت و شمولیت کا احساس تو جب اوہلی کی پہلی شرط ہے کبھی بیدار نہ ہو سکا ڈی ایم کے کے لیڈروں کو یقین تھا کہ خوب صورت حالات کا طلع جب اتر جائے گا تو اس وقت انڈین یونین ہندی ریاستوں کے غیر ہندی ریاستوں پر غالب اور جنوبی ہندوستان پر مصنوعی ہونے کی شکار ہو جائے گی۔ شیخ عبداللہ کی زیر قیادت میلے والی جیسٹل کانفرنس نے ہندوستان کی بنیادی اقدار سیکولرزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ سوچے بغیر کہ آیا یہ آئیڈیل ازم، اس نسل کے بعد جس نے ہندوستان کو آزادی دلائی،

[illegible] سے محروم کی وجہ سے [illegible] کے [illegible] کے [illegible] ک

کے بجائے جنتا پارٹی خود ہی میدان میں آگئی۔ دوسرے لوگوں نے نعرے لگائے، یہ کتابچے بیچے اور مطالبہ لیا ہے؟ دراں ان کی حیثیت کیا ہے؟ شیخ نے ان سب کو ہوا دی، ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں یہ دکھا دیا انھوں نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ مفتی سعید کی کانگریس (وی) کتنی میں بیٹھ بھی نہیں سکی؟ جولائی ۱۹۸۰ء کو شیخ عبداللہ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا اور پھر ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء تک یعنی اپنے انتقال تک سریر حکومت پر متمکن رہے۔

اقتدار پر آتے ہی شیخ کا پہلے مسائل یہ سری نگر اور دہلی کے مابین تمام شکوک و شبہات دور کیے جائیں اور نہ ہی بچہ گانے والوں کی نسل ہی ختم ہوئی۔ اگرچہ ۱۹۸۰ء کی انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ پی نے شیخ اور متبنیٰ کانفرنس کے خلاف بڑی ترش و تلخ تقریریں کی تھیں مگر اس نے بھی شدت سے محسوس کی کہ شیخ عبداللہ کو ان کی اتنی زبردست کامیابی کے بعد سکون سے رہنے دیا۔ ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں شیخ نے جنتا پارٹی کے خلاف مسز اندرا گاندھی کی اعلانیہ حمایت کی۔ جب وہ خود بھی نہیں کہیں ہیں کے نگران کے بیٹے فاروق عبداللہ نے بھی سرگرمی سے ساتھ شرکت کی۔ جیت کے بعد مسز اندرا گاندھی دوسری بار وزیر اعظم کی حیثیت سے جب پہلی بار سرینگر آئیں تو ان کا زبردست ہوا۔ مگر یہ وہ مسئلہ ہے جسے ملک میں بحال ایسے سیاسی بنتے ہوئے بڑے بڑے بادشاہ ہوتے ہیں بہت ہی مختصر یہ ہے کہ سمجھیں کے کہ اس بات میں بہت وقت میں لگا کر فاروق عبداللہ نے بھی غداری کی نہیں مالوس ہوا تھا محسوس کر لیا۔ ع کر دیا۔

مگر شیخ عبداللہ کو سب سے زیادہ جس بات نے افسردہ خاطر کیا، وہ وہ بدعنوانیاں تھیں جن میں ان کے کچھ ساتھی ملوث ہونے لگے تھے۔ شیخ کے قبیلی ان ہو کر میٹیں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک ایسے شخص کے مالکت کام کیا تھا جس کی بو حاکی جا سکتی تھی۔ وہ ایک ایسے کیس کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ کے رشتہ داروں میں سے ایک نے بدعنوانی میں تعاون دینے سے ایک افسر کی بیماری پر ناراض ہو کر اسے پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی کس کس طرح کوشش کی شیخ نے مذکورہ افسر کو بلایا اور کہا "میا رشتہ دار بھی بیمار ہو جاتے ہیں مگر وہ میرا رشتہ دار ہے آپ اس کی طرف سے میری طرف سے معافی کا خط لکھ دیجیے" ایسے رشتہ داروں کے لیے بہر حال عوت اور حمایت کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہ سکتا شیخ کی نسل اور ان کے بعد آنے والوں کا مورد نہ کرنے ہوئے ہی نے کہا کہ "ہمارے لیڈر اس وقت سیاست دان کہلاتے تھے آج حکومت کی گدیوں پر بیٹھے ہیں وہ بھی سیاست دان کہلاتے ہیں۔ مزا اور تماشہ ہے کہ یہ دونوں جو ایک دوسرے سے

حکومت مندنے ایک ایسی کھڑکی میں جو پالیسیاں مرتب کرنے والوں کے لیے کالپس ہوتی ہے ذرہ برابر بھی خطرہ مول لینے سے انکار کیا یہ اصول کو عملی مسئلہ دینے کا سوال تھا " بادشاہ مرگیا بادشاہ امر رہے " ایک طرف دُنیا کو شیخ عبدالحق کی موت کے بارے میں غلط خبر سنائی گئی، تو دوسری طرف ان کے بیٹے ریاستی کابینہ کے سب سے جونیئر وزیر کو جانشین کی حیثیت سے حلف اٹھوا دیا گیا ابھی تک منصوبہ بندی نے سنوئی اور سیاسی دونوں پہلوؤں کا خیال رکھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ اس سے اگلے دن پرانی مدت کے لیے وزیر مملکت یعنی اس شخص سے حلف تحریر کرایا گیا جس سے حلف لینا تھا شیخ کی موت کی خبر اس رات ساڑھے بارہ بجے ٹیلی ویژن کے ایک خبار کے دفتر ٹیلیفون نے ایک عجیب و غریب سرخی لگائی تھی شیخ کا انتقال ہوگیا ہو گا" (دوسرے تمام خباروں نے زیادہ یقین کے ساتھ خبر شائع کی تھی)

" ارچوہم کجا لسی رد تو داب " (روز حج تو ہے پانی پت کم کر دیا ہے) اوئی بیان اوئی مدراہ فضیلت اس بات و زیر شیخ عبدالحق کے لیے لیا تھا، عوام کے ردعمل سے متاثر نہیں ہوا سکتا تھا دیوار پر تماشائی کا جمعدان لگایا جا رہا تھا ٹوٹ پڑے اس کے بعد سب لوگ وہاں سے وہ لیاقت باغ جلسہ گاہ کی مسجد سے پاس ایک چبارے درخت سے سائے میں جو قبریں تھی وہاں اس کی وہاں زمین تھا۔ اسی صدی کی بیچ اوئی میں شیخ نے حوالہ دیا تھا جس کا ہدی مقام مورد تھا اور جو جس زمانے کے ساتھ ساتھ مسلسل فضا میں گونج رہا تھا۔ شیخ کو یہ کیا تھا عبدالسلام کو دیکھ رہا تھا۔ عورتیں لوٹھے اور جوان مرد وہ جس کا اس عظیم آدمی کی سیاسی شخصیت سے دور کا بھی تعلق رہا تھا وہ اس موقع پر سے حصہ لینے کے لیے موجود تھا۔

وہ عبدالحق جس پر ساری دُنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں، عبدالستار کی بغل میں لیٹا ہوا تھا شیخ عبدالحق عبدالستار کی بغل میں لیٹے ہوئے تھے

شیخ عبدالحق کی موت پر حکومت پاکستان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا

دُوسرا مقدّمہ

کرے میں بابے گھسے لگ گئے۔ تمام کا دھندلا سا چہرہ تھا۔ والد صاحب باپ نے بیٹے سے کہا۔ یہ تاج محمد ہیں۔ ان کے سر پر رکھ دو ہمیں کاموں کا بنا ہوا ہے۔ دنیا کی تمام دولت بھی عبادت اور سنتے کو حق کر دینے سے جیسوں کا مقابلہ کر سکتے ہو میں دعا سے کہتا ہوں کہ وہ ان کو اس سلسلے میں کامیاب کریں۔ یوں ہو پورے سے ہی ہمت پیدا کر دے۔ یہ لوگ جن کی پرورش میں نے کئے فخر فانے سے ہی ہے۔ بھی دنیا کے بہترین سال میں نے جن کے لیے صرف کیے ہیں۔ اتنا کہنے کے بعد شیخ صاحب پڑے درگھے سے سیف آزما کہیں باپ سے بیٹے سے سینے برصغیر کی تاریخ اسلامیہ کا ایک مستقل موڑ لیا۔

۱۹۱۲ء کے سلسلہ تب کے ذیب حکومت اس وقت کی نوابی حیدر فاروق عبداللہ کے ہاتھ میں تھی جب نئی دہلی کی اجازت سے فاروق عبداللہ نے عہدے کا حلف اٹھایا۔ تو تمام کو مسٹر ہاؤس کے سارے چہرے میں اراکین اسمبلی نے جی یہ شاہ کی میش کی ہوئی تجویز کے حق میں ووٹ دے کر نئے وزیر اعلیٰ سے خطاب کی توثیق کی۔ صحیح طریقہ، درحقیقت اس کے برعکس ہوتا۔ کرو دلی، حالشینی کے معاملے میں، رسوم میں بھی کہ وہ وقت حالات میں کرنا چاہتا تھا دلی تو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ تھی کہ مسلم دنیا میں پاکستان کی طرف سے مقامی پاکستان دوست گروہ کی تشکیل میں شیخ عبداللہ کی موت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا، اتحاد کی اور مذاقی اتحاد قبل کے فہم کیے ہوئے، اس موقع سے کہیں فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور پھر پاکستان کو بھی مداخلت کی دعوت مل سکتی تھی۔ تین سنگھ نے ۱۹۸۲ء کے مفتہ وار سنڈے میں، پاکستان دوست تنظیم جماعت اسلامی کے نمائندوں کے قائد سیف الدین قاری کے اسی قول کا حوالہ دیا ہے کہ "شیخ کی موت کے بعد زبردست تبدیلی ہوگی۔ کشمیر کا مسئلہ ہمارے ساتھ سے کہیں کہ ہماری پارٹی اقتدار میں آئے گی۔ ہمیں رکھنے والی واحد پارٹی ہے ایک دفعہ جب ہم (شیخ صاحب) منظر سے اوجھل ہو جائیں تو زبردست تبدیلی وقوع پذیر ہوگی۔"

فاروق عبداللہ کے سامنے ان کے نام تھے۔ ان میں سب سے پہلے تو خفیہ اور کھلے ہوئے علیحدگی پسندوں کے خوابوں کو توڑنا تھا۔ اس کے بعد معمولیات تھیں جن کے ہر وقت باپ کے سایے میں رہنے کی عادی تھیں۔ ظاہر ہے کہ کار کے ساتھ یہ سب کے متعلقات کا ان مسئلہ تھا جو اس وقت ریاستی سیاست میں کی دوسرے کی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ شیخ صاحب کی مقبولیت کشمیر کے لوگوں کو واپس آئے اور اصل وطن میں بسنے کا حق دلا دیا تھا۔ دلی کا خیال تھا کہ یہ پاکستان میں تربیت یافتہ دہشت گردوں اور تخریب کاروں کے لیے ایک دعوت نامہ ہوگا اس لیے اس نے ایسی منظوری نہیں دی۔ عام تاثر یہ تھا کہ غیر یقینی اور تذبذب

[illegible] کے ساتھ ہی ان کے خوبصورت خوں کو ختم کرنے والے
[illegible] بڑھے ہوئے بیٹے جس سے بہت بہت ایک عظیم دیب سے دستے میں بانی گئی کی
[illegible] میں بڑی [illegible] کھڑے ہوئے تھے [illegible] سے دست پھیلا ہوا تھا
[illegible] ہوئے [illegible] ہوئے [illegible] کے [illegible] کو [illegible] کے
[illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

پر راجیو گاندھی کو الوداع کہیں گے بلکہ اس بات کا بھی انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ وہ جو فیصلے لے رہے تھے ان سے بھی دلی کو باخبر رکھا جائے۔ تاکہ کسی قسم کے شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے اور آخر میں، اپنے سمدھی جی ایم شاہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا شاہ نے پیش کش کی کہ اگر فیصلہ نائب وزیر اعلیٰ سادیا جائے تو خلش اور رنجش کے جو دورے ان پر پڑتے رہتے ہیں وہ نہیں پڑیں گے۔ مگر فاروق عبداللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ان پر قابو رہیں رکھیں گے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وزیر اعلیٰ درست تھے۔

دونوں اشخاص کے درمیان سیاسی عناد کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ فاروق عبداللہ نے ایک ملاقات میں مصنف کو بتایا کہ "میرے والد کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ انھوں نے میری ساس کی تنہا جی ایم شاہ سے کر کے سب سے بڑی غلطی کی اور یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی تلافی کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ میرے اور شاہ کے درمیان، عید کی اس وقت ہوئی تھی جب میں پہلی بار صدر ہوا اور آخر میں وزیر بنا دیا گیا۔ یہی وقت تھا جب شاہ نے وجہ سے استعفیٰ دیا۔ میری بہن بہ حال والد سے ملنے ہمارے گھر آتی رہی۔ والد کے انتقال کے بعد بھی وہ ہمدرد سے ملنے کبھی کبھی گھر آتی تھی مگر مجھ سے اس کے بہت کم تعلقات تھے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے اس کے شوہر کے سر سے تاج اتار رہے۔" ہندوستانی جمہوریت کی مسحور کن اور اشخاص کی بنیاد پر ہی ہوئی ریاست میں یہ چیزیں نہ صرف یہ کہ اہمیت رکھتی ہیں بلکہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ اب اوقات ایک ریاست کے مقدر کی فیصل و ثالث بن جاتی ہیں۔

سنجو گاندھی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک وزیر اعظم کے جس کی بنیادی ذمہ داری ملک کی ایک ہستی اور اس کا دفاع ہے اور شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کے، باہمی قابل قبول تعلقات کس طرح استوار رکھیں۔ مزید یہ کہ صدر کی حیثیت سے اس پارٹی کے مفادات کا بھی تحفظ کریں، جو درحقیقت اب ان کے ماں سے کانگریس، صدر، رستہ ہو گئی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں ایک فاروق عبداللہ کی حکومت ہر لحاظ سے کشمیر کے تحفظ اور اس کی سلامتی کے لیے خطرناک تھی مگر کیا یہ سمجھا جائے کہ ریاست کے سامنے صرف یہی ایک واحد خطرہ تھا؟ کیا سنجو گاندھی اپنی پارٹی کو آگے بڑھانے اور ایک جمہوری نظام میں ایک جائز کوشش، انتخابات کو جیتنے کے ایک سیاسی لیڈر کے فطری حق کو چھوڑ سکتی تھیں، یا انھیں اس حق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اس مشکل کا ایک حل شیخ عبداللہ نے تجویز کیا تھا کہ نیشنل کانفرنس جموں و کشمیر میں کانگریس کی ایک اتحادی پارٹی ہو جائے مگر سنجو گاندھی نے اس میں کبھی خطرات دیکھے کہ کانگریس ایک اتحادی پارٹی، قومی یک جہتی و اتحاد کے مقصد سے انحراف کر دیتی ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ کانگریس ریاست میں اپنا ایک وجود قائم رکھے تاکہ کسی کسی صورت میں وہ صورت حالات کو سنبھال لے؟ اسی لیے

یک جانب دراز دھوکا دھڑی ہے جو قوت کے غیر اخلاقی کھیل کی پردہ پوشی کے لیے گھڑا جا رہا ہے

فاروق عبداللہ نے تمام فرقہ پرست جماعتوں پر، وہ چاہے ہندوؤں یا مسلمان، پابندی لگانے کی مانگ شروع کی۔ اس خیال کو خوش آمدید کہنا تو درکنار اس سے کانگریس کے خیال ہی سے جیسے مت ہی ماری گئی ہو۔ انڈیا ٹوڈے اور ایک صحافی مکھر جی کی رائے جنھوں نے کشمیر کے مسئلے کا تفصیلی اور آزادانہ مطالعہ کیا ہے جماعت اسلامی کے بنیادی اور ایک صحافی مکھر جی کی رائے جنھوں نے کشمیر کے مسئلے کا تفصیلی اور آزادانہ مطالعہ کیا ہے جماعت اسلامی کے سیکولر ہونے کا دعویٰ کرنے والی پارٹیاں، کانگریس بھی اور کمیونسٹ بھی ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں سرگرم ہیں۔ یہ کیسی بات ہے راجیو نے ابھی تک فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی لگانے کے فاروق عبداللہ کے مطالبے پر جو شرح حمایت نہیں کی ہے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھوں اور کشمیر میں فاروق عبداللہ کی اس تجویز پر کانگریس (آئی) کے لیڈروں کا اگر بائیں گھٹا جوا ہیں تو دادِ ردِ عمل ہے کانگریس کے ردِ عمل کے کھلنے ہوئے کی وجہ یہ بھی کہ اس نے خود مسلم کانفرنس کی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی خاطر، فرقہ پرست تنظیموں کو استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کیا اور اب بھی وہ اس حربے کو ترک کرنا نہیں چاہتی ہے تحاشات جو آخری دفعہ ۱۹۷۷ء میں ہوئے تھے۔ بہرحال ۱۹۸۳ء میں پھر ہونے ہیں۔

کشمیر کے کانگریسیوں کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ وہ ۱۹۷۵ء سے حکومت سے الگ تھلگ رہے تھے، اور اب جب کہ شیخ عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا اگر ان کے بیٹے کو اپنا اقتدار سونپ ٹرھانے کی اجازت دے دی گئی تو پھر ان کے سامنے بے بسی اور بے کاری کی ایک اور طویل مدت منہ پھاڑے کھڑی تھی اسی لیے وہ صرف الیکشن لڑنے کے ہی نہیں بلکہ کافی نشستیں حاصل کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ وہ مسلم کانفرنس کے ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ شامل کر کے حکومت بنا سکیں۔ (کانگریس خود براہ راست حکومت بنانے کی توقع کبھی نہیں کر سکتی تھی) صرف ایک پرانے اور ہم کانگریسی لیڈر تھے جنھوں نے اس انداز فکر کی مخالفت کی اور وہ تھے سید میر قاسم جنھوں نے شیخ عبداللہ کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر وزارت اعلیٰ کی کرسی چھوڑی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی خارجہ اور کشمیر کی خوش حالی کے لیے ضروری ہے کہ فاروق عبداللہ کو اگر وہ الیکشن میں جیت جائیں تو سیدھی سادی حکومت کے حکومت بنانے کا موقع دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کانفرنس اور کانگریس کا اتحاد چاہتے تھے، ایسا اتحاد جو ان کی ہی پارٹی کی قیمت پر قائم ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس کو قومی معاملات کے وسیع تر نظر اتنی قربانی تو کرنا ہی چاہیے۔ مگر کوئی سُن نہیں رہا تھا۔

۱۸ جون ۱۹۸۳ کو میر قاسم نے مسز اندرا گاندھی کو لکھا۔ "آپ میری اُن کوششوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو

شروع کی تو اس وقت بھی کٹر مذہبی ریاست موروثی نے مسلم کانفرنس کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے رکھی اور جلد کودہ کچھ دنوں کے لیے پاکستانی مقبوضہ کشمیر بھی گئے۔ مگر شیخ عبداللہ نے کشمیر میں وہ طنز و مزاح کا ایک موضوع تھے۔ تیتر کا لقب شیر تھا مولانا کی عافیت کبری پڑ گئی تھی۔ مولانا کے وارث میر واعظ فاروق کا بہت دنوں موقف یہ رہا کہ کشمیر پاکستان کو دے دیا جانا چاہیے مگر ۱۹۷۰ء میں انھوں نے جنتا پارٹی میں شامل ہونے کے لیے اپنے اس خیال کو علانیہ ترک کر دیا ۱۹۳۰ء کے انتخابات سے قبل عبداللہ خاندان سے ان کی حروف دشمنی کی وجہ سے کانگریس نے واعظ کو بہت لالچ دیے اور ان کی بہت ہمت افزائی کی مگر انھوں نے کانگریس کی بجائے فاروق عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر کے سبھوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

فاروق عبداللہ نے اگر کوئی غلطی کی تو وہ اس وقت جب انھوں نے اپنی والدہ جو خاندان میں تھوڑی نہیں چاہتی تھیں، کے زور ڈالنے پر عہدداروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے جی ایم شاہ کے تجویز کیے ہوئے بارہ ناموں کو مان لیا۔ ان ناموں کا اعلان انھوں نے ۲۹۔ اپریل کے ایک بہت بڑے جلسہ عام میں کیا۔ مجمعے کو اس بات پر دھکا سا لگا کہ شاہ کے وفادار ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لوگوں کا ردعمل ظاہر ہوا جب یہ نام سنائے جا رہے تھے۔ اس وقت انھوں نے تو کیا انھوں نے ڈائس پر چپلیں اور جوتے پھینکے۔ آئندہ چل کر یہ غلطی بڑی مہنگی ثابت ہوگی شاہ نے مستقبل کے اپنے ارادوں کو رزمیں نہیں رکھا۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے کوئی کام نہیں کیا بلکہ انھوں نے الیکشن کی مہم جب اپنے عروج پر تھی، اس وقت سری نگر میں کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کی۔ دوسری طرف جموں میں مسز اندرا گاندھی نے بڑے واضح طور پر ہندو موافق جھکاؤ کے ساتھ ایک جارحانہ تخریبی مہم چلائی ان کا یہ جھکاؤ اس مفروضے پر اور صحیح طور پر تھا کہ وہ دی میں انھیں مسلمانوں کے ووٹ ملنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے انھیں میدانی علاقوں کے مسلمانوں کے ووٹوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ فاروق عبداللہ نے اپنے اس باپ کے وارث و جانشین کی حیثیت سے مہم چلائی جو کشمیری مسلمان اور ہندوستانی سیکولرزم دونوں کا محافظ تھا۔ اس کے مدمقابل ہوا "مسلم ہندو مسلم اتحاد" کا نعرہ بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ انھوں نے عوام کو یاد دلایا کہ شیخ عبداللہ نے اپنی وصیت میں کشمیریوں سے اپیل کی ہے کہ "وہ نیشنل کانفرنس کے قلعے" کی ہمیشہ حفاظت کریں ان کے ایک انتخابی کتابچے میں کانگریس کو ہمارا جہری سنگھ کے ساتھ رکھا گیا تھا دونوں نے کشمیر کو "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگایا تھا۔ فاروق عبداللہ نے کہا کہ "ان قوتوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ شیخ عبداللہ نے یہ کام میرے ذمے نہیں کیا تھا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر فاروق عبداللہ کو اسی لمحے روکا نہ گیا تو کل وہ ایک دوسرا شیخ عبداللہ بن جائے گا اور ریاست کے عوام کو،

ریاست کی خود مختاری کی بات نہیں اور کسی مخصوص شخص کے حق پر ہونے کا تو میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں ایک ایسے دیہاتی کی طرح ہوں جو بلگستان میں رہتا تھا۔ جب اس کے بارے میں کہا گیا کہ "کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے؟" تو اس نے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنی بھیڑوں کو اس میدان میں چراتا ہوں اور جب میں دیکھتا ہوں کہ سورج ان کے اوپر ہے تو میں انہیں گاڑی سے پیچھے ہانکتا ہوں اور جب وہ سورج میرے سامنے ہوتا ہے تو میں انہیں آگے چلنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔ میرے پاس یہ کہنے کے لئے کوئی علمی بات نہیں ہے۔" گردوارہ شیخوپورہ میں ہے تو وہ اپنی میٹھی زبان کی وجہ سے بہت جلد ہر دلعزیز ہو جاتے ہیں اور سیلاب زدگان کی مدد سے تقریر کرتے ہیں۔ وہ ان کے کشمیری دوستوں میں بات کرتے ہیں، مذاق کرتے ہیں، چٹکلے سناتے ہیں، ان سے ہنسنے لگتے کرتے ہیں اور پھر یہ بات ہمیشہ ہی کہ وہ سب لوگ ۵ منٹ کے اندر ہی گھر سے جلدی نکلیں اور پارٹی ڈیوٹی پر جائیں؟

کشمیر کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ مشیل فاروس کا تصور بالکل بے بنیاد تھا۔ صادق عبداللہ نے براہ راست کامیابی حاصل کی اگرچہ حلقوں میں کانگریس نے بھی کامیابیاں حاصل کیں۔ جہاں جموں میں بھی نیشنل کانفرنس نے ۱۹۷۷ء میں شیخ عبداللہ نے جتنی نشستیں جیتی تھیں ان سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کی حلقوں میں سے ۲۰ فیصدی ووٹ لے کر ۱۹۷۷ء کے مقابلے میں معتدبہ اضافہ ہے۔ لیکن کانگریس پارٹی کے ساتھ ہے۔ اس کے برعکس کردار کی ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ پارٹی صرف کشمیری مسلمانوں کی نہیں ہے۔

جماعت اسلامی نے ۲۵ امیدوار کھڑے کیے تھے۔ اس کا نعرہ "اسلام" تھا۔ کشمیر میں صدر شاہ یہ خاص قوت ہے اور مشیل فاروس کے بیانر "صدر مسلمانی کہتے" انھوں نے کہا ہے کہ وہ ہندوستان اور دنیا کے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ انھیں ووٹ دیں تاکہ وہ کشمیر میں اسلامی نظام کے نفاذ کو یقینی بنا سکیں۔ لیکن میں جماعت اسلامی کا صفایا ہو گیا۔

مگر کانگریس اپنی شکست تسلیم نہیں کرے گی اس نے وزارت بنانے پر اپنے زور دے کر ڈی کی مدد سے یہ اثر پیدا کیا تھا کہ یہ الیکشن جیتنے جا رہی ہے۔ اس نے انتخابی مہم کے دوران مشیل فاروس سے ۱۹۸۲ء میں ہونے والے انتخابات کے بعد ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ نیشنل کانفرنس کو اس کی کامیابی سے محروم کر دے گی۔ مگر یہ صاف تھا کہ کانگریس کا ووٹ بینک اس کے ساتھ ہی رہے گا۔

لیکن میں نتائج حاصل کرنے کے بعد ہی مگر کانگریس نے ہاریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فاروق

عبداللہ نے کہا کہ کانگریس (انڈیا) سے ہماری لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں ان سے بھی، اور کرناٹک میں، اور ملک کے ہر کونے میں لڑوں گا۔ میری آرزو پوری ہو چکی۔ مگر انھیں ملک کے باقی حصوں میں ابھی جدوجہد کرنی ہے۔ دیکھنا ہے کہ وہ کیا کامیابیاں حاصل کرتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ وہ حزب اختلاف کی ان پارٹیوں سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کریں گے جو ہم پر وقت پڑنے پر یہاں آئیں اور ہمارے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ بیچ میں ہوگلنا اور بھوٹیا لنک جیسے حزب اختلاف کے ہم لیڈروں نے تو جنتا کانفرنس کی انتخابی مہم میں عملی طور پر شرکت کی تھی۔

مسز گاندھی سے مقابلہ (تنازعہ) صحیح معنوں میں ۲۰ مئی ۱۹۸۲ء کو شروع ہوا۔ اسی روز جنوبی ہندوستان کے شہر وجے واڑہ میں، این ٹی راما راؤ نے، جواب فلمی دنیا کے بجائے سیاست میں اس سے تھے سارے ملک کے حزب اختلاف کے لیڈروں کی ایک میٹنگ بلائی۔ میٹنگ کا بظاہر مقصد مرکز اور ریاستوں کے باہمی تعلقات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد شروع کرنا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس امید کی بھی جھلملاتی تھی کہ یہ میٹنگ شاید اگلے عام انتخابات میں کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کی طرف بھی راستہ ہموار کر دے۔ ۲۸ مئی کو، اگرچہ خود ان کی ریاست میں انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی۔ فاروق عبداللہ وجے واڑہ میں موجود تھے۔ مسز اندرا گاندھی نے جو اس وقت اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جموں اور کشمیر میں تھیں سرعام احتجاج کیا کہ فاروق عبداللہ "میرے دشمنوں" سے ہاتھ ملا رہے ہیں ان کے اس احتجاج کے پیچھے ایک حقیقی وجہ تھی، درحقیقت فاروق عبداللہ نے کوئی ایسی بات کہی تھی جو خود ان کے والد صاحب نے کبھی نہیں کہی۔ شیخ عبداللہ نے ان لوگوں کے باہمی مسائل کی نوعیت چاہے جو بھی ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا کہ نہرو خاندان کی باقی تمام ملک میں حمایت کی جانی چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ ایک سے زیادہ بار اکرانا چاہتے تھے۔ نہرو کا خاندان ہندوستان کو رکھ سکتا ہے اگر وہ عبداللہ کے خاندان کو کشمیر دے دے۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۰ء کے دونوں عام انتخابات میں شیخ عبداللہ نے مسز گاندھی کی حمایت کی۔ مگر فاروق عبداللہ کو اپنے انڈوں کے لیے ایک ٹوکری سے زیادہ کی ضرورت تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ وجے واڑہ میں ان تین وزرائے اعلیٰ اور گیارہ اہم پارٹی لیڈروں میں تھے جنھوں نے کانگریس (انڈیا) پر ملک کو تباہ کرنے کا الزام لگایا، اور انھوں نے وہاں یہ وعدہ بھی کیا کہ اس سلسلے کی تیسری میٹنگ سری نگر میں ہوگی جہاں وہ اس کی میزبانی کریں گے۔

کانگریس نے حزب اختلاف کی پارٹیوں کے درمیان اس بڑھتے ہوئے اتحاد کو توڑنے کی بڑی سرگرم

تبدیلی کا مطالبہ کرنے کی۔

واقعے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ سندھ سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجر طلبا کے ایک چھوٹے سے گروہ نے ہیپی کے ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے فائنل کھیل کے لیے اسٹیڈیم کے ایک کونے میں ہندوستان مخالف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے نعرے سنے تو وہ اٹھے اور انھوں نے سو پونے سو میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس واقعے پر ہمارے رشتے نہیں ٹوٹ جاتے۔ ہم بھائی ہیں۔ ہم کہا کرتے ہیں کہ یہ کھاتا ہے اور فاروق عبداللہ ہے اسے تعصب تھے حواسی منفی طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور ان پر قابو پا سکتے تھے۔ سرکاری ذرائع نے یہ تاثر پیدا کرنا چاہا کہ گویا ڈاکٹر عبدالحق خود اس مظاہرے کے سرپرست تھے۔ اس واقعے سے فاروق عبداللہ کی جماعت سلامی سے خلاف تھی اور عدم اعتماد کا ایک مسئلہ پیدا کر دیا۔ تاہم جب ڈاکٹر عبدالحق کی برطرفی کی خبریں سے پاس کبھی اتفاق ہوا کہ وہ ملک کی ایک مہم پر اس کے نمائندے کی حیثیت سے روانہ ہو رہے تھے۔ ان کے علاوہ کی خبر نشر کریں۔ بہرحال جہاز کے پہنچنے سے پہلے فاروق عبداللہ کو برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کا جہاز ابھی بھرنے والی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اگر اندرا گاندھی میں فوجی کارروائی پر مسز گاندھی کو ملک گیر ہمدردی حاصل نہ ہوتی تو کسی کے دماغ میں یہ خیال آتا کہ ایک ہی تیر سے دو اسٹار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب ان بھی ایران شاہ کو سبز جھنڈی دکھائی گئی مگر اس دفعہ تھوڑی سی تدابیر کر لیے گئے تھے۔ فی کے بندوبست اور انتظامات میں کمی کر دیا گیا تھا اور سری نگر میں ان کی مگر کیا مطلب وفاداری کا اظہار کرنے کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے کیا گیا تھا۔

سلامی کیمپ میں عید کا دن ہمیشہ خوشی و مسرت کا دن ہے۔ رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کے مقابلے ایک مہینے کے بعد آنے والا یہ ایک ایسا موقع ہوتا ہے جب مسلمان خوب دل بھر کے عید مناتے ہیں۔ عید کے فضائل و برکات کی ابتدا اس سے ہوتی ہے جس کے ساتھ تمام مسلمان، سماجی حیثیت و رتبے کی تفریق کیے بغیر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھروں پر جاتے ہیں اور خوشی و مسرت کی یہ تقریبات کئی کئی دن تک جاری رہتی ہیں۔ اس دن عداوت اور دھوکہ دہی کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال عید کے دن فاروق عبداللہ نے ۱۲ بجے دوپہر سے ۳ بجے تک عید کے دن تھے۔ ان کے علاوہ ساتھ کا ساتھ بھیجا تھا۔ ایک زیادہ جگہ اور ایک ہی دن میں اتنی ملاقاتیں کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کے ساتھ دوسرے وزیروں اور ساتھیوں سے گلے ملتے ہوئے تھے۔ ان کے ہمنوا بھی ہر جگہ پر موجود تھے۔ ایک مارچ پر سب کچھ ورت کی ہوئی تھی۔ ہر

کو موقع پر بلانا۔

آرمڈ پولیس کے یہاں آنے کے بہت دیر تک خود اسے اس کی خبر نہیں تھی۔

صبح کے کوئی ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ فاروق عبداللہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ چار کاریں گوپی ناتھ پورہ کے مکان کے سامنے سے گذریں جس میں پارٹی چھوڑنے والے اور ایک کانگریسی لیڈر افتخار انصاری تھے جو گورنر سے ملنے جا رہے تھے انھوں نے گورنر کو ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط دیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ کی حمایت سے دست کش ہو رہے ہیں۔ گورنر نے وزیر اعلیٰ کو ساڑھے سات بجے صبح کو فون کیا۔ فاروق عبداللہ سہمت رہ گئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان کی اکثریت وہاں آزمائی جائے جہاں قانون کہتا ہے یعنی اسمبلی میں ۱۹۵۳ء میں ان کے والد نے بھی یہی حق مانگا تھا۔ باپ کی طرح بیٹے کو بھی یہ حق نہیں ملا۔ پھر فاروق عبداللہ الیکشن کرائے جانے کا مطالبہ کیا، اس کا ظاہر ہے کہ کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی شام جی ایم شاہ کو جو باقاعدہ منتخب کی ہوئی اسمبلی کے رکن بھی نہیں تھے) محاذ وکشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف دلا دیا گیا۔

تیرہ کے تیرہ مردوں اور عورتوں کو جنھوں نے اپنی نگہیں بدل لی تھیں، کابینہ درجے کی وزارتیں عطا ہوئیں۔ گورنر نے اعلان کیا کہ نئے وزیر اعلیٰ کو ۳۱ جولائی کو اسمبلی میں اپنی اکثریت کا ثبوت دینا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ اصل سوال یہ نہیں تھا جس بات پر شبہہ تھا وہ یہ تھی کہ دل بدلی مخالف قانون کے مطابق وہ اراکین جنھوں نے فاروق عبداللہ کو چھوڑا ہے، اسمبلی میں ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ گورنر کی دلیل یہ تھی کہ ان لوگوں نے اپنی پارٹی چھوڑی نہیں ہے، یہ تو تقسیم یا علیحدگی کی بات ہے۔ یہ اس قسم کی دلیل تھی جسے جمہوریت بار بار سننے کی تاب نہیں لا سکتی کہ جمہوریت اتنی ہی اپنی روح کے سہارے زندہ رہتی ہے جتنی کہ آئین و قوانین کے سہارے۔

عوام نے دکھا دیا کہ وہ کس کے ساتھ تھے۔ تمام فاضل پولیس والوں کی مدد ضروری تھی۔ سری نگر میں ایک اضطراب تھا۔ مسلسل کرفیو، اور پولیس کی فائرنگ ہی عارضی اور وقتی امن قائم کر سکی۔ ایک بار پھر کشمیر کے جمہوریت پسندوں اور مختلف لیڈروں کے اپنے اختیارات کو استعمال کرنے کے حق کی کڑی آزمائش ہو رہی تھی مگر اس دفعہ کشمیر تنہا نہیں تھا ملک کے ہر کونے میں احتجاج ہوا اور پہیے کے آخر میں جب پارلیمنٹ کا سیشن ہوا تو کئی دن تو اور منگامے رہے جن میں حزب اختلاف کے لیڈروں نے اس کارروائی کے لیے حکومت سے وضاحت طلب کی۔ نئی حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنے اور کشمیریوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے، ملک بھر سے سیاسی خیال کے لیڈر سری نگر آئے۔ ان میں مغربی بنگال کے مارکسی عالم اور دو ریاستوں ڈاکٹر ستوک مترا تھے (پارلیمنٹ میں ہمارے کی نمائندگی کرنے والے سوشلسٹ مقرر جارج فرنانڈیز نے مہاراشٹر سے اپنی آواز اٹھائی۔ شہ دیوار نے جنوب سے،

آج کا کشمیری ایسا سوال پوچھتے ہوئے اس سے زیادہ نہیں کرتا کہ ۱۹۴۷ء میں وہ ہندوستان سے ساتھ شامل ہوا وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا ہندوستان ہے جس کے ساتھ وہ ۱۹۴۷ء میں شامل ہوا تھا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا ہندوستان کا وہ بھی ہے جس کا پاکستان وجود میں آنے سے محض پندرہ دن قبل سری نگر میں آلیوں اور لیڈروں سے استقبال ہوا تھا۔ وہ اقدار ان مردوں اور عورتوں کے لیے کوئی معنی رکھتی ہیں جو دلی میں صاحب اقتدار ہیں۔ نہرو یونیورسٹی کی فیکلٹی ان چیلنجز پر مبنی تھی جس کا نام دستور ہند ہے

"ہم عہد کرتے ہیں کہ خواہ متانت و سنجیدگی سے کام کرنے میں ہمارا کوئی مقصد ہو، سماج داری، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنائیں، ہم سب کے لیے حاصل کریں انصاف، سماجی معاشی اور سیاسی آزادی خیال اظہار عقیدہ دین و عبادت مساوات کا مقام حیثیت و موقع، اور ان سب میں اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تحفظ ہو۔"

کشمیری سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس وعدے کے تحفظ کے لیے پاکستان سے آئے غیر ریاست ملازموں سے لڑے مگر کشمیری سے اس حملہ آور کا تماشا ایک ایسی دلی سے کر لینے کی توقع نہیں کرنا چاہیے جس میں سیکولر عقیدہ مرجھا گیا ہو۔

کشمیر جیسا کہ شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو نے وعدہ کیا تھا کبھی سیکولر اور جمہوری ہندوستان کا حصہ بنے گا یہ سوال یہ ہے کہ ایسے ہندوستان کا تصور اور اس کا خیال اس مسلم اکثریت والی ریاست میں کامیاب ہو گا یا ناکام؟ ۱۲ اگست ۱۹۸۴ء اتوار کے دن صبح صبح یہ خبر پہنچی کہ اولمپکس میں ہاکی کا طلائی تمغہ پاکستان نے حاصل کر لیا ہے تو جوانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے ہرے جھنڈے لہراتے ہوئے ایک جلوس نکالا اور پٹاخے چھوڑے۔ کشمیر میں رائے عامہ کا رجحان کیا ایسے ہی پاکستان دوست افعال کی طرف منعطف ہوا ہے یا ہندوستان کی طرف رہے گا جیسا کہ اب تک رہا ہے۔ اس سب کا زیادہ انحصار آٹھویں دہائی میں جمہوری عمل کی صحت پر ہے۔ اگر انتخابات میں کامیاب ہوتے ہیں مگر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے تو پاکستان اب بھی وہ جنگ جیت سکتا ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہار گیا ہے لیکن اگر کشمیر میں سیلف رول ہو جاتا ہے تو اسلام آباد دور دور راست۔

(۸)

مُجرم۔ جب تک کہ بے گناہی ثابت نہ ہو

۱۹۴۰ء ریاست کی فوجوں کے افسران کو خطاب کرتے وقت دیسی ریاست کی "صد دستان" میں نے مسلمان بھائیوں کے لیے یہ کی ہی صحیحت ہے۔ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ علیہ اس تھمت و تالف سے ہی وفاداری کا اظہار کریں۔ ایک صد واکثریت کی ریاست میں وفاداری پر ان کا مر دس سال صد صد و سنای مسلمانوں کے لیے کیسے قابل قبول تھا۔ اکثر بردالی نصیحت تقریب کا۔ اور نا حق تھی

گر جناح صاحب جیا کر سے دیکھا، کستان نے نظریے کی منظوری کے فوراً بعد جانک ایک بلور ملک کے خیال کے سنیدائی ہو گئے تھے یہ وہی تصور تھا جسے جب مہاتما گاندھی یا پنڈت مو یب نئے وزیر صد دستان کی اساس کی حیثیت سے سامنے رکھتے تھے تو جناح صاحب ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے ۲ جولائی ۱۹۴۰ء کی اپنی مشہور پریس کانفرنس میں جناح صاحب نے کہا "اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی۔ پاکستان میں ان کے مذہب، ان کے عقائد کا مکمل طور پر تحفظ کیا جائے گا۔ ان کی عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ اور آج یقیناً احمدیہ فرقہ کے لوگ بھی جناح صاحب کے پاکستان میں برابر کے شہری ہیں۔ مگر یہ اکیلے جناح صاحب نہیں تھے جو اس پاکستان کا تصور کرنے سے قاصر رہے جو درحقیقت بننے والا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے آخری وزیر اعظم کے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہوئے ۱۲ اگست کو شہید سہروردی نے کہا تھا "ہندوستان کی تقسیم ہو۔ میرے نزدیک ایک تباہی اور تکلیف دہ حادثہ ہی رہے گا۔ مشرقی اور مغرب ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ اس تقسیم سے ہمیں دھکا نہ لگے اور یہ کہ وہ یہ سمجھ نہ پائیں رہیں کہ کبھی نہ کبھی ہم ایک ہو پھر ایک ہو جائیں گے۔ مگر سیاسی تھوس کی تہ سے جو کچھ نکلا ہے اسے ہمیں زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانا ہوگا۔ ... ایک ایسا وقت تو بہر حال آئے گا کہ اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ سرے سے معدوم ہو جائے گا اور ہر حصے کے ہندو اور مسلمان اس حصے کے باسیوں کی طرح اپنے اپنے علاقے کی ترقی اور خوش حالی کے لیے مل کر کام کریں گے۔ اور مشترکہ اقتصادی اور سیاسی اصولوں پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ خدا اس ملک پر پھر ویسے امن اور سکون کی بارش کرے جو حکومت کی قوت سے نہیں بلکہ یہاں کے عوام کی دلی خواہشات سے پیدا ہو۔"

اب ان لوگوں نے امن کی بات شروع کی تھی جنھوں نے ایک تکلیف دہ خانہ جنگی کے شروع کرنے میں مدد کی تھی۔ اے کے فضل حق نے ۱۴ اگست کو کہا تھا۔ "یہ ہماری اپیل اپنے مسلمان بھائیوں سے ہوگی میں ان سے التجا اور درخواست کروں گا کہ اعلان کریں کہ ان کا مذہب اسلام بنیادی طور پر "امن و سلامتی" کا مذہب ہے۔ امن و سلامتی کے لحاظ سے مسلمان ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہیں "وہ منہ جس کی رو سے اسلام

کہتے ہیں کہ مذہب بلحاظ کی جبلت سیاسی مفاد و رسائی روایات کی بنا موجود ہیں یہ جذبہ کبھی بیشتر تک خوابیدہ رہا بھی رہ سکتا ہے لیکن سے ایک لمحے میں بیدار کیا بھی جا سکتا ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک کیمونٹی کے لحاظ سے بے چہرگی کا شکار ہیں۔ اتحاد کی فطری خواہش کی وجہ سے یہ مت سانی تحفظ ہندوستانی مسلمان کے سلام کے دشمنوں کے تخلص کو لگ سیاسی وجود اور ایک لگ قوم سے خلط ملط کر دیا جائے جو یہ تو کبھی تھے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہتے تھے۔"

گہرے بنیاد پرستوں نے جو اس صدی میں سینے آپنے میں آئے ہیں اور شہری متوسط طبقے کے ایک حلقے کی وفاداری ان کو حاصل ہے، اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا کہ یہاں ہندوستانی مسلمان قوم کی بھی کوئی شے ہے ان کے نقطہ نظر سے مسلمان بنی تعریف کے اعتبار سے ایک تارک وطن نہیں بدیسی تھا ہندوستان ایک ہندو ملک تھا اور صرف ہندو ملک ہی ہو سکتا تھا اسی طرح ہندوستانی ثقافت اپنے مکمل روپ میں صرف ہندو ثقافت ہی ہو سکتی تھی۔ مشترکہ ثقافت تخلیق کیا ہوا ایک بُرا عیب تھا جسے بہر حال دور کرنا تھا۔ صرف وہی مذہب ہندوستانی کہلا سکتے تھے جنھوں نے اس ملک میں جنم لیا ہو۔ اسی طرح اگر ایک طرف مُرتدانہ اور سکھ ازم نیم ہندو مذہب کی حیثیت سے قابل قبول تھے تو دوسری طرف اسلام، عیسائیت، یہودیت اور پارسی مذاہب بدیسی عقائد کے نظام تھے۔ ہندو قدرتی طور پر ہندوستان کی مقدس سرزمین کے مالک تھے اور وہ ہمیشہ اسی سرزمین کی اولاد رہے تھے باقی لوگ بیرونی حملہ آور تھے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب کا زمانہ تاریخ کا ایک شاندار زمانہ رہا ہے۔ ذات پات کے نظام کی عطا کی ہوئی پیوستگی اور ہم آہنگی کی خاصیت تھی کہ سماج مستحکم تھا۔ یہ عہد ایک عہد زرّیں تھا عظیم سلطنتوں کا اور غیر معمولی سائنسی کارناموں کا زوال آیا۔ ظالم مسلمان لٹیروں کی آمد سے جنھوں نے بزورِ شمشیر مذہب تبدیل کرائے وہ ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تنازعات شروع کرا دیئے۔ پن چندرا (کمیونل ازم ان ماڈرن انڈیا۔ کاس پبلیشنگ ہاؤس ۱۹۸۴ء) کے الفاظ میں "اس طرح مسلمانوں کی جوشکل ابھری وہ ایک نسلی نظام، جنسی عیش اور لڑاکو کی تھی۔ مسلمانوں کی اس تصویر کو ہندو فرقہ پرستوں نے ڈر کے اُس احساس ملکہ کیفیتی ماحول کو پیدا کرنے میں استعمال کیا جسے عام حالات میں کہ یت نے محسوس نہ کیا ہوتا۔ اور اس کو استعمال کیا گیا مسلمانوں کو تہذیبی حقوق نہ دینے کا مطالبہ کرنے میں۔ اور زمانہ حال میں ظلم و ستم کی تاریخی دیو مالا سے یہ ہندو مسلم اتحاد کے امکانات کو ختم کرنے میں۔ کہ فرقہ پرست خود نے تو اس نظریے کی ترویج کی کہ مسلمانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہندو سماج میں کی گئی تھیں۔ اس

اس قسم کے ہندوؤں میں سے کہ جو بر وطام مسلمانوں کی مثال دیتے ہوئے جنگیز خاں تیمور اور محمود غزنوی کا نام لیتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کتنے لوگ ہوں گے جنھیں یہ معلوم ہوگا کہ چنگیز خاں مسلمان تھا ہی نہیں تیمور کو سمرقند نے بنایا رہنے کا شوق تھا نہ ایشیا میں بھی جہاں ہندوستان کی تاریخ اسلام پھیلا ہوا دیا ہی تھا یہ محمود غزنوی نے بغداد کے خلیفہ کو بھیا نک تباہی کی دھمکی دی تھی

جو کہ ایسی نصف حقیقتیں اور اضافے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں زہر گھول ادا کرتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کے یکارڈوں کو جانچا اور پرکھا جائے۔ نیچے لکھے ہوئے واقعات کی ساری تفصیلات، آرسی موجدار، ایچ سی رے چودھری اور کالی کنکر دتا کی معیاری تصنیف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے ان حضرات کی کتاب دانستہ طور پر چنی ہے کہ ان کی تاویلات اور تشریحات ہندو بنیاد پرستوں کے حق میں ہیں مگر خود ان کے بیان کیے ہوئے حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ پچھلے ایک ہزار برسوں میں بڑی گئی تمام جنگیں، داستانوں کے درجیاں تھیں نہ کہ مذاہب کے مابین۔ یہ سارا کاروبار جائیداد، ذاتی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا باہمی کھیل تھا جس کا نتیجہ کسی ایک خاندان کے عروج و زوال کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ مذہبی جوش و خروش اگر کبھی میدان میں آیا تو اس کا استعمال صرف اس حد تک ہوتا تھا جس حد تک کہ آج ریکروٹمنٹ کی تشکیل میں نسل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے شاید ہی کوئی جنگ ایسی ہی ہو جسے آپ خالص ہندو مسلمان معاملہ قرار دے سکیں۔ مقابل فوجوں میں ہمیشہ خلط ملط ہوتا تھا۔

پہلا مسلمان جو ایک فوج کے ساتھ یہاں آیا وہ ایک نوجوان عرب تھا (بعض کے تذکروں کے مطابق اس کی عمر اس وقت محض سترہ سال تھی) عراق کے گورنر حجاج اور اس کا داماد۔ محمد بن قاسم کو عرب حملہ آوروں پر قصہ کرنے اور قزاقوں کی حمایت ادا کرنے پر سندھ کے برہمن راجہ داہر کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر بیرونی عرب مسلمانوں اور دیسی برہمنوں کے اس اہم مقابلے میں بھی محمد بن قاسم کی طرف سے مدد بجلستو اور وہ صلح کی سردار تھے جو قصیر کے خلاف تھے۔ یہ کہنی ہوئی مذہبی تھی مگر سیدھی سادی حقیقت یہ تھی کہ راجاؤں نے اس لڑائی کو دائیدہ نہ دوست حوں ہی لڑائی سمجھا اور بس۔ عربوں اور ان کے مقامی حلیفوں نے وہ سارا علاقہ فتح کر لیا اور جو آج جنوبی پاکستان ہے یہاں تک کہ ستان میں کراکوٹا ان نے محوب میں چاوکیا ان نے اور مرکز میں پرتی ہار ان سب کی پیش قدمی روک دی کچھ ہی عرصے بعد عربوں نے اپنے آپ کو حلقہ سے الگ کر لیا اور سندھ میں ہی خود مختار سلطنت قائم کر لی جو شمال میں ملتان سے دور سے بڑی حد تک محفوظ رہی

۱۔ "AN ADVANCED HISTORY OF INDIA"

[illegible] مسلمان [illegible] کے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] کی

مست ہو جاتا ہے۔ اس وقت تمام کے راجاؤں میں سب سے زیادہ طاقت ور راجا جے چند رہا ہے جے چند تھا جو قنوج سے حکومت کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ خوب صورت و جوان پرتھوی راج جے چند کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ جو جے چند کو بھارت دیتا ہوا کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ مستند طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے پرتھوی راج چوہان پر حملہ کرنے اور دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے غوری کو دعوت دی تھی۔ اسی واقعہ کی بنیاد پر یہ کہانی بنی ہے کہ محمد وسانی نے پرتھوی راج سے بدلہ لینے کی خاطر ہندو لڑکی کی وجہ سے لڑائی کی۔ یہ ہے مختصر اپنی "پدماوتی مستری" میں بیان کیا ہے۔ ہم حالات یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد غوری نے پرتھوی راج سے لڑنے کے لیے غوری کو دعوت دی تھی۔ اسی واقعہ کی بنیاد پر یہ کہانی بنی ہے کہ محمد وسانی نے پرتھوی راج سے بدلہ لینے کی خاطر ہندو لڑکی کی وجہ سے لڑائی کی۔ یہ ہے مختصر اپنی "پدماوتی مستری" میں بیان کیا ہے۔ ہم حالات یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد غوری کو شہید نے ملتان پر حملہ کرنے میں غزنوی کام محمد غوری کی ہی فتح کا لازمی نتیجہ تھا۔ مزید برآں طالب علموں کو یہ بات نہیں بتائی جاتی ہے۔

محمد غوری اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان پہلی لڑائی دہلی سے ۱۴ میل تھانیسر میں تراوڑی کے مقام پر ہوئی۔ متحدہ راجپوت دستوں کی سربراہی کرتے ہوئے پرتھوی راج کے پاس دو لاکھ گھوڑے اور تین ہاتھی اس کی کمان میں تھے۔ میسرہ اور میمنہ کی معیت میں غوری خود قلب فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے راجپوت غالب ہوئے۔ غوری کو پسپا ہونا پڑا۔ میسرہ اور میمنہ دونوں کو میدان جنگ سے پسپا کر دیا گیا اور پرتھوی راج کے بھائی گوند راے کے ہاتھوں غوری کے زخمی ہونے کی وجہ سے قلب بھی بکھر گیا۔ غالبوں کا جائزہ میں تک پیچھا کیا گیا۔ ان کے گھوڑے زیادہ تیز رفتار تھے اور وہ بھلے سال بھر لڑنے کے لیے بچ گئے۔ اس دفعہ غوری ایک لاکھ بیس ہزار خچروں اور لڑائی کی ایک مختلف منصوبہ بندی کے ساتھ آیا تھا۔ دس بہترین میوں کے چار ڈویژن ہاتھیوں سے بچنے، میمنہ، میسرہ اور قلب پر حملہ کرنے اور کھرے میں لے کر پیشت پر حملہ کرنے پر امور کیے گئے۔ لڑائی صبح کے لوقت شروع ہوئی۔ سربراہ غوری نے حکم دیا کہ سلامتی دینے سے پہلے اس نے اپنے بارہ ہزار تازہ دم اور چنیدہ سپاہیوں کو لے کر قلب پر حملہ کر دیا اور راجپوت فوج کی پرتھوی راج بھاگتے ہوئے دریائے سرسوتی کے قریب پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس طرح دہلی میں مسلمان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

ایک رہا کار، منشی گرسنکی کے نہ کار، عباس اور مسلمان کے لشکر کا جوان مند اسوں کی جوس ہے یہ تھا، خواہ اپنے آپ کو معاش دینے کے سپرد کر دینے پر خود کشی کر لینے کو ترجیح دیتی تھیں۔ قاضی منہاج سراج جوزجانی (۱۲۰۶ء-۱۲۹۶ء) مورخ سلطان شمس الدین التمش کا ہم عصر تھا۔ وہ جلال الدین فیروز کے بہترین مورخوں

۲ جنوری ۱۵۲۶ء کو پار کیا۔ اس وقت دہلی افغان ابراہیم لودھی کے ماتحت تھا۔ ابراہیم لودھی اُس سلسلے کا دارث تھا جس نے ۱۴۵۱ء میں بہلول خاں کی معیت میں حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت تک ابراہیم خاں اپنی حماقتوں کے اعتبار سے ہندوستانی ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نجومیوں سے مشورہ کیا تھا اور انھوں نے اس کی فتح کامیابی کی بشارت دی تھی اگر اس خیال سے کہ کہیں ان کی یہ پیشین گوئی غلط نہ ثابت ہو، ابراہیم کی دستہ سے کہیں دور چلے گئے تھے)

بابر کیم اپریل کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور اپنے دفاع کو حیاسا کی کلیدی حیثیت توپ تھی۔ ابراہیم خاں جس نے بابر کو چار ہو میل تک بغیر کسی حقیقی مزاحمت کے آنے دیا تھا۔ اب ایک لاکھ فوج کے ساتھ آیا۔ ۲۱ اپریل کو جنگ میں شامل ہو گیا۔ افغان بہادر تھے مغلوں کے پاس مہارت تھی، ان کی منصوبہ بندی اور توپ خانے نے فتح دلائی۔ ابراہیم لودھی لڑتے ہوئے مارا گیا۔ ۲۰ اپریل جمعہ کے دن پہلی دفعہ دہلی کی مسجدوں میں عظیم مغل کے نام پر نمازیں ادا کی گئیں۔ مگر افغان کو آخری و قطعی شکست ابھی نہیں دی جا سکی تھی۔ ابراہیم کا بھائی محمود لودھی راجپوتوں کے پاس امداد کا طالب ہو گیا۔ ایک آنکھ، ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ سے محروم، اور زندگی بھر لڑتے بھڑتے رہنے میں آئے ہوئے انشی زخموں کے نشانات لیے ہوئے میواڑ کے رانا سانگا نے اعلان کیا کہ وہ دہلی کے سلطان کی حیثیت سے محمود کے دعوے کی حمایت کرے گا۔ غاصب بابر کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے راجپوتوں کا ایک عظیم اتحادی مورچہ منظم کیا۔ ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا نے ایک ایسی فوج کے ساتھ پیش قدمی شروع کی جس میں مارواڑ، آمبیر، گوالیار، اجمیر اور چندیری کے حکمرانوں کے علاوہ اسی ہزار گھوڑوں اور پانچ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ متعدد چھوٹے راجپوت سردار شامل تھے اور ان سب کے ساتھ ہی محمود لودھی دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ، حسن خاں میواتی بارہ ہزار گھوڑوں اور ارائے سین کالپی تیس ہزار گھوڑوں کے ساتھ شریک تھے۔ آگرہ کے مغرب میں ایک گاؤں کنوا میں جب یہ عظیم لشکر جمع ہونے لگا تو بابر کے جنرل گھبرا گئے۔ یہ ایک بار پھر ایسی گھڑی تھی جس میں ہندوستان کا مستقبل ایک شخص کی قائدانہ صلاحیتوں پر منحصر تھا۔ بابر نے اپنی تمام طاقت لسانی اور سارے جوش و جذبے کو کام میں لاتے ہوئے اپنے جرنیلوں کو بالآخر اس بات پر تیار کر لیا کہ بغیر لڑائی کے دہلی سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو بابر نے راجپوتوں اور افغانوں کی ان فوجوں کو تتر بتر کر دیا اور اُس حکومت کی بنیاد ڈال دی جسے دہلی کی عظیم ترین سلطنت ہونا تھا۔

یہ معاملات تاریخی حقائق کے بیچ گہرائی سے یہ نتیجہ کیسے نکلتا ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ

کمانڈر انچیف ہونے کے باوجود ٹیپو کی فوج کے ایک حصے کی کمان کر رہا تھا۔ ٹیپو کی فوجوں کی صف بندی کا ذکر کرتے ہوئے سرجادوناتھ سرکار لکھتے ہیں: "ٹیپو نے جیسے کہ ہمیشہ ہوتا ہے، خود اپنی فوج کی قیادت کی۔ میر صادق، پورنیا اور دوسرے وزیر قیادت اور تعمیر و ٹوپ خانہ کی نگرانی کرتے رہے۔ میر صادق کے سپرد سب سے نازک مقام پر تھا۔ یہ بات صحیح طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ ٹیپو کی فوج کے ہراول دستے کے کمانڈر کون تھے۔ ہمارے پاس جو ذرائع ہیں ان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہراول دستے کے ایک حصے کی کمان سید غفار کر رہا تھا۔ ہراول دستے کے دوسرے حصے کی کمان کس کے ہاتھ میں تھی، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہراول دستے کے ساتھ ساتھ ٹیپو کی فوج کا ایک دستہ بھی تھا جو جنگ کی ابتدا میں شاہی فوجوں کو تتر بتر کر دیتا تھا۔ درحقیقت یہ دستہ راہ پر تاب خاں کی کمان میں تھا۔ حیدر علی کے زمانے میں بھی یہ دستہ اسی کام پر مامور تھا۔ کرنل میڈوز نے اپنی کتاب "ٹیپو سلطان کی مہمات" (Campaigns of Tippoo Sultan) میں، جو ۱۷۹۹ء میں شائع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ ٹیپو کی فوج کا ایک حصہ ہمیشہ خاص مروت کی حفاظت سے معمل فوج کے مقابلے کی تھی۔ علامہ ہے اس فوج کو تیار رہنے، اس کے لیے مناسب اسلحہ فراہم کرنے اور ہیکر سورپٹھان جو بدنی خاں میں ٹیپو کی طرف سے لڑ رہا تھا جیسے افغانوں کی امداد حاصل کرنے میں خاصہ دقت صرف کیا ہے۔ ہمارا کتاب کے جس باب میں اس کا ذکر ہے اس کا عنوان ہی "مسلمانوں سے ٹیپو کی مدد و خدمت" ہے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں مورخوں نے ٹیپو کو مسلم فرقہ کا خادم ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ قارئین خود کر لیں گے۔

طلوع آفتاب کے تین گھنٹے بعد جنگ شروع ہوئی۔ شاہی فوج کا قلب جس کی کمان سید صاحب کر رہے تھے، سب سے آگے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میر صادق کی کمان میں ٹیپو کی فوج کا دایاں بازو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سید غفار اور علی شریف خاں تھے۔ راہ پر تاب کی فوج میں تین ہزار گھوڑ سوار، دو ہزار پیدل، ایک ہزار توپچی اور جاں باز تیر کمان والے سپاہی تھے۔ ان سپاہیوں نے بھی فوجوں کو قلب میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے علاوہ ٹیپو کی فوج میں سید غفار کے ماتحت ایک دستہ تھا جو ضرورت پڑنے پر ہر جگہ بھیجا جا سکتا تھا۔ اس دستے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ٹیپو کی فوج کے ہر حصے کی مدد کرے۔ راہ پر تاب کے ساتھ ٹیپو کی فوج کا ایک دستہ تھا جس کی کمان افغان حکیم خاں سور کے ہاتھ میں تھی۔ حکیم خاں سور نے جنگ کے دوران میں راہ پر تاب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ راہ پر تاب نے حکیم خاں سور کی زیر قیادت تھوڑے سے فوج کا ایک دستہ بھی تھا اور جب سے جنگ کی ابتدا میں شاہی فوجوں کو تتر بتر کر دیا تھا، درحقیقت یہ دستہ راہ پر تاب کا تھا اور یہ حکیم خاں سور ہی تھا۔ کرنل میڈوز اپنی کتاب "ٹیپو سلطان کی مہمات" (Campaigns of Tippoo Sultan) میں، جو ۱۷۹۹ء میں شائع ہوئی تھی، لکھتے ہیں کہ ٹیپو کی فوج کا ایک حصہ ہمیشہ خاص مروت کی حفاظت سے معمل فوج کے مقابلے کی تھی۔ علامہ ہے اس فوج کو تیار رہنے، اس کے لیے مناسب اسلحہ فراہم کرنے اور ہیکر سورپٹھان جو بدنی خاں میں ٹیپو کی طرف سے لڑ رہا تھا جیسے افغانوں کی امداد حاصل کرنے میں خاصہ دقت صرف کیا ہے۔ ہمارا کتاب کے جس باب میں اس کا ذکر ہے اس کا عنوان ہی "مسلمانوں سے ٹیپو کی مدد و خدمت" ہے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں مورخوں نے ٹیپو کو مسلم فرقہ کا خادم ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ قارئین خود کر لیں گے۔

طلوع آفتاب کے تین گھنٹے بعد جنگ شروع ہوئی۔ شاہی فوج کا قلب جس کی کمان سید صاحب کر رہے تھے، سب سے آگے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میر صادق کی کمان میں ٹیپو کی فوج کا دایاں بازو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سید غفار اور علی شریف خاں تھے۔ راہ پر تاب کی فوج میں تین ہزار گھوڑ سوار، دو ہزار پیدل، ایک ہزار توپچی اور جاں باز تیر کمان والے سپاہی تھے۔ ان سپاہیوں نے بھی فوجوں کو قلب میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے علاوہ ٹیپو کی فوج میں سید غفار کے ماتحت ایک دستہ تھا جو ضرورت پڑنے پر ہر جگہ بھیجا جا سکتا تھا۔ اس دستے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ٹیپو کی فوج کے ہر حصے کی مدد کرے۔ راہ پر تاب کے ساتھ ٹیپو کی فوج کا ایک دستہ بھی تھا جس کی کمان افغان حکیم خاں سور کے ہاتھ میں تھی۔ حکیم خاں سور نے جنگ کے دوران میں راہ پر تاب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ راہ پر تاب نے حکیم خاں سور کی زیر قیادت تھوڑے سے فوج کا ایک دستہ بھی تھا اور جب سے جنگ کی ابتدا میں شاہی فوجوں کو تتر بتر کر دیا تھا، درحقیقت یہ دستہ راہ پر تاب کا تھا اور یہ حکیم خاں سور ہی تھا۔ کرنل میڈوز اپنی کتاب "ٹیپو سلطان کی مہمات" (Campaigns of Tippoo Sultan) میں، جو ۱۷۹۹ء میں شائع ہوئی تھی، لکھتے ہیں کہ ٹیپو کی فوج کا ایک حصہ ہمیشہ خاص مروت کی حفاظت سے معمل فوج کے مقابلے کی تھی۔ علامہ ہے اس فوج کو تیار رہنے، اس کے لیے مناسب اسلحہ فراہم کرنے اور ہیکر سورپٹھان جو بدنی خاں میں ٹیپو کی طرف سے لڑ رہا تھا جیسے افغانوں کی امداد حاصل کرنے میں خاصہ دقت صرف کیا ہے۔ ہمارا کتاب کے جس باب میں اس کا ذکر ہے اس کا عنوان ہی "مسلمانوں سے ٹیپو کی مدد و خدمت" ہے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں مورخوں نے ٹیپو کو مسلم فرقہ کا خادم ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ قارئین خود کر لیں گے۔

... رہ گیا، مگر اس بات کی شہادت کہیں نہیں ملتی کہ انھوں نے بدیسی دشمن کو ... کر تمام مسلمانوں کو ملک سے نکال باہر کرنا چاہا۔ کچھ دہائیوں بعد رنجیت سنگھ نے خالصہ سلطنت قائم کی مگر یہ نو مسلموں کے خلاف تھی اور نہ ہی مسلمانوں کے۔ شیوا جی صحیح معنوں میں ایک ذہین اور طباع آدمی تھے۔ انھوں نے سترھویں صدی میں ایک غالب طاقت بننے کے لیے مراٹھوں کی ہمت افزائی کی۔ مگر معنوں کے خلاف ان کی لڑائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بڑی حد تک بے بنیاد ہی جھگڑوں کا رنگ دے دیا۔ مذہبی اور نسلی تعصب کا کارنامہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے کسی مسلمان حاکم سے ... لڑائیں اورنگ زیب کے آخری برسوں میں پڑھیں کے گولکنڈہ کا سلطان اورنگ زیب کے خلاف اپنے مسلک کے مقصد کے پیش نظر ان کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ دوسرے ... درحقیقت ایک بیباک دشمن تھا جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگوں میں مراٹھوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وقت، قوت اور روپیہ صرف کیا۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مراٹھا معنوں کو جیوت سمجھتے تھے جب اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اکبر نے بغاوت کی اس وقت شیواجی کا رد کا شمبھوجی اس کا فعال ساتھی تھا کیونکہ اس کے لیے شمبھوجی کا شمار اورنگ زیب کے درباری رئوسا میں بھی تھا۔

شیوا جی سے پہلے ... اورنگ زیب کے سلطان کی نوکری میں ایک سپاہی کی حیثیت سے اہم مقام حاصل کر چکا تھا ... اس نے بعض ... کی مدد سے بیجاپور کی ملازمت میں شامل ہو گیا ... 1636ء میں دولت بیجاپور کی ملازمت میں شامل ہوئے ... اس وقت تک بیجاپور کے سلطان اپنی بری فوج میں مراٹھا سپاہیوں کی بھرتی کر چکے تھے۔ یہ مراٹھا سپاہی اپنی بری فوج میں مراٹھا سپاہیوں کے ساتھ بھرتی ہو گئے تھے۔ ان مراٹھا سپاہیوں کی نسل میں سے تھے۔ اپنے باپ کی طرف سے شیوا جی بھونسلے کے مشہور سپہ سالار تھے جو اپنے سلسلے کا نسب اودے پور کے سسودیا حکمرانوں سے ملاتے تھے۔ شیوا جی کی پرورش میں ان کی ماں جیجا بائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے ہمت حوصلہ اور بہادری کی یہ داستانیں سنائیں جو عام معلومات سے زیادہ کے حامل تھے۔ 1646ء میں شیواجی نے تورنا کا قلعہ فتح کیا۔ اس کے قریب ہی توسیع کے لیے ایک اڈے کے طور پر رائگڑھ کا قلعہ بنایا گیا۔ انھوں نے قلعوں کا ایک سلسلہ بنایا جہاں سے بیجاپور کے علاقوں پر اور ایک عظیم سلطنت قائم کرنے کی ... 1656ء تک انھوں نے جاول کے حکمران چندرا راؤ مورے کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح نے ان کی ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کو دوگنا کر دیا۔ اس حاصل میں سے وہ ... معنوں سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے اپنی فوج کو منظم کر سکتے تھے۔ 1659ء میں افضل خاں

1659ء میں ... بیجاپور کے سلطان نے اپنے سب سے افضل خاں

میں کیے ہوئے کہ وہاں تخت پر کون متمکن ہے۔ جلیخ فرمانروا ان کی فوج کے سپہ سالاروں میں مسلمان تھے۔ لیکن محمد شاہ بدی کے خلاف لڑی جانے والی انتہائی اہم پانی پت کی تیسری لڑائی میں مراٹھا توپ خانہ اور سپہ کی قیادت ابراہیم خاں گاردی کر رہا تھا۔ روایت ختم نہیں ہوئی تھی۔

شیوا جی کی فتوحات کی وسعت کی زیادہ اہمیت یہ ہے کہ شیوا جی پہلے ہندو حکمراں تھے جنھوں نے مغل تسلط کو مسلم راجپوت مغل متحدہ فوجوں کے مقابلے میں اپنے وجود کو صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں شکست بھی دی۔ شیوا جی نے یہ سب کچھ ہندو اتحاد اور مساوات کا وہ احساس بیدار کر کے کیا جو ماضی کی ہندو فوجوں میں شاذ ہی نظر آتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے بہت سے مشکل سوالوں میں سے ایک سوال یہ ہے کہ بار بار ایسا کیسے ہوتا تھا کہ چھوٹی فوجیں جن کی سربراہی مسلمان کر رہے ہوتے تھے اور جنھیں مشکل ترین مہموں میں اپنے مرکزوں سے سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنا پڑتی تھی، اتنی حقارت آمیز آسانی کے ساتھ ان فوجوں کی شکست و ریخت کر دیتے تھے جن سے ان کا راستے میں یا بھر دلی میں سامنا ہوتا تھا۔ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں وسنسینٹ اسمتھ ایک جواب فراہم کرتا ہے۔ "ہندوؤں کی حکمت عملی اور طریقۂ کار فرسودہ تھا جن کی بنیاد ان قدیم کتابوں پر تھی جنھوں نے بدیسی حملوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا تھا اور پھر متحدہ ہندوستانی فوجوں کی قیادت کا اتحاد، کم و بیش ہمیشہ، قبائلی فرقہ وارانہ بالادستی کی تفریق کی وجہ سے مشکل ہوتا تھا۔"

(۹)

بھارت ماتا کی جے

میں ذات پات پر عقیدہ ہے عوامی ووٹ کے نقطۂ نظر سے، ہندو بنیاد پرست تنظیمیں بہت کامیاب نہیں ہو سکتی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ملک کا ۸۲٫۲ فی صد حصہ جو ذات پات کو مانتا ہے وہ ووٹ دینے والے ہندوؤں کا ہے۔ اچھوت اور قبائلی ذات پات والے ہندو سماج سے خفا ہیں، ان کی بڑھتی ہوئی اقتصادی استحصال کی بنا پر نہیں ہے سماجی تفریق اتنی زیادہ ہے کہ ملک کے دیہی علاقوں میں انھیں جان بوجھ کر ایک حاشیے پر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ برہمنوں اور ٹھاکروں کے اعلیٰ طبقات سے لے کر بمشکل قابل برداشت درمیانی ذاتوں تک، خود اس نظام میں جو اختلاف اور داخلی اختلافات ہیں وہ کسی سیاست داں کے لیے جو ووٹ حاصل کرنے اور کامیاب ہونے کے لیے کوئی متحدہ گروہ بنانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، بھیانک خواب کی حیثیت رکھتے ہیں سنہ ۷۷ء کے قدیم ہندو سماج" کی دل کشی اور دلربائی درحقیقت اوپر کی چند اعلیٰ ذاتوں تک محدود رہی ہے اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہونا کہ ملک میں سب سے زیادہ بااثر ہندو تنظیم کی قیادت، جو افغانستان سے برما تک ایک ہندو سلطنت کے سبز باغ دکھاتی رہتی ہے، اور جس کے لیڈر گولوالکر اور ساورکر جیسے لوگ ہیں حقیقتاً برہمنوں کی جاگیر ہے۔ یہی ہے رشٹریہ سوئم سیوک سنگھ جو عام طور پر آر ایس ایس کہلاتی ہے۔

آر ایس ایس کا مقصد اور اس کی سمت واضح ہے۔ "یہ مذکورہ پارٹی ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو ملک و قوم پر قبضہ کرنا اور نازی لیڈروں کے نمونے پر ایک تحکمانہ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔" یہ لکھا تھا جن پارٹی کے لیڈر اور ممتاز نظریہ ساز مدھولیمائے نے ۱۰ جون ۱۹۷۹ء کے رسالہ 'ٹنڈے' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں۔ یہ واقعہ ہے کہ دلی میں آر ایس ایس سے اپنے تعلق کو باقاعدہ ختم کرنے پر جنتا حکومت ٹوٹی تھی۔ یہ ۱۹۷۹ء کی بات، درحقیقت بارگشت تھی گاندھی جی کے خیالات کی جس کا حوالہ انھوں نے بہت پہلے کیا تھا گاندھی جی کے سکریٹری پیارے لال کے مطابق، گاندھی جی نے آر ایس ایس کو ایک یک جماعتی نقطۂ نظر رکھنے والی فرقہ پرست پارٹی کہا تھا اور نازیوں اور فاشسٹوں سے اس کی مثال دی تھی اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا تھا جب بیسویں صدی کی بیسویں دہائی میں گاندھی جی کانگریس کو انتہائی عزم کے ساتھ سیکولرزم کی راہ پر لے گئے تھے۔

کیشو مید گیوا بلیرام ہیڈگیوار ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ یہ ناگپور میں کنڈکرتی گاؤں کے ایک برہمن پروہت بلی رام ہیڈگیوار کے تیسرے بیٹے تھے۔ ۱۹۰۲ء تک ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور خاندان کی دیکھ بھال ان کے بڑے بھائی مہادیو نے شروع کی تھی۔ ان کا کبھی کوئی خاص گھر نہیں تھا۔ بڑا بھائی مہیش چھوٹے بھائی

ہو گمنام میں قوم پرستی کے یہ تو پر میڈ گیوارڈ نے بھرا کیے۔ اسی لیے یہ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ ہی رہا۔ آر ایس ایس نے ستمبر ۱۹۲۷ء کے ناگ پور کے صد و سالہ فرقہ وارانہ فسادات میں اپنی کارگزاریوں کی بابرسب سے پہلے ظاہر سے کر ہندوؤں کی "محافظ تنظیم" کا عوامی رتبہ حاصل کیا۔

آزادی کی جدوجہد سے آر ایس ایس نے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ یہ کہ جو شخص اس کی قیادت کر رہا تھا (یعنی گاندھی جی) اس کے لیے سنگھ کے پاس نفرت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شک بھی تھا کہ آر ایس ایس گاندھی جی کی مخالفت میں انگریزوں کی مدد بھی کر رہی ہے۔ آر ایس ایس نے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں اپنی اصل حیثیت اور یا حقیقی مقام حاصل کیا۔ ۱۹۴۵ء تک اس کے دس ہزار والنٹیر تھے اور اس کے پاس سرمایہ بھی اتنا ہو گیا تھا کہ اس نے ایک سال سے کم مدت میں "میڈ گیو" بھون کے نام سے اپنے ہیڈ کوارٹر بھی تعمیر کر لیے۔ تقسیم سے قبل کے ہنگامی زمانے میں، خود حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں اپر مڈل سول سروس میں ایک بڑا آر ایس ایس کا تھا۔ اپر مڈل سول سروس کے زیادہ تر لوگ آکسفورڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کے گریجویٹس تھے۔ آر ایس ایس کو درحقیقت یقین تھا کہ وہ جمہوریت کے وسیلے سے نہیں بلکہ نظام حکومت پر قابو کے ذریعے قوت، اس کی گرفت میں تھی اس کا ہدف اقتدار نہیں اصل تکمیل تھی۔ اور آر ایس ایس کو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ انگریز، حکومت ان کھدر پوشوں کے حوالے کر دیں گے۔ آر ایس ایس کے ایک سابق ممبر دیس راج گوئل اپنی بڑی معلوماتی کتاب "آر ایس ایس" (راد ھاکرشن پرکاش نئی دہلی) میں لکھتے ہیں کہ وہ کادر کی ایک میٹنگ میں موجود تھے جسے میڈ گیوارڈ کے جانشین گرو گولوالکر نے خطاب کیا تھا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد آر ایس ایس کا کیا رول ہوگا؟ تو گول والکر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ "کیا تم کو یقین ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دے گا؟ وہ جن کمزور اور بے وقوف لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دے رہے ہیں وہ اسے دو مہینے بھی نہ سنبھال پائیں گے۔

۱۹۳۹ء میں آر ایس ایس نے اپنے ممبروں کے لیے باقاعدہ طور پر ایک سنسکرت پرارتھنا شروع کی:

"اے مشفق ماتر بھومی میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں،
اے ہندوؤں کی سرزمین! تو نے مجھ کو پیدا کیا، میں تیری پرورش کی،
اے مقدس اور ارجمند سرزمین میں اپنا سارا وجود تیرے لیے وقف کرتا ہوں میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

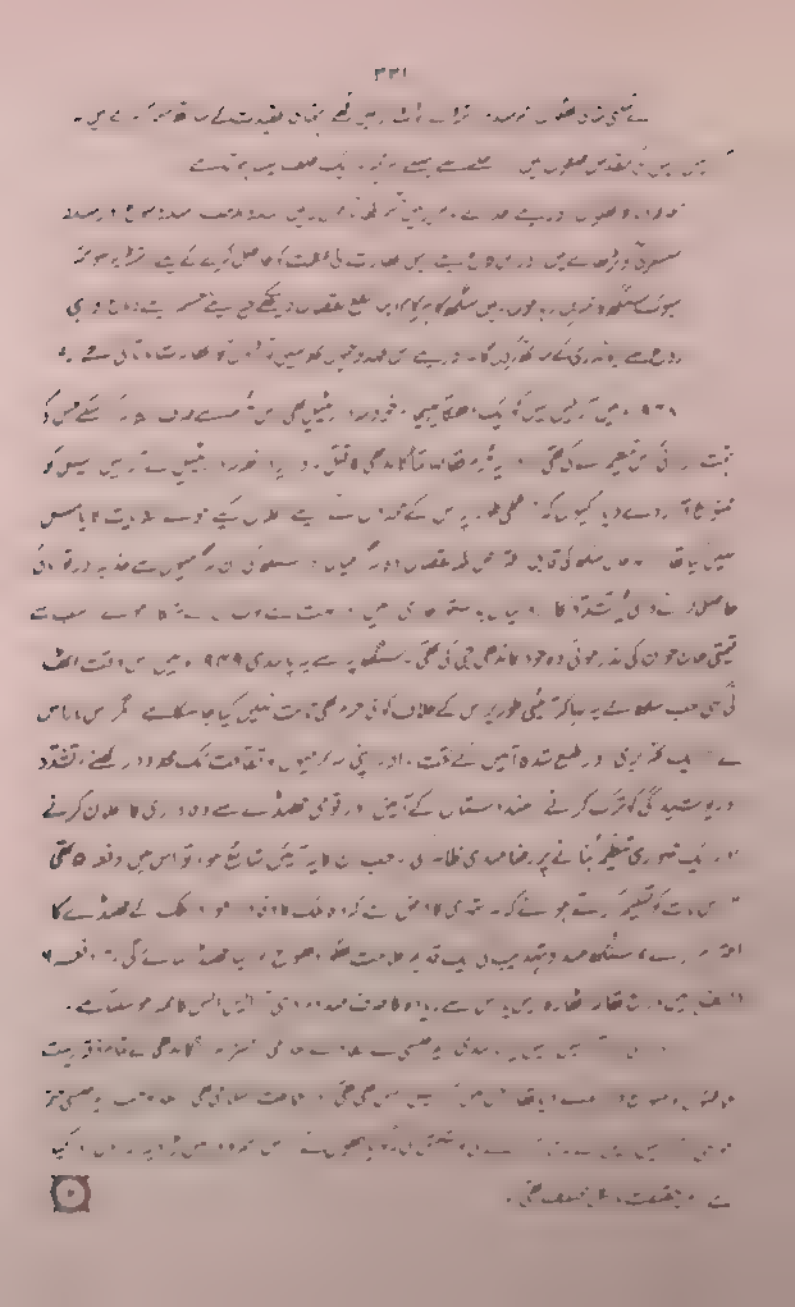

(۱۰)

جمہوریت کا مظہر

جب ۴ جولائی ۱۹۷۵ کو آر ایس ایس پر پابندی لگی ہے اس وقت اس کے سربراہ مدھوکر دتاتریہ دیورس حراست میں تھے۔ جیل سے آر ایس ایس کے سربراہ نے مصالحت کی درخواست شروع کی۔ اس بات کی شہادت اس وقت ملی جب ان خطوط کا انکشاف شروع ہوا جو سربراہ نے ایمرجنسی کے زمانے میں حکومت کو لکھے تھے دیورس نے پہلا خط مسز اندرا گاندھی کو اس کمزور سے بہانے کا سہارا لے کر لکھا کہ وہ ان کی ۱۵ اگست کی تقریر پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ دیورس نے لکھا "آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے قوم سے آپ کے بڑے متوازن خطاب کو میں نے غور سے سنا تھا اسی لیے میں نے آپ کو خط لکھنے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔" خط میں آر ایس ایس کے خاص ثقافتی تنظیم ہونے، سیاست میں کوئی دلچسپی نہ رکھنے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے نیک خواہشات کے علاوہ دل میں کچھ نہ رکھنے پر ایک طول طویل وعظ کے بعد خط کو ختم اس بات پر کیا گیا تھا کہ مسز گاندھی سے شرف ملاقات، دیورس کے لیے انتہائی مسرت اور خوشی کی بات ہوگی۔ ایک دوسرے خط میں مسز اندرا گاندھی کو ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں بدعنوانیاں کرنے کے الزام سے بری کرنے کے سپریم کورٹ کے فیصلے پر مبارک باد دی گئی تھی اور ملک و قوم کی خوش حالی کے لیے آر ایس ایس کے ایک لاکھ والنٹیرز مسز گاندھی کی حمایت میں دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ آر ایس ایس کے اخبار اور رسائل نے مسز گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی توصیف و تعریف کرنا شروع کر دی تھی۔ بعد کو جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں جنتا پارٹی نے کامیابی حاصل کی تو طاہر ہے کہ آر ایس ایس نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ایمرجنسی کے زمانے میں جدوجہد کی اصل سہرا دوسری تنظیم نے نہیں اور کلیدی جگہوں پر اپنے ہمدردوں کو بٹھانے میں جنتا پارٹی کے عہد حکومت میں بڑے موثر طور پر کامیاب ہوئی۔ جھوٹی نظریے نے دل سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے آر ایس ایس دوست سیاست

کے زمیندار طبقے اور ان کے ساتھی جو روکر مٹیں ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ان میں گاؤں میں چھوٹے کاشت کار کھیت مزدور اور ہر حرفہ اور ہنر میں نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے اگرچہ مسلمان شہری علاقوں میں ہمیشہ بہت بڑی تعداد میں رہے ہیں مگر ان میں کوئی قابل ذکر طبقہ کبھی نہیں تھا۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی شہری آبادی میں ۱۲٫۱۶ فی صدی مسلمان تھے اور دیہی آبادی میں ان کا تناسب ۹٫۹۶ فی صدی تھا۔ ملک کی تقسیم جمہوری ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے یک زبردست دھکا تھی۔ گاؤں میں زمینداروں کی سرپرستی معدوم ہو گئی۔ دستکار نئے کارخانوں کا مقابلہ کرنے میں بے چارے کے پاس نہ تو تجارتی صلاحیت تھی اور نہ ہی سرمایہ کی سہولت شہری علاقوں میں منیوں کے سائے اور ایک فیصد روزگار شاہی کے زیر اثر چلنے والی ملازمتوں کی منڈی میں جہاں یوں بھی بہت کم تھا مسلمانوں کو شدید تر مقابلہ اور تفریق کا مدف بنا پڑا۔ دیہی علاقوں میں پرامن بقا کے امکان اگرچہ بہتر تھے مگر کچھ تھے مگر شہری علاقوں خصوصاً چھوٹے قصبوں میں بدکی انتہائی بے رحم اور مقابلہ انتہائی شدید تھا اور مسلمانوں کے سامنے ملازمتوں اور تجارت کے ذریعے اپنے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔ بمبئی بورڈ دا ہمدد کے ساتھ ہونے والے مقابلے نے علی گڑھ، جمشید پور، جبل پور، احمد آباد اور بھیونڈی جیسے چھوٹے اور متوسط شہروں میں بالآخر فرقہ پرستی اور تشدد کا رخ اختیار کر لیا۔ یہ ہنگامے نہ صرف تشدد کے لیے مستقل طور پر سازگار ہو گئے۔ کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے ساحلی علاقوں میں مسلمان سوداگروں کی ایک موقع ہاتھ آیا اور یہ لوگ اس لائسنس کے راج کے روز افزوں کاروبار میں لگ گئے اور ان کی سرپرستی کی دنیا کے مسلمان سیاستدانوں نے کی جو سیاہ اقتصادیات میں آگے آگے تھے۔ ان قصبوں میں جہاں دیہی بورژوازی کے لیے گنجائش بہت کم تھی بہتر پڑھے لکھے مسلمان آرائیس ایس کی طرف گئے جہاں اقتصادی معاملات کو ایک نسبتاً بڑے مقصد کے پردے میں چھپایا جا سکتا تھا جس نے ہندو ہندوستان پر یقین رکھنے والے نوجوانوں کو سیدھے سادے پرولتاریہ کے مقابلے میں ان کی حمایت حاصل کی۔ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ہی سودی تھیلوں کے لیے حکام کی خاموش اور خفیہ امداد و تعاون کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔

جہاں تک ہنر اور ملازمتوں کا تعلق ہے وہ کسی ایک سبب یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر ان کے لیے بند نہیں تھیں۔ اس صورت حال کی ایک وجہ ان کے مخصوص تعلیم کی طرف سے رجحانات تھے جو ایک لیے سماج کے لیے ضروری تھی جو بہت سست رفتار مگر اقتصادیات کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس پر

بار دھرائے جانے والے اور فرسودہ دعووں کے باوجود ہمارے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور یہ ہمارے لیے ایک فعل عبث ہوگا کہ ہم اپنے تحفظ اور اپنی سلامتی کے لیے ان کی طرف دیکھیں۔" سرفہرست تحفظ کا مسئلہ تھا جس کا تعلق شدت پسند اور بھاطور پر ناراض رفیوجیوں اور مقامی ہندوؤں سے تھا۔ گاندھی جی نے متعدد بار یہ کہا کہ وہ یہ دیکھنے کے بجائے کہ ان کا ہندوستان ریسے تشدد کی گرفت میں جکڑا جاتا ہے وہ جان دے دینا پسند کریں گے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے اپنی جان کی قیمت دے دی مگر ان کی موت وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ساری زندگی کوشش کی تھی۔ ان کی اس قربانی نے بلوں پن کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں کو اچھا خاصہ وقفہ مل گیا۔ انھوں نے اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنا شروع کیا مگر اس قوم پرست مسلمان لیڈر، مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے نہ تو وقت ڈھونڈ پائے اور نہ کافی توانائی۔ تین افراد جو مسلمانوں میں از سر نو زندگی پیدا کر سکتے تھے، وہ تھے، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور شیخ عبداللہ۔ شیخ جب اللہ کشمیر میں رہے۔ رفیع احمد قدوائی کا جلد ہی انتقال ہوگیا اور ان کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا آزاد بھی چل بسے۔ کانگریس پارٹی نے ان مسلمانوں کو آگے بڑھانے کی طرف توجہ کی جو اس کی دوست کی ضرورتوں اور مسلمانوں کی امدادی ضرورتوں کے درمیان توازن قائم رکھ سکیں اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ دستور طلب اقتصادی ضرورتوں کو نظر انداز کیا جائے اور تشخص اور مذہبی حقوق کے تحفظ پر توجہ کو مرکوز کیا جائے اسی لیے زور دیا گیا، اپنی ذات پر ہونے والے حملوں سے بچاؤ کے لیے فرقے کی تنظیم پر۔ اس کے مذہبی قوانین کے، مسلم پرسنل لاء کے اور دینی اسکولوں اور اوقاف جیسے اداروں کے تحفظ پر۔ اردو زبان کے تحفظ کا مسئلہ اس حد تک موت اور زیست کا مسئلہ بن گیا کہ شدت پسند مندوؤں نے اس کی تباہی کو اپنا مقصد بنا لیا۔ یہ ضرور ہوا کہ اس عمل میں ایک خوبصورت زبان کو نقصان پہنچ گیا، تعلیم یافتہ اردو بولنے والوں کی طرف سے معمولی تھوڑے سے مسلمان ابھی بھی پاکستان پر نظر جمائے ہوئے تھے اس سلسلے کی تازہ مثال ہے مسلمان کرکٹ کے کھلاڑی آصف اقبال کی ہے جو پاکستان گئے، اور وہاں کی کرکٹ ٹیم کے کپتان ہے۔ انھوں نے اپنے کیریر کی زندگی کا آغاز حیدرآباد کی کرکٹ ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے کیا تھا۔ رفیع احمد قدوائی کے وسط تک پاکستان جانے سے قبل۔ بچی کھچی کانگریس تک کھیلے تھے۔ تقسیم کے بعد سے مسلم عوام، اردو سکولوں کے چکر سے نکل نہیں پائے۔ مولانا آزاد نے ان سے بار بار کہا کہ وہ ہندی کو ایک دشمن زبان نہ سمجھیں بلکہ اسے سیکھیں کہ یہ کرنا ہی کے مفاد میں ہوگا۔ مولانا کی نصیحت پر کسی نے کان نہ دھرا اور انگریزی، اس کے حصول کی خواہش (اگر ہوتی) کے باوجود اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے

اس فرقے کی دسترس سے باہر تھی۔

بنیادی طور پر جمہوریت کی ایک مظہر ہیں، جذب پذیری کی صفت، بھروسہ، قناعت اور پھر ہندوستانی مسلمانوں کی نشوونما اور ترقی بھی وہی راہ بنائے گی جو ہندوستانی جمہوریت اپنائے گی۔"

اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وجود کو متعدد قدم کے خطرات تھے مگر بچ نکلے تھے جس پر ہندوستان کے بقتے کو بھی بدلا جا سکتا تھا وہ ہندو کثریت والی چھوٹی سی جونا گڑھ کی ریاست تھی، اور ایک چالاک مسلمان حکمران تھا جو پاکستان جانا چاہتا تھا۔ آزادی ملنے کے چند مہینوں بعد ہی وہ اپنے کتوں کو ساتھ لے کر (جو بوں کو چھوڑ کر) پاکستان چلا گیا۔ وہاں حیدرآباد کی بڑی ریاست تھی جہاں کی اکثریت مسلمان تھی اور حکمران ایک ہندو اور مسلمان تھا اور جو وہاں کی کانگریس کا قوے درتھا اور پاکستان میں ہونی جہاد ہندوؤں سے لڑنے کے لیے تیار تھے۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے بھی ہی اعلیٰ خواہش ظاہر کر دی حیدرآباد کے پڑوس میں ہی جنوب میں ناگل، ڈھ میں ایک متحد ہندو پسند تحریک شروع ہوئی۔ شمال میں سکھوں نے بھی حکومت اور اپنے ایک وطن کا مطالبہ شروع کیا۔ اور پنجاب کے شمال میں ایک سیکولر ریاست کا وعدہ اس وقت کھوکھلے لگا جب تشکوک و شبہات اور بدنصیبی اور بدقسمتی نے مل کر شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال دیا۔

۱۹۶۳ء میں ناگل لینڈ کے لوگوں نے علیحدگی پسندی کے اپنے خیالات کو چھوڑ دیا، اور ۱۹۶۶ء میں پنجاب ریاست پر خود اس معمول کے ساتھ ریاست حکومت پر آئے کہ ان کی تحریک وہ اس برسے مٹے نہیں ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں تلنگانہ والوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کیا کہ سکھ کثریت والے پنجاب کی تشکیل سے ان کے مسائل حل ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں شیخ عبداللہ نے ہاں کیا کہ کشمیر سے ہندوستان کا الحاق قطعی تھا اور ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان کی ایک ریاست کے منتخب شدہ لیڈر کی حیثیت سے ان کے جسد خاکی پر ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لپٹا ہوا تھا۔

مگر اس صدی کی آٹھویں دہائی تک، سوالات کچھ یہ اٹھا رہے ہیں کہ کشمیر میں، سلف رول کے نظریے کو ایک بار پھر دھکا لگا ہے، پنجاب میں بے مقصدیت اور شرارت نے ایک خطرناک شدت پسند مرحلہ سنگھ بھنڈراں والا کو اس بات کی آزادی بخش دی کہ وہ صرف ملک ہی کو نہیں بلکہ ان سکھوں کو بھی نقصان پہنچائے جنھیں وہ آزاد و خود مختار بنانا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب کہاں؟ کدھر؟ اس کا جواب ملے گا، جمہوریت کے چلنے کے ڈھنگ میں، عوام کے تجربات میں اور اس بات میں کہ آیا ان کے نعتے کو (جیسا کہ پانچویں اور چھٹی

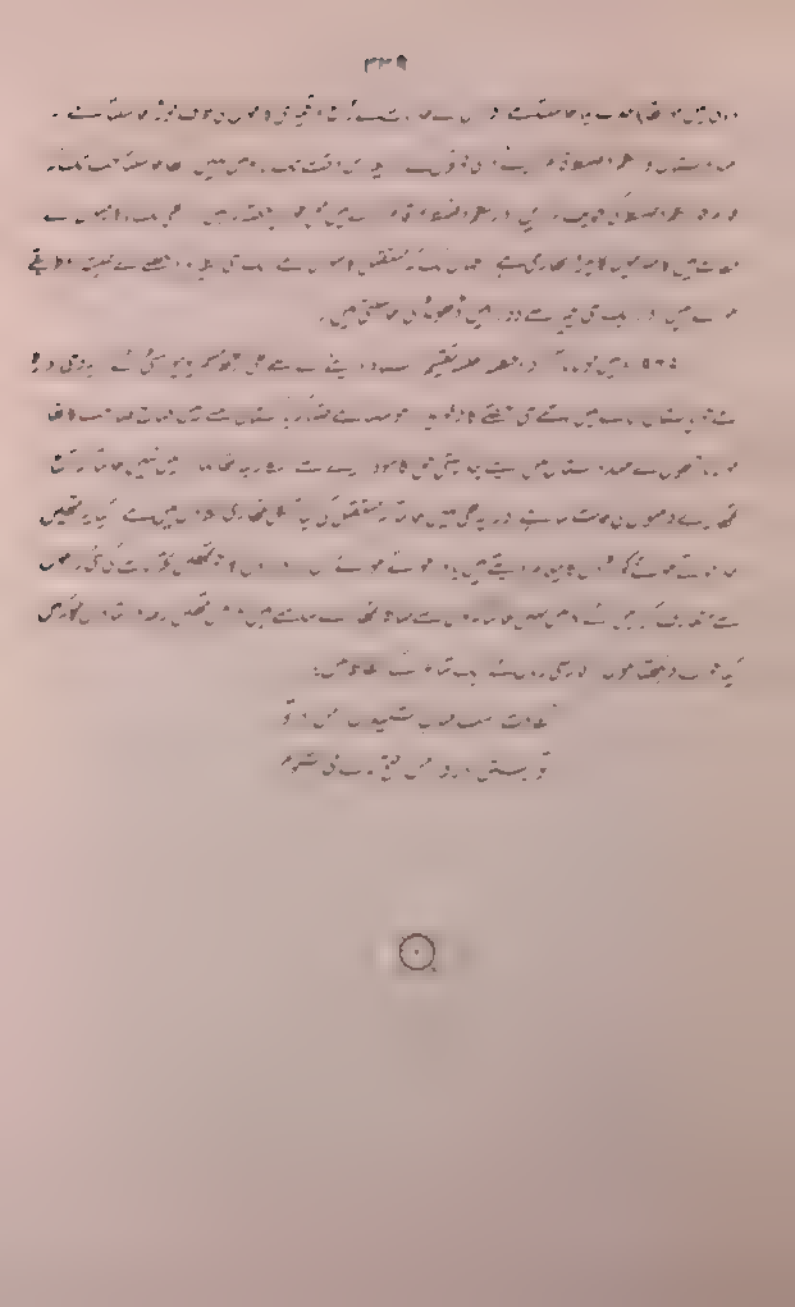

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو ● من موہن کی باتیں ● ● ●

سید محمد حسین بلگرامی
حیدرآباد

وصی احمد بلگرامی کی ایک نادر تحریر

[illegible] ہے [illegible] ۱۹۶۱ء میں [illegible] ہوئی [illegible] ہوا [illegible] قصص [illegible] سید وصی احمد بلگرامی کی ملکیت تھے جن میں سے ایک مخطوطہ [illegible] ہے [illegible] قصص [illegible] ۱۰۰۰ھ [illegible] مختوں کے لیے [illegible] کی لکھوں نے تکمیل [illegible] کی [illegible] تھے [illegible] تھا [illegible] رہا۔

[illegible] کی [illegible] ۱۰۰۰ھ [illegible] مخطوطہ [illegible] [illegible] [illegible]

یادداشت از کاتب ہذا حروف بتاریخ ۳ دسمبر روز دوشنبہ ۱۹۳۴ء
وقت ۹½ بجے شب بمقام ڈالیٹن گنج ضلع پلامو - ۲۴ شعبان ۱۳۵۳ھ

مثنوی ابر کرم مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۸۹ ہجری میں شائع ہوئی -
کسا ایک کرم خوردہ اور نامکمل نسخہ مجکو اپنے گھر کی کتابوں میں ملا -
اسکی دل آویزی نے مجبور کیا کہ اسکو آرہ سے ہم اپنے ساتھ لائیں اور
گم شدہ اوراق کا سراغ لگائیں - چونکہ کتاب کو چھپے ہوئے چونسٹھ ۶۴
برس ہو چکے تھے اور اس قسم کی کتابوں کو کوئی اب پوچھتا نہیں اور
امیر مینائی مرحوم کے باغیات الصالحات میں اسکا کہیں نام بھی نہیں
اسلئے خیال تھا کہ یہ کتاب ناپید ہو چکی -

کل شب کو اسی وقت مولوی سید محمد [illegible] صاحب فاضل گیا
حال مقامی ڈالش گنج بر سے ملنے کو آئے وہ فرمانے لگے کہ مدرجہ [illegible]
امیر مینائی نے صفائی زبان میں داغ کا تتبع کیا۔ مجھے کہنا یہ
غلط خیال ہے۔ اور ثبوت میں یہی مثنوی پیش کی اور جا بجا سے
پڑھ کر سنائیں کہ دیکھئے کیسی صفائی کو کہتے ہیں۔
آج کچہری میں مولوی سید محمد یوسف صاحب [illegible]
ساکن سہسرام ضلع شاہ آباد تعاقبہ پر سے ملنے آئے اور کچھ ذکر میں یہ
مجھے آنریبل سید حسن بریز ساکن چوک ضلع پٹنہ اور گورنمنٹ عربیہ
کے متعلق یہ کہا کہ وہ سنی ہیں اور قرینہ یہ ہے کہ حاجی کی امت سے
اور مختصر اللہ صاحب کتاب شائع کی ہے۔ اس پر جناب موصوف نے فرمایا
کہ یہ [illegible] اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس سے حب کتاب ہے اور کس سے [illegible]
اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ یہ امیر مینائی نے ہی مثنوی پر [illegible]
کہا ہے۔ فرمایا ہے۔ مجھے وہ مجلہ جس کی اجازت سے دی اور پڑھا
اور سنی کہا کہ کیا وہ مثنوی آپ کے پاس ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ
ہاں ہے اور یہیں ہے۔ مجھے کہا کہ للہ اسکو دکھا دیجئے۔ انھوں نے
کہا کہ وہ مثنوی مجھے اپنے بچپن میں اپنی نانی صاحبہ کے پاس دیکھی تھی۔

اوسکے بعد پھر کہیں نہیں دیکھی - بیس چار سال ہوئے کہ اتفاقیہ کلکتہ میں
ایک کتب فروش کے یہاں پرانی کتابوں میں یہ مثنوی بھی دیکھی -
ہمنے خرید لی چنانچہ وہ مثنوی ہمرے ساتھ ہے - ہمنے کہا کہ ہم اپنا چپراسی
آپ کے ساتھ کر دیتے ہیں - ہمکو کتاب بھیج دیجئے - ہم گم شدہ اوراق کی
نقل لیکر آپکو واپس کر دینگے - چنانچہ جناب موصوف نے مثنوی ہمکو
بھیج دی ہے اور ہمنے اوسکی نقل لیکے یہہ یادداشت لکھ دی - غور کرنیکی

بات یہہ ہے کہ جو بندہ یا بندہ - اللہ اپنے بندوں کی خواہش
پوری کرنے پر آتا ہے تو یوں پوری کر دیتا ہے کہ مولوی سید محمد یوسف علی
صاحب کو دھکے مار کر بدھی اٹھ بلگرامی کے پاس بھیج دیتا ہے
اور پھر روز محشر اور حساب کتاب کا تذکرہ اوسکی زبان سے
کراتا ہے - اور پھر مولوی سید محمد یوسف علی صاحب سے کہتا ہے کہ
تمام دنیا کو بھول جاؤ اور دنیا کی تمام کتابوں کو بھول جاؤ -
اسوقت صرف مثنوی ابر کرم کا نام لو - اللہ رے انتظام
اور پیش بندی ! سچ کہا ہے سعدی شیرازی نے سے

دیدم گل تازہ چند دستہ بر گنبدے از گیاہ بستہ

گفتم - چہ بُود گیاہ ناچیز تا در صف گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش صحبت نکند کرم فراموش
گر نیست جمال و رنگ و بویم آخر نہ گیاہِ باغ او ہم
با آنکہ بضاعتے ندارم سرمایۂ طاعتے ندارم
من بندۂ عفرت کریمم پروردۂ نعمت قدیمم
او چارۂ کارِ بندہ داند چوں ہیچ وسیلتش نماند

یعنی کسی گنبد پر ایک گھاس اُگا تھا - دیکھنے والے نے گھاس سے کہا کہ تیری کس شمار میں گنتی ہے؟ اپنے کو دیکھ - اور پھولوں کو دیکھ - اور پھولوں کی صف میں اپنا بیٹھنا دیکھ! گھاس نے آب دیدہ ہوکر کہا کہ خاموش! تم نے مجھ کو بھی پہچانا ہے - یہ صحیح ہے کہ میرے پاس رنگ ہے - بُو ہے - حُسن ہے - اور یہ بھی صحیح ہے کہ میرے پاس کوئی پونجی ہے - سرمایہ ہے - اطاعت کیلئے کسی نہ کسی پونجی کی ضرورت ہوتی ہے - تو میرا نام ہی گھاس ہے جس سے بڑھکر ناچیز شاید ہی کوئی ہو - مگر بات یہ ہے کہ ہم اوسی باغ کی مولی ہیں جس باغ میں پھول اپنی بہار دکھلاتے ہیں - اور مجھ کو اوسکی کنیزی کا فخر ہے جو بہت

بڑا کریم ہے اور جسکی نعمتوں نے ہمیشہ ہری پرورش کی ہے۔
ہمارے مالک کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور کنیزوں
کو دیکھتا ہے کہ ان غریبوں کا کوئی وسیلہ نہیں۔ تو وہ
غیب سے وسیلہ پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اوس نے جب دیکھا کہ
گل باغ میں بادشاہی کر رہے ہیں اور گھاس پاؤں کے نیچے
روندی جا رہی ہے تو اوس مسبب الاسباب نے گھاس کو
عروج دینے اور گلاب کا سر جھکانے کیلئے ایک شگوفہ چھوڑ دیا۔
شگوفہ یہ کہ پھولوں کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کانٹے کو
کوئی گلدستہ بنا کر اپنے پاس رکھتا اور میرے حسن و جمال اور
رنگ و بو کا نظارہ کرتا۔ پھولوں کے دل میں یہ خواہش پیدا
ہوئی تو سوال یہ چھڑ گیا کہ گلدستہ بندھے تو کس طرح بندھے۔
ربڑ کا تاگہ باوجود اپنی خوبیوں کے پھولوں کیلئے پھانسی کی رسی
ہے۔ سونے اور چاندی کا تار کتنا ہی باریک اور ہلکا ہو پھولوں کو
ذبح کر ڈالے گا۔ آسمان اور زمین کے بیچ میں کوئی ایسی چیز
نہیں ہے جس سے پھولوں کا گلدستہ باندھا جا سکے۔ الا اوس

گھاس کے جو اینک پامال ہونے کیلئے وقف تھی -

چنانچہ اللہ نے گھاس کو اسی بہانہ سے اور سنی سنہ سے پھولوں کی صف میں بیونچادیا - اور اب بادشاہ سلامت اپنے غلاموں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور در بند ہو سکتے - اللہ جب مشکل آسان کرنا چاہتا ہے تو یوں آسان کرتا ہے -

کس نے کہا تھا کہ امیر مینائی کی مثنوی [illegible] کا نسخہ سہسرام جائے اور مولوی حکیم محمد یوسف علی صاحب کی نانی اوسکو پڑھا کریں - کس نے کہا تھا کہ حکیم محمد یوسف علی اپنے بچپن میں اوسکو دیکھیں - اور پھر پچاس برس کے بعد ایک کتب فروش کی دکان میں اوسی کتاب کو دیکھیں - اور کس نے کہا تھا کہ وہ اوس کو خرید بھی لیں - اور خریدی تھی تو پھر اون سے کس نے کہا تھا کہ ڈاسن گنج آنے وقت زنانہ بھر کی کتابوں کو چھوڑ کر وہی کتاب سہسرام سے لائیں - اور لائے بھی تھے تو اون سے کہنے کہا تھا کہ آج ہم سے ملنے بھی آئیں - اور آئے بھی تھے تو اون سے کہنے کہا تھا کہ دنیا جہان کی کتابوں کا تذکرہ چھوڑ کر صرف

اسی کتاب کا نام ہے:

اسکو کہتے ہیں بندہ نوازی اور مشکل کشائی - عالم الغیب آج پچاس برس پہلے سے یعنی میری پیدائش کے پہلے سے سامان کر رہا تھا اور برابر کرتا رہا محض اسلئے کہ آج کے دن مثنوی ابرکرم کے پانچ گم شدہ صفحوں کی زیارت ہمکو نصیب ہوجائے اور اوسکی نقل ہم لے سکیں - خدا کرے ابرکرم ہمیشہ سر پر اسیطرح عالم نزع اور صف محشر میں بھی موتی برسائے - شگون اچھا ہے - آمین!

سید وصی احمد بلگرامی

جہانِ سرسید

• پریم چند سرسید کے عہد علیگڑھ میں

—— مکتوب پریم چند، ۱۹۳۴ء

• سرسید پر پریم چند کا ایک مضمون

—— پریم چند کی کہانیوں کے درشن سے

پریم چند سرسیّد کے عہد علی گڑھ میں

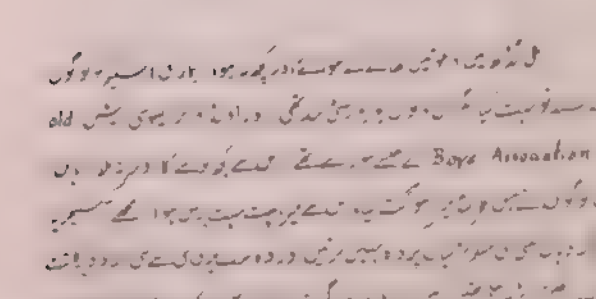

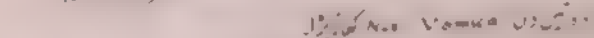

پریم چند

سرسید پر پریم چند کا ایک مضمون

کیا بہ حیثیت مدبر، کیا بہ حیثیت مصنف، کیا بہ حیثیت مذہبی پیشوا اور مصلح، اور کیا بہ حیثیت خادم قوم، سرسید احمد کو جو شہرت دوام حاصل ہے وہ ہندوستان کے دیگر اسلام میں شاید ہی کسی بزرگ کو حاصل ہو۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ہم اس بزرگ کے سوانح زندگی کو غور سے مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ ان میں وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بدولت وہ اس قدر اعزاز و امتیاز حاصل کر سکے اور قوم کی اتنی خدمت کر سکے۔ اُن کی انگریزی استعداد بہت کم تھی، وہ گھر کے مال دار نہ تھے قوم میں بھی اُن کے حامیوں کی تعداد اُن کے مخالفوں سے زیادہ نہ تھی لیکن باوجود ان سوانحات کے اُنھوں نے دنیا، علم و ادب اور دنیا عمل میں لافانی یادگاریں چھوڑیں۔ یہ محض خدمت قوم کا جوش تھا جس نے ساری دشواریوں پر فتح پائی۔

سید احمد مراکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی اُن کے قوائے جسمانی غیر معمولی طور پر مضبوط تھے لیکن ذہنی اعتبار سے اُن کا شمار عام طلبا میں تھا۔ اُس وقت کون یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ لڑکا اپنے ملک اور قوم کے لئے باعث فخر ہوگا۔ اُن کی تعلیم بھی عام مسلمان بچوں کی طرح قرآن شریف سے شروع ہوئی۔ اُن کی والدہ ایک شریف پردہ نشین خاتون تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی شریف

گھروں میں بچوں کی تعلیم اتالیقوں ہی سے ہوتی تھی آج یورپ میں مدرسہ کی تعلیم کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کی بنیاد اسی طریقہ پر ہے۔ اس طریقہ تعلیم کے باعث وہ خاندان جو اتالیقوں کی تعلیم کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اپنے بچوں کو تعلیم دلانے لگے۔

سید احمد خاں نے قرآن ختم کرنے کے بعد فارسی اور عربی شروع کی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انھوں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ مگر کتابوں کے مطالعہ کا شوق انھیں مدت العمر رہا۔ اس وقت دہلی کی سلطنت کا صرف ایک نام و نشان رہ گیا تھا۔ بادشاہ قلعہ دہلی میں کسی سجادہ نشین کی طرح رہتا تھا اور انگریزی سرکار کا وظیفہ خوار تھا۔ سید اکبر اور اکبر کی اولاد اب قریب قریب دہلی میں قید تھی سید احمد کے والد شاہی دربار میں ملازم تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد تنخواہ بند ہو گئی اور سید احمد خاں کو معاش کی فکر پیدا ہوئی۔ انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت قبول کر لی اور ۱۸۳۷ء میں منشی اگزیکٹ کے نائب منشی مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے اتنی جانفشانی سے کام کیا کہ دو ہی سال میں ان کی ترقی منصفی کے عہدہ پر ہو گئی اور مین پوری میں تعینات کئے گئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں قدیم شاہی عمارتوں کے حالات بڑی تفصیل اور تحقیق سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ تصنیف زبان اردو کے کلاسک میں شمار ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سید احمد خاں بجنور میں منصف تھے۔ یہ وہ پرآشوب زمانہ تھا جب کہ انگریز افسر اور ان کی بیویاں اور بچے باغیوں کے خوف سے جائے امن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ باغی کمال بیدردی سے جس انگریز کو پاتے قتل کر ڈالتے تھے۔ اس وقت باغیوں کی مرضی کے خلاف ولی تمام کرنا خود اپنی جان خطرہ میں ڈالنا تھا۔ لیکن سید احمد خاں نے

اس وقت بھی حق کی حمایت سے دریغ نہ کیا اور مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہوئے جو انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ ان کی کوشش سے کتنے ہی انگریزوں کی جان بچی۔ باغیوں کو ان پر شک ہوا۔ انھوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں طرح طرح کی دھمکیاں دیں یہاں تک کہ ان کا مکان ان سے جبراً خالی کرا لیا اور ان کا اثاثہ بھی لوٹ لیا۔ سید احمد خاں نے استقلال کے ساتھ یہ ساری مصیبتیں جھیلیں مگر انھیں پناہ نہ دی تھی انھیں باغیوں کے حوالے نہ کیا جب غدر فرو ہو گیا اور سرکار کا ایک پرزہ دوبارہ تسلط ہوا تو باغیوں کے جرم کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ سید احمد خاں اس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ اس وقت ان کا یہ اندیشہ تھا کہ گنہگاروں کے ساتھ بے گناہ نہ پس جائیں۔ حملہ کرنے والوں کے ساتھ اپنی محافظت کے لئے شمشیر بکف ہونے والے اشخاص پر بھی عتاب نازل ہو جائے۔ سید احمد اس نیک ارادہ سے کمیٹی میں شریک ہوئے کہ حتی الامکان بیگناہوں کی حفاظت کریں۔ ذاتی مفاد یا کسی صیغہ کی انھیں مطلق تمنا نہ تھی۔ چنانچہ جب ایک باغی مسلمان رئیس کی جائداد کنیہ ضبط کرنی گئی اور سرکار نے اسے سید احمد خاں کو ان کی خدمات کے صلہ میں دینا چاہا تو انھوں نے اسے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ ایک مصیبت زدہ بھائی کی تباہی سے مستفید ہونا انکی باحمیت اسلامی فطرت نے گوارا نہ کیا۔

دو سال بعد سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" نامی ایک رسالہ شائع کیا۔ اس میں انھوں نے دلائل اور واقعات سے ثابت کیا کہ یہ غدر ملکی بغاوت نہ تھی، نہ جنگ آزادی، نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی بدول ملکی تھی اور وہ بھی بوجہ جہالت اور توہمات۔ چونکہ

[illegible] یہ خیال تھا کہ [illegible] مسلمان [illegible]
[illegible] یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے [illegible]
[illegible] کوئی تک نہیں کہ سید احمد خاں کو [illegible]
[illegible] سے [illegible] اور
جاوید [illegible] ان کی خیر خواہی [illegible]
[illegible] وہ دل پر [illegible] سے غور کیا اور جو [illegible]
[illegible] ان سے دور کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ سید احمد خاں کی اس [illegible]
کی ان لفظوں میں تعریف کی جاسکتی ہے۔ جس زمانہ میں کہ سرکار انگلشیہ کی
جانب دل تھی اور کسی کی زبان کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، یہ بغاوت کا شعلہ کیا جانے لگے اس وقت گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کچھ
کرنا اور سکی بے عنوانیوں کا پردہ فاش کرنا بیشک بہت بڑی اور قومی خدمت تھی۔

سید احمد خاں کو جو خدمت عطا ہوئی تھی اسے دل و جان سے انجام دیتے تھے وہ اس مقولہ کے پابند تھے کہ جو کام کرنا ہو اسے دل سے کرنا چاہئے۔ بیدلی سے یا بیگانہ سمجھکر وہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔ وہ مراد آباد میں تھے جب اسباب بارس سے فصل تباہ ہوئی اور ملک میں قحط پڑگیا۔ سرکار وہاں ایک شفاخانہ کھولا اور اس کا انتظام سید احمد خاں کے سپرد کیا۔ اس وقت جتنی تندہی سے انھوں نے قحط زدوں کی امداد کی پردہ نشین مستورات اور سفید پوش معززین کی جس [illegible] اور ہمدردی کے ساتھ دستگیری کی وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کسی فرقہ یا مذہب کا کوئی کیوں نہ ہو ان کی ہمدردی سب کے ساتھ یکساں تھی۔

آج کل تو مذہبی مباحثوں کا زور کچھ کم ہو گیا ہے لیکن اُس زمانہ میں عیسائی مشنری عیسائیت کی منادی کے جوش میں ہندو اور مسلمان مذہب پر علانیہ اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ اُس وقت علما اور پنڈتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مذہبی احکام اور روایتوں کی معقولیت کے ساتھ تشریح کر سکیں اور الفاظ کے پردہ میں چھپے ہوئے معانی کو واضح کر سکیں اس لئے عیسائی مشنریوں کے سامنے وہ لاجواب ہو جاتے تھے اور اس کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑتا تھا۔ سید احمد خاں نے مشنریوں کے اس حملہ سے اسلام کو بچانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ عیسائیوں کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جائے اور قرآن اور بائبل کا موازنہ کر کے دکھایا جائے کہ دونوں کتابوں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ اسی ارادہ سے اُنھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی مگر یہ کتاب پوری نہ ہو سکی۔ لیکن ملازمت سے پنشن لینے کے بعد جب اُنھیں زیادہ یکسوئی ہوئی تو اُنھوں نے اپنی اس خیال کو اپنی معرکۃ الآرا تصنیف تفسیر القرآن کے ذریعہ پورا کیا۔ اسلامی تعلیمات پر فلسفہ سے پیدا ہونے والے اعتراضات کے اُنھوں نے بڑی تحقیق سے جواب دئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی عام تعلیم نہ ہونے کے باعث عام مذہبی احکام اور شریعت کو آنکھ بند کر کے مانتے آئے تھے۔ ان احکام کی معقول تشریح وہ کیا کرتے۔ اُن کے دل میں شکوک ہی نہ پیدا ہوتے تھے۔ کیونکہ شکوک تو تعلیم اور تفتیش کی برکات ہیں۔ وہ لوگ بزرگوں کی تقلید میں ہی خوش تھے یہ مذہب محض ایک رسمی اور روایتی چیز ہو گئی تھی۔ گویا جسم سے جان نکل گئی ہو۔ یہی باعث ہے کہ ہندو اور مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے مذہب سے بے اعتقادی

ہوئے تھی۔ مغربی تعلیم کے ابتدائی دور میں شدت سے تعلیم یافتہ ہندو عیسائی ہوئے۔ مغرب سے ہر موسم میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑتی ضرور معلوم ہوتی جو عیسائیت کو ہندوستان پر قابو ہو اور اس میں ہر سب ہی کمزوریاں اور خرابیاں شامل ہوں جو ہندوؤں کو عیسائی ہونے سے روکتی تھیں۔ اس نئے فرقہ کا نام برہمو سماج رکھا گیا۔ برہمو سماج میں سے ذات پات بالکل اٹھ گئے تھے۔ ہندوستان کی پرانی اور نئی ہر دو قسم کی رسوم جنہیں عیسائیوں تک نے خرافات کہہ کر نکال دیا تھا یہاں تک کہ عبادت کا طریقہ بھی تبدیل کر دیا گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فرقہ نے ہندوؤں میں عیسائیت کے سیلاب کو بہت کچھ روک دیا۔ اس کے بعد بعد سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی جسنے قرون ہندیہ میں تعدد ازدواج کا جو برہمو سماج سے مشترک میں کیا تھا۔ تفسیر قرآن بھی کسی زاویہ سے لکھی گئی تاکہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی جانب سے جو شکوک پیدا ہوں ان کی تشفی ہو سکے۔ مگر مسلمانوں کی کتاب سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کا فتوے کے کردہ ہونا ظاہر ہے اور محقق اور نیچر پر ہونے کا دعوٰی بالکل ایک بات سے دوسری بات تک ایک ہی دوچار کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مصنف بڑی تیزی سے ہی اور بے دلی سے کام کئے جا رہے تھے۔ بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہوا کہ یہ کتاب محض دولت کمانے کی خاطر لکھی گئی ہے۔ اور ہر کتاب کے ساتھ ہی اس کے دام بھی بڑھتے جاتے تھے۔ اور آج تفسیر قرآن کا ایک ایک حصہ ایک ایک روپیہ سے کم نہیں ملتا۔ اور اس تجارت سے مصنف کا کام کر رہی ہے۔

سید احمد خاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ ہے جو اب مسلم یونیورسٹی کی صورت میں اُن کی لازوال یادگار ہے۔ مسلمانوں میں افلاس اور بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے لئے انہیں مغربی تعلیم کی سخت ضرورت تھی۔ اور مدرسۃ العلوم نے اس ضرورت کو کافی حد تک پورا کر دیا۔ مگر اُس وقت لوگ مغربی تعلیم سے ایسے بدظن ہو رہے تھے کہ انھیں خوف تھا مبادا ہمارا مذہب بھی ہاتھ سے جائے اور وہ کہیں کے نہ رہیں۔ مگر سرسید اپنے ارادہ میں مستقل تھے۔ اس غرض سے انھوں نے ولایت کا سفر کیا تاکہ وہاں کی قدیم یونیورسٹیوں کے نظام کا مطالعہ کریں اور اُسی نمونہ پر ہندوستان میں مدرسۃ العلوم کی داغ بیل رکھی جائے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید ولایت روانہ ہو گئے۔ لندن میں جس شان سے اُن کا استقبال کیا گیا اور اُن کی جتنی خاطر و تواضع کی گئی اُس نے سرسید کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے متحد کر دیا۔ وہ تقریباً دو سال تک ولایت کے کالجوں کے انتظام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور مدرسۃ العلوم کے افتتاح کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس ارادہ کی تکمیل اور نیز مسلمانوں میں صحیح ادبی اور علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے انھوں نے تہذیب الاخلاق نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ مگر طبقہ علما نے اس رسالہ کی مخالفت شروع کی اور مدرسہ کی تحریک سے عوام میں بدگمانی پیدا کرنے لگے۔ شاید کچھ لوگوں کا خیال ہوا ہو کہ وہ انگلستان سے اپنا مذہب کھو کر آئے ہیں۔ لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری اور متواتر پانچ سال کی شبانہ روز سعی کے بعد ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کا علی گڈھ میں افتتاح ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسۃ العلوم کے قیام

سے مسلمانوں کو جتنا فروغ ہوا وہ اور کسی طرح ممکن نہ تھا۔ آج مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قومی یادگار ہے اور اسکے طلبا ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں بسکے علمبردار ہیں۔

سید احمد خاں محض ان وجوہ سے ہندوؤں سے بدگمان ہو گئے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی جانب سے یہ کوشش ہوئی کہ اس صوبہ میں ناگری کو عدالتی زبان بنایا جائے۔ سید احمد خاں نے اسے ہندوؤں کی زیادتی سمجھی حالانکہ یہ کوشش محض عوام کی آسانی کے خیال سے جاری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس صوبہ میں ہندوؤں کی آبادی ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہو اور اس میں بیشتر لوگ دیہات کے رہنے والے اردو سے ناآشنا ہوں وہاں اردو کا عدالتی زبان ہونا صریح بے انصافی ہے۔ جو رعایت سے اردو دہاں اشخاص کے فائدے یا آرام کے لئے آبادی کے بہت بڑے حصہ کو زیر بار کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں۔ اور نہ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اردو ایک دم سے فنا کر دی جائے لیکن سرسید کے دل میں یہ شبہہ جاگزیں ہوا کہ ہندو مسلمانوں کو زک دینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ایسے اسباب اور بھی پیدا ہو گئے ہوں جن سے اس خیال کو تقویت ہوئی ہو کہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اتحاد ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں قوموں میں تاریخی اور مذہبی اختلافات پہلے ہی سے موجود تھے۔ مغل سلطنت کی تباہی اور انگریزی عملداری نے ان اختلافات کو مٹانا اور پرانے زخموں کو بھرنا شروع کیا تھا کہ یہ نئے اختلافات پیدا ہو گئے اور متحدہ قومیت کی منزل ایک عرصہ دراز کے لئے نظروں سے دور ہو گئی۔ مذہبی فرقوں کے اختلافات کا عملی منادی کی صورت میں منتقل ہو جانا کتنا آسان ہے۔ یہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں

دیکھ رہے ہیں۔ آج ذرا ذرا سی فروعی باتوں پر آپس میں خونریزیاں ہو جاتی ہیں اور ملکی طاقت کا ایک بڑھیہ باہمی ناچاقیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی سال نہیں جاتا کہ دو چار مقامات میں ہولناک شر و فساد نہ ہو جاتے ہوں۔ جائے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں فریقین کی تنگ خیالیوں نے اُس رواداری اور باہمی مصالحت میں رخنہ ڈال دیا جس کی بنیاد پر متحدہ قومیت کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے سرسید نے مسلمانوں کے لئے سابق حکمرانوں کی روداد کی حیثیت سے کسی قدر امتیاز ضروری سمجھا ہو مگر ہندو مساوی سے زیادہ کسی قسم کی رعایت کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اگر سرسید نے اس وقت فراخدلی سے کام لیا ہوتا تو آج ہندوستان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن انھوں نے وقتی اور قریبی فوائد کو دائمی اور قومی اغراض پر مرجح سمجھا۔ موجودہ حکمرانوں سے اتحاد اُس سے کہیں زیادہ نفع بخش تھا جتنا محکوم ہندوؤں کے ساتھ۔ انگریزی گورنمنٹ کے ہاتھ میں اختیار تھا۔ مناصب تھے۔ ترقی کے غیر محدود ذرائع تھے ہندوؤں کی دوستی میں بجز باہم مل کر رہنے کے اور کیا رکھا تھا۔ سرسید کے خیالات میں یہ تغیر اُس وقت سے اور زیادہ نمایاں ہو گیا جب وہ ولایت گئے۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اُس سے وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمانوں کا مفاد انگریزوں سے موالفت اور اتحاد میں ہے۔ اس طرح اس عدم تعاون کی بنیاد پڑی جو روز افزوں خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے باہمی ارتباط کو محال ہی نہیں کر دیا

[illegible] کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ ملک دو مخالف حصوں میں
منقسم ہو چکا ہے اور اس کے تباہ کن اثرات گشت و خون کی صورت
میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ہر دو فریق بات تیسرے فریق کا
[illegible] اپنے اپنے وجود اور بقا کے لئے کارگر سمجھتے
ہیں۔ [illegible] جیسے ذی فہم اور مغز رگ قوم نے برگشتہ
قومیت کی ہوا میں آ کر ہندوستان کہیں سے کہیں پہنچا
دیا۔ غارت گر چیز اس قدر سخت جان ہوتے ہیں کہ یکبارگی
قومیت پر حملہ کر کے فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت
سے اب تک جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں وہ سب ہارویں
اور [illegible] ہی ہیں۔

مرحوم بڑے خوش مزاج آدمی تھے۔ دوستوں سے کبھی کبھی
[illegible] ہو جاتے تھے۔ اس سے عداوت کوئی نہایت نہ رکھتے تھے۔
[illegible] محنت کا یہ پھل تھا کہ وہ [illegible] دشمنی نہ رکھتے تھے۔ کسی
کو ذلیل کرنا بھی نہ چاہتے تھے۔ بہت ہی زندہ دل بامروت فیاض طبع تھے۔
حوصلہ بہت بڑا تھا۔ ان کی تقریر میں جادو تھا۔ بعض اوقات
ہو جاتے تھے۔ ان باتوں تھا۔ کسی بڑے عالم فاضل سے سنے
علمی بات کی [illegible] ضرورت نہیں ہے جتنی تحریر اور ہو تو ان کی
کی خاطر ہیں ان کے ساتھ جا کر [illegible] بن جاتے تھے۔ ان کی بات
سے [illegible] ہو جانا [illegible] تھا۔

مرحوم اردو زبان کی جتنی خدمت کی اس کی [illegible]
[illegible] میں کی جائے۔ یوں تو اردو نے ان کے [illegible]

پرورش پائی۔ اُس وقت تک اُردو میں شاعری کا بازار گرم تھا۔ ادبیت اور شعر گوئی شعرا کے تذکروں تک محدود تھی۔ اس میں نہ گہرائی تھی نہ بلندی۔ دقیق مسائل اور سنجیدہ مطالب کے ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ تاریخی، تنقیدی، اور علمی موضوعات پر اُسے اقتدار نہ تھا۔ سرسیّد نے اِن موضوعات پر تہذیب اخلاق میں جو مضامین لکھے وہ اُردو زبان کے کلاسک ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے دقیق مطالعہ، وسیع تجربہ فطرت انسانی کے غائر مشاہدہ اور علمی مسائل کی عالمانہ تحقیق ٹپک رہی ہے بیان میں اِتنی سلاست ہے کہ تھوڑی استعداد کا آدمی بھی بے تکلف سمجھ سکتا ہے نہ پیچیدہ ترکیبیں ہیں، نہ اُلجھے ہوئے جملے، نہ مشکل الفاظ۔ مشکل سے مشکل مطالب کو وہ اِتنی بے ساختگی سے ادا کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ مضامین سب کے سب طبع زاد نہیں ہیں، بیکن اور آڈیسن اور بعض دیگر ادیبوں کے خیالات کا چربہ لیا گیا ہے، مگر اندازِ بیان اُن کا اپنا ہے اور اِس انداز نے مضامین میں جدّت پیدا کر دی ہے۔ اُن کی ادبی اور قومی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے اُنھیں سَر کا خطاب عطا کر کے قدردانی کا ثبوت دیا۔

عمر کے آخری ایام میں سرسیّد مسلسل بیماریوں سے بہت نقیہ ہو گئے تھے۔ مگر اُس وقت بھی یہ فنافی القوم بزرگ خدمتِ قوم میں ہی منہمک تھا۔ آخر ۱۸۹۸ء کی ۲۷ مارچ کو پیامِ اجل آپہنچا اور اُس نے اپنی زندگی کی لازوال یادگاریں چھوڑ کر عالمِ فانی سے رحلت کی۔

"باکمالوں کے درشن" از پریم چند

جماعۃ احمدیہ

گذشتہ اشاعت میں ہم مولوی حکیم نور الدین صاحب رئیس جماعۃ احمدیہ کے انتقال کی خبر درج کر چکے ہیں جو رسالے کے مرتب ہونے کے وقت پہنچی تھی۔ اب جو واقعات شائع ہوئے ہیں اُنسے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت میں مسئلۂ حلات اور تکفیر و عدم تکفیر مسلمین کی بنا پر تمام اختلاف و نزاع پیدا ہوگیا ہے۔

ایک عرصے سے اس جماعت میں مسئلہ تکفیر کی بنا پر دو جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ ایک گروہ کا یہ اعتقاد تھا کہ غیر احمدی مسلمان بھی مسلمان ہیں گو وہ مرزا صاحب کے دعووں پر ایمان نہ لائے ہوں لیکن دوسرا گروہ صاف صاف کہتا تھا کہ جو لوگ

مرزا صاحب پر ایمان نہ لائیں وہ قطعی کافر ہیں۔ ان للہ و انا الیہ راجعون۔ آخری جماعت کے رئیس صاحبزادہ بشیر الدین محمود ہیں۔ اس گروہ نے انہی کو اب خلیفہ قرار دیا ہے۔ مگر پہلا گروہ تسلیم نہیں کرتا۔

مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے نے اس دعوے میں جو تحریر شائع کی ہے۔ اور جس عجیب و غریب حرکات اور دلآزاری کے ساتھ مباحثہ میں دھکر طہار رائے کیا ہے جہاں زندہ قریبے گروہ کے رؤسا ہیں۔ وہ فی الحقیقت ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمیشہ اس سائل کا ایک یادگار واقعہ سمجھا جائیگا۔

اس جماعت کا بیان ہے کہ انکی تعداد تم از تم تین لاکھ ہے۔ لیکن مسلمانان عالم کی تعداد آج چالیس کروڑ تک اندازہ کی گئی ہے۔

پس اگر غیر احمدیوں کو کافر سمجھ لیا جائے تو اس لئی مردم شماری کی بنا پر چالیس کروڑ میں سے انتالیس کروڑ ستانوے لاکھ کی تعداد کال دی جائیگی۔ پھر افسوس اس دین الٰہی پر جس کا درجہ خدا کے ہاں آج اسکی شاخوں میں صرف تین ہی لاکھ پھل دار رکھتے ہیں!!

جناب فرخ جمالی
علی گڑھ

تاریخ مجمل مقصل مخطوطہ خدا بخش

سوانح جان جاناں پر نئی روشنی

خدا بخش اورینٹل لائبریری میں ایک کتاب نمبر ہے جس کا فہرست میں تاریخ مجمل مفصل ہے اور مصنف کا نام درج ہے اور ورق ۱۳۳ تا ۱۳۸ ہے۔

مصنف نے سنہ خمس وثمانین و مائۃ والف ہجری (۱۱۸۵ھ) میں یہ کتاب لکھی ہے جس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ ہوتا ہے ۱۱۰۹ھ میں کیسے لکھی جا سکتی ہے اصل میں یہ ۱۱۰۹ھ ہوگا جو بعد میں کسی نے مذکورہ زمانے کے مخصوص طرز کتابت کی وجہ سے ایک اور نقطہ درمیان دو صفر لکھ دیئے۔

کتاب کا مصنف محمد عارف پسر دلاور خاں افغان قندھاری لکھتا ہے جو عہد کرنے کے بعد جب وہ سنہ ۱۱۰۹ھ میں سرخہ جان جاناں کا نام محمد خاں قندھاری بدل جاتا ہے مصنف نے یہ تحریر کیا ہے محمد عارف بن محمد جمشید بن عبدالرحمٰن خاں بن محمد سلطان خاں قندھاری عرف جان جاناں کے تحریر کیا ہے یہ بات بھی ہے کہ یہ حبیب سنہ میں شمس الدین حبیب سندھ مرزا مظفر بن مرزا جانی بن مرزا جان جاناں کے تحریر کیا ہے ۱۰۹۰ھ تک وہ مظفر حسین ہوتے ہیں لیکن وہ ۱۰۹۱ھ کے بعد کا زمانہ حبیب سندھ

ڈاکٹر اختر امام (شری لنکا)

کچھ سر علی امام کے بارے میں

[illegible] میں نے [illegible] اور [illegible] کے [illegible]
اب بھی [illegible] اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سر علی امام
[illegible] میرے [illegible] ننھیال [illegible] ہوئے تھے جو [illegible]
[illegible] کی جانب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] سر علی امام کے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

اسکول میں ہوا۔ وہیں پڑھتے رہے۔ چھٹیوں میں کرائے پر سرائے جایا کرتے تھے۔ جب انٹرنس میں داخل ہوئے تو دل لگا کر پڑھتے رہے مگر خلاف اُمید وہ فیل ہو گئے۔ اپنے والد ماجد سے ملنے کے بعد جو ان کا معمول تھا کرائے پر سرائے گئے اور چچا کو سنایا کہ بدنصیبی سے وہ فیل ہو گئے ہیں۔ چچا نے کہا اس میں سکین ہونے کا سوال ہی بے معنی ہے۔ اگلے سال پھر امتحان میں بیٹھنا۔ اسی اثنا میں ہمارے دادا مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ سفید ریش اور گیسو دراز تشریف لائے اور کہا کہ یوسف اپنے بھتیجے کو ولایت بھیجدو تاکہ اس کا ستارہ چمکے۔ یوسف امام صاحب مرحوم کی مالی حیثیت اپنے بڑے بھائی سے کہیں زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو بلا کر خواب بیان کیا۔ لائق بھتیجے نے فوراً جواب دیا "سرکار (سر علی عمر بھر تک جب بھی اپنے والد ماجد یا چچا سے ملتے تھے تو سرکار سے مخاطب کیا کرتے تھے) ولایت ضرور جاؤنگا۔ اس وقت لندن میں بیرسٹری کے داخلہ کے لئے انٹرنس شرط نہ تھی۔ ہمارے دادا خود بمبئی تک اپنے لاڈلے بھتیجے کو خدا حافظ کہنے گئے تھے۔ جب بیرسٹری کی سند لیکر واپس ہوئے تو پھر وکالت شروع کر دی تھی اور پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ کہاں تک پہنچے۔ ان کے چھوٹے بھائی حسن امام کو ان کے والد ماجد نے اپنی آمدنی سے ولایت روانہ کیا تھا۔

سر علی کو میں نے خود دیکھا ہے کہ کرائے پر سرائے میں چچا کے سامنے چوکی پر جس پر قالین بچھی رہتی تھی پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہیں اور چچا سامنے دہیں گاؤ تکیہ سے ٹکے ہوئے نیم دراز ہیں۔ یوسف امام صاحب ناس لیا کرتے تھے اور جب کلا صاف کرنے کے بعد کھکھار کی نوبت آتی تو سر علی (جبکہ وہ حیدر آباد میں صدر اعظم تھے) فوراً اٹھے اور اگالدان اٹھا کر بڑھا دیا۔ پھر ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حیدر آباد سے استعفا دے کر جب پٹنہ آئے تو اولین فرصت میں چچا کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ میں اس وقت میٹرک میں پڑھتا تھا خود سر علی کو کہتے سنا کہ سرکار

جب میں ملازم ہو کر حیدر آباد گیا تو مجتہد دین مشیعہ سمجھ کر رکیونکہ نواب امداد امام صاحب جوانی میں لکھنؤ اور رامپور کے زیر اثر شیعہ ہو گئے تھے، حضرت عمرؓ کے خلاف طنزیہ جملے کہنے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر حضرت عمرؓ کو امیر المومنین اور خلیفہ نہیں تسلیم کرتے ہیں تو پھر جو اسلامی جہاد ایران پر ہوا وہ جہاد نہیں لڈ اس کی حیثیت محض لوٹ مار کی سی تھی۔ ہاں پھر یہ بھی تو قابل غور بات ہے کہ جب حضرت عمر کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر جہاد ایران کے بعد جو مال غنیمت مسلمانوں کو ملا وہ مال غنیمت نہیں بلکہ ناجائز ہی متاع تھی۔ اور پھر شہر بانو کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے حضرت عمرؓ نے امام حسین کی زوجیت میں دیا تھا۔ اور اس کے بعد سادات بھی صفر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ باتیں سر علی نے چچا کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہی تھیں بلکہ ہم لوگ جانتے تھے کہ وہ حنفی المذہب سنی تھے۔ جب ہماری چچی لیڈی امام صاحبہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے پیر شاہ بدر الدین علیہ الرحمۃ کے گورستان میں دفن کیا جائے تقریباً چار سال ہوئے جبکہ میں پھلواری شریف گیا تھا تو چچی مرحومہ کی قبر پر فاتحہ کے لئے حاضر ہوا تھا۔

سر علی کو درباری سازشوں نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ بلکہ یہ بھی ایک دردناک سانحہ ہے کہ زہر دے کر انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ وطن آنے کے بعد بھی چند ہی سال زندہ رہ سکے۔ یہ بھی ہم لوگوں کو معلوم ہے کہ زہر دینے میں کس کا ہاتھ تھا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ دامن بچا کر گذر جاؤں۔

یوسف امام صاحب مرحوم کے یہاں جب مہ علی آیا کرتے تھے تو پورے گاؤں میں ایک نمک سا بچ جایا کرتا تھا اور زمیندار سے لے کر مزدور تک سلام کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان ملاقاتیوں میں ایک سید بھی ہوتے تھے۔ جنہوں نے ملاقات سے پہلے [illegible]

علاقہ تک رہا ہے اسے خرید لیا جائے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سر علی نے اسی زبان میں کہا ما جو یہ میسٹر سنگھ ..... پھر اسی زبان میں کہا کہ "کہاں ناکہ بر برہا چوان سے ....."

میں خود رائے پر سرائے میں پیدا ہوا تھا مگر علیگڈھ کی تعلیم سے مگدھی بھول گیا تھا۔ وہ یعنی سر علی عربی بقدر ضرورت ہی جانتے تھے مگر فارسی پرانی لہجہ اور انگریزی انگلستانی تلفظ سے بولتے تھے۔ اردو تو دھلی ہوئی تشبیہ و کنایہ کی تھی۔ کیا مجال کہ اردو میں انگریزی الفاظ ٹھونسے جائیں۔

ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جسے سر علی آبدیدہ ہو کر یاد کرتے تھے۔ کہتے کہ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے سمندری جہاز سے جا رہا تھا اور جب بحر احمر سے گذر کر سوئز کا رخ آ رہا تھا تو میں زار و قطار رونے لگا۔ ڈیک پر کھڑا تھا کہ اقبال آئے اور پوچھا کہ علی خیر تو ہے روتے کیوں ہو؟ میں نے جواب دیا کہ اقبال دیار حبیبؐ ہم سے چھوٹ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اقبال بھی گلے لگ کر رونے لگے۔ اللہ اللہ یہ تھا عشق رسولؐ جس دولت سے سر علی اور اقبال دونوں بے حد مالا مال تھے۔

سید یوسف الدین بلخی صاحب نے "بہار اردو لغت" کے زیر عنوان ان تمام علاقائی الفاظ اور محاورات کو الف بائی طریقہ پر ترتیب دیا ہے جسے حال ہی میں لائبریری "جرنل" نے ۲۸ ر شمارہ میں شائع کیا ہے۔ یہ ایک لائق تحسین کام ہے۔ اردو ہندو پاک کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا۔ ہندو بنیوں نے بنگالیوں کی زبان پر قبضہ لگائے اور یہ نہ جانا کہ اس زبردست سے وہ زبان کی مشرمعت میں بنگالیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کا ردعمل نفسیاتی طور پر یہ ہوا کہ بنگلہ دیش میں اردو کا جنازہ نکلا۔ علیگڈھ میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر ہم نے

[illegible] میں نے تعلیم پائی ہے۔ اسکول کے بچے کی [illegible] ہو بہت کی [illegible] تو یہ ایک حد تک قابل معافی ہے۔ مدرسے [illegible] یہ [illegible] ہو [illegible] کہ اردو کے حق میں کانٹے بو رہا ہے۔ ہمارے اردو کے [illegible] علمی سطح پر [illegible] قابل ذکر ہیں۔ ایک تو حضرت مولانا حسن [illegible] دوسرے رشید احمد صدیقی صاحب۔ مولانا حسن [illegible] لکھتے تھے۔ خود وہ [illegible] ہوں [illegible] مگر رشید صاحب [illegible] کے سوا [illegible] طلبا کو ہمیشہ اس زبان سے [illegible] سمجھتے تھے۔ [illegible] سے [illegible] تھے اور اردو کے پرستار تھے۔ مذاق کے [illegible] رشید صاحب سے قابل اعتنا نہ سمجھا۔

ڈاکٹر انیس امام

[illegible] برادران کے متعلق مشہور ہے۔ وہ [illegible] تھے۔ [illegible] سنی گھرانے کے چشم چراغ تھے۔ اس [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] [illegible] ڈاکٹر کا تعلق بھی ایک [illegible] سنی [illegible] سے تھا۔ [illegible] [illegible] [illegible]

اور آپ نے بھی شیعہ علما نے جو نکاح پڑھایا اس میں براہ راست ایجاب و قبول نہیں ہوا اس لیے نکاح نہیں ہوا سر علی نے ان کے خیال کی تائید کی اس کے بعد سنی علما بلائے گئے اور نکاح پڑھایا گیا۔ سر علی امام خانقاہ حبیبیہ اور خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف کے بہت معتقد تھے اور صاحب خانقاہ کی صحبت سے فیض اٹھاتے۔

ایک مرتبہ حسن امام رتبہ صاحب محمود آباد کے یہاں قیام پذیر تھے انھوں نے راجہ صاحب سے موٹر طلب کی تاکہ دیوا شریف تشریف لے جائیں راجہ صاحب کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم لوگ شیعہ ہیں دیوا شریف سے ہمارا کیا تعلق حسن امام نے کہا کہ ہم چار یاروں کو تسلیم نہیں کرتے اس کے علاوہ ہم شیعہ نہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ متعہ کو ہم زنا (FORNICATION) سمجھتے ہیں، تقیہ کو ریاکاری (HYPOCRACY) اور تبرا کو ناشائستگی (INDECENCY) خیال کرتے ہیں۔ چوتھی بات اختر امام سے پھر دریافت کروں گا۔

●●

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

کچھ اپنے بارے میں

[illegible] کے راستے سے یہ [illegible] کچھ [illegible] کے [illegible] کچھ [illegible] کے [illegible] کچھ [illegible] کے

تبدیل ہو گئے اور اس کی جگہ اسٹریٹ لائٹ نے لے لی۔ لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جانی کی نیانی کی طرح جاری رہی۔ آخر تنگ آ کر وہ تیسری جماعت میں سکول سے بھاگ نکلا۔ ہر روز گھر سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رُخ کرتا۔ دن بھر وہیں سے پرندے اور جانوروں کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ادھر تمام گھر جانی والد صاحب اس صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھے۔ والدہ کو سب معلوم تھا لیکن ماں ہی سے بچہ جلد اور زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔

غیبی امداد | جانی نے سکول سے بھاگ کر جو وقت ضائع کیا اس کا اسے بہت افسوس تھا۔ اس کی تلافی کے لیے اس نے ایک نیا طریقہ سوچا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے والد صاحب کو ایک خط لکھے گا۔ اس خط میں وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا اور اپنے والد صاحب سے معافی مانگے گا۔ اس نے یہ خط لکھا اور اپنے والد صاحب کے نام بھیج دیا۔ اس خط کا اس پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اس کے والد صاحب نے اس کی غلطی کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد جانی نے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ اس کے والد صاحب نے اس کی تعلیم کے لیے ایک ٹیوٹر کا انتظام کر دیا۔ ٹیوٹر کا نام مسٹر ولیم تھا۔ وہ ایک اچھے استاد تھے۔ جانی نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی وجہ سے جانی کو مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ ان کتابوں کا اس پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اس کی زندگی کا رُخ بدل گیا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا مقصد پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا نصب العین پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا آئیڈیل پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ہیرو پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا رول ماڈل پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا رہنما پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا استاد پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا گائیڈ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا مینٹور پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا کوچ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ٹرینر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ٹیچر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا پروفیسر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈاکٹر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا انجینئر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا آرکیٹیکٹ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈیزائنر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا آرٹسٹ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا موسیقار پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا گلوکار پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا اداکار پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈانسر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا کامیڈین پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ٹریجڈین پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ہیرو پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ولن پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا کریکٹر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سٹوری پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈرامہ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا فلم پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ٹی وی شو پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ریڈیو پروگرام پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا تھیٹر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سٹیج پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سٹوڈیو پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا کیمرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا لائٹ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ساؤنڈ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا میوزک پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا گانا پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈانس پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ایکٹنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈائیلاگ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سکرپٹ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا سکرین پلے پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ڈائریکٹر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا پروڈیوسر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ایکٹر پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ایکٹریس پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک نیا ہیروئن

کیف و مستی، زندہ دلی اور حاصلِ زندگی کہتے ہیں۔

تم [illegible] کی تعریف کرو۔
تم [illegible]
تم [illegible]
تم ... تم ...

اسے کہ بھی، کیسے [illegible] کی [illegible] کہ [illegible] سلام کے [illegible] تھیں، [illegible] کہ [illegible] ہونے کے [illegible] کے [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] کے [illegible] بھی کام [illegible] گا۔

گرد و نظر

[illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible]

مشرقی پنجاب

مشرقی بنگال

پروفیسر

[illegible] ہوئے کہ وہ مسکل آیا وہ وقتی ہیں ایک ظاہری نقطے کو لے کر ایک آدھ سبسل مہینے خدمت کہیں کر جائیں اور پروفیسر صاحب کا شوق قطاری سرد پڑ گیا۔ اب انھوں نے سلسلہ وار پڑھانا [illegible] کہیں کر پھر ٹیک لگا کر [illegible] کہیں بیٹھ کر۔ جاری چند لمحات [illegible] کہ کر سیٹ کر لیتے سوالی فہرس لکھا تھا۔

اس امید و کوشش کا نام علاء حیوانی بڑھنے سے وہ وقتی کو تحقیق کے بال میں حاصل ہوئے اور آپ امتحان سے پہلے ایک عرصہ تک [illegible] رہے تھے۔ مال و محنت کی بربادی و مستقبل کی تباہی کا صدمہ اٹھا کر پروفیسر صاحب کرنے کی سر پیل تک موقوف نہ کی۔ یہ وہ [illegible] تھے اور کسی مشیشن پر [illegible] دات صبا ہی بڑھائی سے ہفت [illegible] اور صاحب کی سر پیچنے لگے کہ اب کیا جائے۔ بادشاہ گیری کی بیٹھا لکھے کا بیعد کیا۔ اور جس پہلی گاڑی پر بیٹھ کر بجواتے سید حامد کی محمد تنقیح صاحب کی، ہانس گاہ پہنچے جس ساری کہانی سنائی اور سنہ ہی التماس کی کہ وہ مقدار کے لیے کوئی صورت تجویز فرمائیں۔ آپ سے چلتے سرے کے بعد پوچھا: کیا اب اس تیرہ پر کام کر سکیں گے جو سب نہ [illegible] سنا رہتا، ہمارا تو جانے کام شروع کیجیے اور جو حوالہ پر ضروری کتابیں ہے ہی ملتا ہے۔ ہاں بیٹھے بیٹھے برق صاحب اٹھے۔ شاید وہ مرشد کے ہاتھ کر چلے اور [illegible] کہ بیٹھے سے سو چھ سال کی وقت و تحقیق کے بعد کتاب مرتب کی، اس کے سات باب تھے۔ اصلاح [illegible] کے لیے ایک ایک باب بھیجا اور کہا، انھوں نے قول پر داری سے کام لیا اصلاح و ملاحظات کی تمام اغلاط درست کر دیں۔

۱۔ پروفیسر پیر علام [illegible]

۲۔ پروفیسر فاضل محمد صادق

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر تاثیر مرحوم

۴۔ پروفیسر شیخ عبدالحق

۵۔ خانصاحب عبدالمجید مرحوم

۶۔ گورنمنٹ کالج ہوشیارپور کے شعبہ انگریزی کے ایک پروفیسر مرحوم [illegible]

۷۔ حافظ [illegible] یوسف [illegible]

اس کے بعد یہ مقالہ قبلہ تنقیح صاحب کو دیا، انھوں نے [illegible] تعداد خامیاں پکڑیں۔ جنھیں کسی حد تک دور کر دیا گیا۔ اور پھر کتاب پر [illegible] سی سو روپیہ کے عہد تحریر کیا اور پروفیسر ڈاکٹر [illegible] ہی گئے۔

داد [illegible] پروفیسر رفی صاحب ہی ہی محنت سے اس کتاب میں [illegible] کیں ڈاکٹریٹ کے مسئلے میں ایک بڑا بھاری رکاوٹ کھل گئے۔ وہ پروفیسر [illegible] کے عوض کے کیل پر میں [illegible] کر دیا، ڈاکٹریٹ کے لیے جدید سال تک کام کرنے ہیں [illegible] ان کی کتاب کی [illegible] ہوئی پروفیسر [illegible] کی وساطت سے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] سو روپیہ کا [illegible] اور [illegible] پروفیسر [illegible] کے پاس پہنچے، انھوں نے [illegible] کر دی [illegible] ایک [illegible] کے لیے [illegible] پروفیسر [illegible] کے پاس گئے وہاں بھی سوک [illegible] انھوں نے قسم [illegible] اور [illegible] تاخیر ہو گئی [illegible] آخر وہ [illegible] سرد ہو کر [illegible] سفارش کی حل اور یونیورسٹی سے چار سال کی [illegible] کتاب اٹھائے [illegible] کہیں کالج والوں کو [illegible]

[illegible] گورنمنٹ کالج میں [illegible] کے پروفیسر تھے۔ [illegible] میں ریٹائر ہوئے، آج کل وہ [illegible] کے سکریٹری [illegible]

[illegible] ڈاکٹر محمد صادق، گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھے، ریٹائر ہونے کے بعد وہاں عثمانیہ کالج میں کام کرتے رہے ہیں۔

[illegible] کالج [illegible] کے پروفیسر تھے۔

[illegible] گورنمنٹ کالج [illegible] کے پروفیسر تھے۔ [illegible] میں وفات پائی۔

[illegible] پروفیسر [illegible] گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں [illegible] انگریزی [illegible] کے پروفیسر رہے۔ آج کل [illegible] میں [illegible] ہیں۔ [illegible] کتاب ایک [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible]

بحیثیت مقرر

مست و ہوشیار

طبی مشورے

خدا تحریف کی روح تمہاں کے کانوں پر لگی رہے گی اور اسے بہشت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس پر سب لوگ خاموش ہو گئیں، اور حوا نے بھی لبوں کو بند کر لیا۔ اللہ کی شان کہ ایک گھنٹے بعد اس بڑی کا والد بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے متعلق لوگوں کی بدگمانی دفع ہو گئی، اور شام کے وقت جب وہ جنازے گاؤں سے نکل رہے تھے تو حکیم صاحب کی گاڑی کو حسب خاں سے کھینچا تھا۔

کردار

ڈاکٹر کا کردار کسی ہوا ہے بھی قابل شناخت نہیں اس کا پچپن شیر پانے، طوطے چوسنے گالیاں بکنے اور طمانچوں میں گذرا، جوانی کی پرستوں اور اغلاس کی صورتوں میں بیتی اور بڑھاپا جوانی کے ماتم میں گذر رہا ہے۔ زندگی کو گزرنے کی کبھی فرصت ہی نہ ملی، اگر ملی بھی تو بے سود مالی آڑے آتی۔ بیچ پر پیچھے تو ایک گھاؤ نے اسے کئی ہوں سے بچا رکھا تھا اور وہ بزنج پر تماش کا ایک انگریزی کھیل ہے۔ جو جوئے کی ایک قسم ہے ڈاکٹر نے یکیل ۱۹۳۶ء میں شروع کیا تھا۔ اداسات تک کھیلتا رہا۔ فرق یہ کہ شروع میں وہ روپوں کا تھا اور اب دانے کے بیر کھیلتا ہے گئی کے متعلق سوچنے کا مزدوں زین وقت شام ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہر شام کلب میں گزر جاتی ہے جہاں وہ سات کے گیارہ بنانے تک بیٹھا، اور کھیلتا ہے گو اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی رنگ دل لطیفہ بازی، چھیڑوں اور قہقہوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات بات پر اور مختلف موضوعات پر اس کے اقوال، حکایات اور تمثیلات ملتا رہتا ہے۔ شعر پڑھنا ہے، فلسفہ بگھارتا ہے اور مضمر ہونے کے علاوہ وہ ایک شاعر اور کوی بھی ہے۔ اس نے کالج میں کئی ڈرامے کئے، اور ایک دو مرتبہ سنجے کا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب اتنی دیدے کے احمق واقع ہوئے ہیں۔ ان معنوں میں کہ جس آدمی سے ملتے ہیں اُسے سو فیصد شریف سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس وقت اپنی رائے نہیں بدلتے۔ جب تک کہ ہم ہر کھلے کے بعد، فیصلہ نہیں، ہو جاتے کہ وہ بدنیت بدکن اور بدذات ہے۔

بے اصول ہونے کے باوجود آپ نہایت استقلال سے چند اصولوں کی پابندی کرتے ہیں:

اوّل: اپنے دوست کو کسی قیمت پر نہیں بیچتے، اور رتبہ محبت کو تمام رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے ہیں۔

دوم: قارب میں صلح و آشتی کے پرجوش مبلغ ہیں اور اس بات پر لوگوں کو زندگی کی کسی منزل پر بھی اُن کو اپنے جائیوں سے اخلاق نہیں برتا اور جو تفصیلات حمدوہ، اخلاق مادر میں پروان چڑھے تھے وہ برستور قائم ہیں۔

سوم: آپ اپنے محسن کو کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں مزاحیہ ہوں وہ آنکھیں بند کر کے اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ آپ کی نظام معنوں میں حسن پرست ہے کہ آپ ہر چیز اور ہر انسان کا صرف روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ اور جب تک مجبور نہ ہو جائیں عیب نہ نکالتے کی طرف توجہ نہیں کرتے

چہارم: آپ اپنے علمی مخالفین سے کبھی نہیں بھولتے۔ اس وقت تک آپ کے خلاف اُگلتے ہیں اور جن مضامین نکل چکے ہیں جن میں آپ کو کافر، مرتد، ملحد اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن آپ جو اپنا خاص رہے ہر مرتبہ آپ نے تحمل کی، کہ حوالہ اجمالہ دیا ہو ہی کو ایک نہایت تیز خط لکھ دیا۔ انھوں نے وہ خط اپنے اخبار صدق جدید میں چھاپ دیا۔ اور بعض اور اخبارات و رسائل بھی چھاپ کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔

پنجم: آپ اُن لوگوں سے میلوں بھاگتے ہیں جو دولت یا اونچی کرسی ہی کو سعید عظمت سمجھتے ہیں۔

ششم: آپ محسن فطرت کے شیدائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی بور کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے۔ اس چھوٹی سی صاف پاکیزہ بستی کی کھلی فضائیں ہر طرف تک پھیلے ہوئے کھیت اور گرد و دریا چشمے اور سرسبز جھاڑیاں، گھنے جنگل، اُن میں ہرنوں، بیتروں اور بگلوں کے ڈار وہ نعمتیں ہیں جو شہروں کی عنیف، متعفن گرد آلود اور دُخان آلود فضائیں کہیں مل سکتیں۔ حدیث میں ذکر ہے کہ سحر کے وقت خدا نے انسان زمین کے قریب آکر آواز دی ہے۔ کہ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اُس کی فریاد سنوں، خاص بستیوں ہی میں زمین کے قریب آتا ہے۔ بڑے شہروں کا مزاج اللہ تعالیٰ اس شرف کا سزاوار کرے!

شاہد فطرت کہ ہے بے حجابی تیرا حسن — بن کے شہروں سے بن پیارے تو شرماتے کہاں (اقبال)

ہفتم: اس حقیقت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ کہ زندگی یہاں مسافر ہے اور اس کی منزل اللہ ہے۔ سامان فطرت لادنا ہی ضرورت ہے۔ ذکر کم ہونے کی خواہش، سادہ و پرسکون قناعت اور وہ مثالی میراث اپنے اندر دولت بیوت ذخرون۔ دولت ایک سیلاب ہے۔ جو اخلاق و فضائل کی تمام کھیتیاں بہا لے جاتا ہے اور پیچھے سراب و ویرانی کی شورہ چھوڑ جاتا ہے۔ دولت حرص، ہوس، شہوت، بدمستی اور نخوت پیدا کرتی ہے اور انسان کو حیوانی

بلوچستان سے اخبار اور جریدے نکلتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے مراکز ہیں وہاں بڑے بڑے اخبار نکلتے ہیں۔ یہ لوگ اخبار سے صرف یہ جانتے ہیں کہ اخبار سے اخبار کے ہم پر کچھ واپس ملتا ہے تو جیب پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔

[illegible] کی دنیا میں ان کے دل کی آواز کے ذریعے [illegible] کا [illegible]

کسب [illegible] جب [illegible] ایک [illegible] ہیں [illegible] [illegible] [illegible]

۸	آئینہ عبرت	۱۹۲۳ء	اسلام کے مختلف عنوانوں پر ایک علمی تبصرہ (غیر مطبوعہ)
۹	دولت آصفیہ	۱۹۲۴ء	آصف کا سلطانہ تاسس کی رہنمائی
۱۰	حکمائے اسلام	۱۹۲۶ء	قفطی مصری کی تاریخ حکما کا ترجمہ جس میں چار تین سو مسلم اور ایک سو چودہ یونانی حکما کے حالات ہیں۔
۱۱	جہاد	۱۹۲۸ء	مختلف اسلامی مسائل پر بحث
۱۲	دین اسلام	۱۹۲۹ء	حدیث ۔ ایک تنقیدی نظر
۱۳	ہمارے ہمارے اسلاف	۱۹۵۰ء	صحابہ کرام کی دستہ بہانے مدلل بیان۔
۱۴	ایک اسلام	۱۹۵۲ء	وحدت مذہب پر تفصیلی بحث
۱۵	حضرت محمدؐ	۱۹۵۳ء	آپ کی ایک سوانح
۱۶	اتحاد کی حالت	۱۹۵۴ء	ایک مکمل سے دردی دکھ
۱۷	مسلمانان اسلام	۱۹۵۵ء	مختلف کے مصور نثر میں ہوں کی ایک کتاب۔ محمدی ذی شیر۔ کا اردو ترجمہ
۱۸	جان جائی	۱۹۵۸ء	شیعہ و سنی اختلافات تاریخ کی روشنی میں بے خبار ہیں
۱۹	تراجم	۱۹۵۸ء	اردو انگلش پیڈیا کے لیے جو جناب یونیسکو مرتب کرا رہی ہے ایک سو دس مقالات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ
۲۰	سی کی دنیا	۱۹۶۱ء	روح ، تسخیر ارواح ، عبادت وغیرہ پر بحث
۲۱	دانش رومی و سعدی	۱۹۶۳ء	رومی و سعدی کا پیغام (زیر طبع)
۲۲	گمشدہ مخطوطات و مضامین		

تاریخ وفات

گو اب تک ڈاکٹر صاحب تندرست اور چاق و چوبند ہیں جانوں کے سے قہقہے لگاتے اور گویا کی طرح ہوا دے رہے ہیں۔ لیکن ایک کے سال کی پیدائش آخر فیصلہ گویں ہمیشہ کی دم ہیں گی۔ ہاں تقدیر، دوم جانے سوم ہدف تیر سے ہر دم جہاد ان کو ہوئے دیکھ بڑے لکھے کا الہام جیاں ہے ہے۔ کہ ۱۹۶۳ء کے قریب وہ عزیزوں میں پہنچ جائیں گے۔ بلکہ وہ اپنی وفات سے خود بے خبر رہے گی۔ کہیں کہ ہمارے احباب صرف شاندار مگر مختلف دیوں اور سیمروں کے متعلق تعزیتی دیتے ہیں، دوسرے بیلی لوگ قوان کے ساتھ پیشتر وہ ملک عدم سدھار گئے ہیں کہ ان کی عمر شمار کی جا چکی ہے۔ ہاں ان کے فارغ عمر کے حصے سے کچھ اور بھی اضافہ ہو جائے تو ان کو۔ شائقین کے لیے ایک نسخہ یہ تجویز کر دیتے ہیں۔

• اعتدال کا استعمال۔

• کسی نہ کسی مشغلہ ، ڈاکٹر عزیز کا انتخاب مرگی ہے۔ بل رحم خوں ہو گی۔

جیسے ہمارے ڈاکٹر نے علاج کے سب سے بڑے محقق حال سابق ڈاکٹر موری محرم طبیعی کے ساتھ انتقال پر ملال ایسے کہنے ہمارے ملک کے لئے سیاسی دنیا کے نہرت کے پیام بھیجے ملک کی کئی درسگاہوں ان کے مرنے میں بند ہوئیں، میلاد دہ ایسے ڈاکٹروں کا کہ ان دنوں ملک سے مترادف ان کی موت پر بعض مدرسی رسائی دعا کی کہ ملک کے عمر سے ان کی عمر بھی بھی گئے۔ دوسرے دعا سے ہو گئے۔

ڈاکٹر زرق در جنم رحمت

(خاکہ نسخہ قلمی)

فصیح الدین بلخی

نیپال میں عربی فارسی و اردو کے مخطوطات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عبدالعزیز طاہر ایک قدیم مخطوطہ ہے جس میں اخلاقی و مذہبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ ⑦ "بیاض واقف" مرقومہ ۱۲۷۴ھ ایک نادر مخطوطہ ہے جس میں شاعر کے فارسی وارد کے کلام ہیں۔ اس کے علاوہ شعرا سوھان اور کلاسیکی گیت ہیں جو ہندی اور اردو میں ہیں۔ ⑧ کتاب لامعلوم الاسم ⑨ ایک قدیم مخطوطہ جس میں لذیز کھانا بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں جس کے اول اور آخر کے صفحات غائب ہیں۔ ساتھ ہی کتاب نہایت خستہ حالت میں ہے ⑩ "کنز الرقیق" مرتبہ نظر اللہ بن محمد بن حمید۔ یہ مخطوطہ شاہ اورنگ زیب کے بیسویں سال جلوس حکومت میں مرتب ہوا۔ اس میں فلسفہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ مولف نے سلطنت مغلیہ کے مختلف شہنشاہوں کے جلوس حکومت کے حالات لکھے ہیں۔ ⑪ "اصل المعرفت" مرقومہ ۱۲۱۱ھ ایک نادر مخطوطہ ہے جس کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس مخطوطہ میں کئی دیگر مخطوطات بھی شامل ہیں جو تصوفی طریقت شاہ تراب علی بن ہم کا نظم فلسفہ کی "مطالب رشیدی" اور اسپیدی کی دوسری تصنیف جس میں مختلف تاریخی واقعات درج ہیں ——— ⑫ "شرح مثنوی مولانا روم" از ہدایت اللہ ابن عبدالفتح حسین ایک مشہور صوفی کی شرح، جو مکمل، مفصل اور قابل تحسین ہے ⑬ "سلامت الزیب" دفتر دوم ایک قدیم مخطوطہ جس میں اسلامی فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ⑭ انشا مالی جس میں مکتوبات نگاری کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کو نواب میر قاسم نے اپنے بچے کی تعلیم کیلئے ۱۸۴۰ء میں لکھا تھا ⑮ "بیاض خصوصی یا ملفوظات خواجہ سید عظیم الدین بدخشانی" اس بیاض پر برجس قدر آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنی جائداد کو بیچا ہے۔ اس کی بین مختلف روداد اس میں ملتی ہے ⑯ "تاریخ حسن بن عبدالرسول شہوا" جلد اول۔ یہ کشمیر کی تاریخ ہے۔ جس میں مفصل حالات ملتے ہیں۔ یہ ۱۸۱۰ء میں کریم مولف نے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں مختلف ذرائع کا سہارا لیا ہے جس میں لگ بھگ ۲۰ کتابوں کے حوالے ہیں ⑰ شرح سرائے ایک ہرکہ "مولفہ قاضی شہاب الدین مرقومہ ۱۱۶۲ھ، اس میں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ⑱ "رسالہ وجہ لفظ" مرتبہ لطف اللہ، مرقومہ ۱۲۲۲ھ ⑲ کتاب ادلۂ عبادت۔

پیش کش: ڈاکٹر نسیم اختر
پٹنہ سیٹی

یادداشتہائے ودود

قاضی عبدالودود

قاضی صاحب جب بے حد مسرت سے بہت سارے دوستوں
سے ملے۔ اپنے کچھ اشعار سنائے۔ کچھ سنے۔ اور
آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال
دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی دوشنہ کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ
سہ بارہ لکھتے تھے۔ لکھت موضوعات پر سکی یادداشتیں ہزاروں
چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں دقت و فرصت سے
کیا جائے گا تو شاید کوئی بڑے کام آجائے۔ ان یادداشتوں
میں کئی جگہ میں کوئی کسی مصرعوں کی شکل میں لکھی ہیں۔ کچھ مکمل
کچھ ہیں کچھ نامکمل ہیں

ادبی تحقیق کے بارے میں

ایک خاص نتیجے پر منظم طور پر کوئی پہنچے۔ اس وقت میرا موضوع گفتگو یہ تعریف کافی ہیں، لیکن ایسی تعریفیں جو منطق کی کلیہ قضایا کو پوری کر سکے ممکن بھی نہیں ہے۔ اس وقت میرا موضوع گفتگو عام صحیح یا غلط ادبی تحقیق ہے۔ ادبی تحقیق اور ادبی تنقید میں [illegible] اصل بحث کا وقت نہیں ہے۔ میں محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر تحقیق یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ کیا ہے، لہٰذا اس کا تعلق حقائق سے ہوتا ہے۔ تنقید یہ بتاتی ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ تحقیق اگر بھی اقدار سے بحث کرتی ہے تو وہ صرف خاص دائرے میں محدود رہتی ہے اور تقدار واقعات کا ذکر کرتی ہے۔ وہ تحقیق کا فریق اور اس کا حریف ہوتا ہے۔ [illegible] ادبی اور تنقیدی [illegible] ترجمہ کا سہارا لیا جائے۔ اور ترجمہ بھی اس کا جواب دیا تھا۔ جواب الجواب اور اس کا جواب [illegible] ترجمہ کا تقاضا نہیں کرتا، مگر میں کہتا ہوں کہ [illegible] ترجمہ [illegible] ایسا [illegible] روشنی [illegible] اس سے ہوتی ہے [illegible] [illegible] [illegible]

پانچواں بین کلیائی ادبی اجتماع

ماتی نہیں رہتی جو ادب کی ملاحظہ کچھ کی ضرورت ہی ہے میں اس کے اخلاق نہیں کرتا،
بلکہ یہ میرا خیال ہی کہ اگر ہمارے سامنے کسی خالق ادب کی صحیح تصویر ہو یا کوئی
ہو کہ کوئی ادب پارہ کس زمانی میں اور کن حالات میں وجود میں آیا، اور اس
کا صحیح تنقیدی کر تو ہم اس سے بہتر طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔

(۵) بعض احباب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تحقیقات کو تو خالص نہیں سمجھتے، وہ

یہ حاشیہ ہیں کہ وقت اور توانائی ضرور ہی | اگر یہ وقت اس کا بہترین مصرف یہ ہے
کہ ہوا کو مٹھی میں کھا جائے، اور نقش کو کتاب | کیونکہ خواب اس دنیا میں ہی تو جنتی
یہ دراصل خالص کاروبار نوعیت نظری | اور مجھے اس سے مطلق ہمدردی نہیں اور
مجھے اس کی اہمیت | اور نہ میں اپنی محنت کو بیکار
اسی طرح کھلاڑی جاتی | زمانہ بڑا | ہم طریق ہے یہ تو نہ کہا کہ اتنی وقت
لڑکیوں اور لڑکوں، کو کھلاڑی لیتی یہ تحقیق | تحقیق ہے وہ خود فراموش ہو جاتی
مرد اگر وہ ان انتخاب کا ہی | جو کسی سیاسی
ابھار کا وقت اسی کی اندازہ کرتی ہیں | تحقیق کرنا یا اتنا ہی۔ تحقیقات ہی اگر
اپنی مقاصد کی جنتی ہیں، مدد مل سکتی ہے | تو ہی۔ اس ماجرا مقدم کر سکتی ہیں
الزامی ہے | ورنہ نہیں۔ اپنی مال ہیں، مہر ہے | اگر اس کمال
اس کی ہماری مستقبل کی تعمیر میں مدد نہیں مل سکتی | یہ نہیں ہو
نہیں ہو سکتی ہے تو صحیح نہیں۔

مراسلہ

مصطفیٰ خاں شروانی
حیدرآباد

نہرو، علی گڑھ، اس مسعود اور وائسرائے

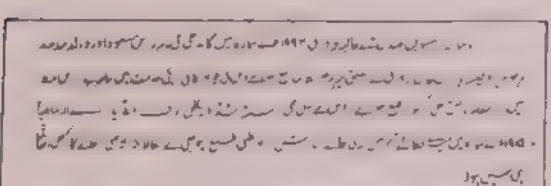

"بیسویں صدی" اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں پروفیسر محمد حسن نے اپنے سلسلے وار ناول "فرد، دل و دماغ" کی اسی قسط کے صفحہ ۱۰ پر ڈرئے ہند کے جواہر لال نہرو کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس وقت کے وائس چانسلر راس مسعود کے مدعو فرمانے پر اعتراض کیا تھا کہ کس نے جواہر کو علیگڑھ بلا لیا۔

میری دانست میں اس واقعہ میں کچھ اشتباہ ہے اسلیے کہ اول تو راس مسعود وائسرائے لارڈ ریکز کی توثیق پر ۹ فروری ۱۹۲۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ اور اپنے عہدۂ وائس چانسلری کے پانچ سال مکمل کر کے بھوپال منتقل ہوئے۔ اور ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں انتقال ہوا۔ کیمبرج انگلستان میں جواہر لال نہرو سر راس مسعود کے ہمعصر و ہم درس تھے۔ اور ۱۹۱۲ء میں جواہر لعل نہرو اور میرے والد محترم پروفیسر بادن خاں شروانی مرحوم نے ایک ساتھ بیرسٹری پاس کی تھی۔ سر راس مسعود کا نہ لارڈ ریکز (وائسرائے) کی ایما کے اس دور میں مسلم یونیورسٹی میں کسی کو مدعو کرنا بعید از قیاس ہے اسلیے جواہر لعل نہرو کے علی گڑھ جانے پر وائسرائے پر اگر اعتراض کیا ہو گا تو بیحد نامناسب ہو گا۔

اس سے قبل ۱۹۱۰ء میں جب گاندھی جی نے علی گڑھ جانے کا اور وہاں مسلم یونیورسٹی میں از خود معائنہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اس زمانہ میں پروفیسر بادن خاں شروانی مرحوم نے علیگڑھ میں انڈین نیشنل کانگرس کے دفتر کے اراکین کی بیٹھک سے گاندھی جی کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے گاندھی جی نے اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ صرف پانچ منٹ جیسے میں تقریر کریں گے، پھر مسلم یونیورسٹی جائیں گے۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی میں گاندھی جی نے ڈھائی گھنٹے گزارے اور کسی انگریز افسر یا وائسرائے نے قطعی اعتراض نہیں کیا تھا۔ تسلی کے لیے ۱۹۰۱ء کا اسٹریچی کالیجیٹ ملاحظہ کریں۔

حرفے چند

لاروش فوکو کے مقولے

ایک تعارف

ڈاکٹر نظیر صدیقی

مقصد صرف غیر معمولی مقاصد سے دلچسپی ہو سے ہیں ملاحیت تھی سلاب کے دھیمی
ہی۔ مہاں کے طور پر کیونکہ نے اپنے ایک مضمون کا مقدمہ میں

"جس شخص کو سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ دھوکا دیا جا سکتا ہے وہ اپنی ذات سے"

آپ کے خیالی دنیا سے متعلق سب سے بڑا مغالطہ ہے کہ دوسروں کو ان کے بیان سے کیسے
روکا جائے:

"کہ آپ کو حق بجانب ہونے کا یقین ہے تو آپ خاموش رہ سکتے ہیں۔"

رخود غلط" دی ہیں بلیں جنتیا کیونکہ وہ اپنے خیال میں پہلے سے ہی موجود مواد سے مہاں سے
مواد چاہیے۔

"تو ہی چیزیں لکھنے جو پڑھنے کے قابل ہیں، یا جو کام کرنے جو لکھنے کے قابل ہیں"

خود مختار زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ ہے خالی کے سوا فارغی طریقے موجود ہیں
مقالے ہمارے دماغ میں لکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر لکھنے کے دوران کہیں سے بٹ جاتے ہیں جن
ہی مقالے ان تمام خوبیوں پائی جاتی ہیں زیادہ تر مقولے صاحب طرز نگاروں کے ہاں ملتے ہیں
مقدمہ نگاری عام نگاروں کے بس کی بات نہیں ایک اچھے مقولے میں ایک اچھے نثر کی تمام
خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک اچھے نثر کی طرح ایک اچھے مقولے میں ایجاز بیان کی متانت اور
عبارت بیان بھی۔ انگریزی ادب میں شیکسپیر کے مکالموں کے علاوہ بھی بصیرت آمیز و حکمت موتیوں کا
بہت بڑا حصہ ہے۔ بعد انگریزی ادب میں لارڈ بیکن (۱۵۶۱ء-۱۶۲۶ء) ایک ایسا شاہکار ہے
جس کا ہر مقدر مقولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ڈکنز جالس جو انگریزی کے دو ایک مضحکہ ترین مزاح نگاروں
میں شمار کیا جاتا ہے اس کی گفتگو، اس کے سریع نگار اور ذہین نے محفوظ کیا ہے، کے بہت
سے جملوں میں مقولوں کی ملاحت اور جمال (WIT) موجود ہے عہد حاضر کے انگریزی نظم
میں برنرڈ شا اور جیسے ان بہت مقدر نثر نگاروں میں سے تھے۔ ان دونوں کی تحریروں میں کثرت سے
مقولے ملتے ہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ تحریری دونوں میں سب سے بڑا مقولہ نگار آسکر وائلڈ

سازش کیا جا سکتا ہے۔

پروشنی ڈالتے ہیں۔

کوئی توقع نہیں تھی۔ اس کا ایک ملازم تھا جس کا نام گورڈن (GORDON) تھا جس کا تذکرہ ہی وہ چھوڑا تھا اور اس کی عمر بیس کے دوران دوست معلوم کیا تھا۔ اس نے اس حساب منگنی اور فرنسز کرنے کا تجربہ دیا۔ گوردیل کے تشدد اور ان مدد کی بدولت لارڈ شفٹس بری کو کی تنہائی اور تلخی کے ایام کی شدت کم ہو گئی۔ گوردیل ایک جاں نثار دوست ثابت ہوا۔

۱۸۵۹ء میں جب لارڈ شفٹس بری پیرس میں مقیم تھا (MME DE BODENI) کے جلنے سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا۔ وہ خاتون اس کی زندگی میں دوسرا عظیم نسوانی تجربہ ثابت ہوئیں ان کی عمر اس وقت چالیس سال کے قریب تھی وہ اپنی بیمار اور تنہا شوہر کے ساتھ ایک پرسکون اور طمانیت زندگی بسر کر رہی تھیں ان کی بیرونی ایک بیٹی تھی۔ لارڈ شفٹس بری جو ان کے گھر کے قریب رہتا تھا ان کے ہاں اکثر آتا جاتا تھا۔ اس کی ملاقات ان کی دوستوں کو پسند تھی ان کا نفیس نفاست ادب اور لطافت سے عاری ہیں میں صفائی اور نکھار میں وضاحت انہیں بہت مرغوب تھی ان کا عقد حساب لارڈ شفٹس بری کے لئے مضبوط ماحول ثابت ہوا۔ اندرونی طور پر وہ ایک بہت ہی ذہنی فطرت کا نفیس حساس اور شائق طبیعت کا مالک خوش گو اور خوش مزاج تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بہترین سال حاصل کر رہا تھا جس کی خوبیوں کو وہ بعد میں اپنی تحریروں میں بیان کرتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ان میں محبت کے حصول کے لئے جو کوششیں اس نے کی تھیں وہ سے سودا ثابت ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر سیمس (DR. SIMMS) بہت جلد ہی مقبول حاصل کرنے میں کامیاب تھا۔

اس میں ۱۸۶۱ء (۱۸۶۱ء) سے پہلے حلقے سے تعلق رکھنے والی مدنی کے عقد اول میں داخل ہوئی ہے۔ ان اور طرز کے لوگ سے پہلے ۱۸۶۰ء میں مدنی سے عقد کر کے بعد عظیم تر فرنسیسی پیشہ ور زندگی پر دسترس حاصل کر لی تھی وہ ۱۸۶۰ء کے عشرے کے ادبی حلقوں کے ستارے فرنسیسی زبان جس صفائی صحت اور پاکیزگی سے لکھتے رہے۔ اس حلقوں کے نزدیک معجزہ ہیں۔ ان حلقوں کے ارکین کا مقصد دلچسپ اور پاکیزہ گفتگو کے شغف اور رواج کرنا تھا۔ اس لئے وہ سیاست اور مذہب جیسے موضوعات سے احتراز کرتے تھے جو کہ ان موضوعات پر گفتگو میں عمر ناتمی آجانے کے کوشش یہ ہوتی تھی ماحول میں شائستگی اور عمل سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر بات چیت کی جائے۔ مرد اور عورت کے درمیان خوشگوار تعلقات کے فروغ، اس طرح کے موضوع پر گفتگو پسند کی جاتی تھی کہ کسی مرد اور عورت کے درمیان باہمی دلچسپی کا آغاز کہاں سے ہوا اور دونوں جنسوں کے لوگوں سے گزر کر شوہر کی محبت تک اس قسم کی دلچسپیاں اور شخصی خاکے لکھنے کا رواج عام تھا۔ خاص حلقوں میں بھی خوشگوار [illegible]

We always dread the sight of the person we love when we have been coquetting elsewhere.

We ought to console ourselves for our faults when we have strength of mind to confess them.

To be confident of pleasing is often an infallible means of displeasing.

There is a kind of revolution of so general a character that it changes the mental tastes as well as the fortunes of the world.

We like to divine others, but we do not like to be divined ourselves.

Preserving the health by too strict a regimen is a wearisome malady.

The generality of women yield through weakness rather than through passion. Hence it is that enterprising men succeed generally better than others, although they may not be the most amiable.

Coldness in love is a sure means of being beloved.

In mankind is not found any great excess either of good or evil.

Those who are incapable of committing great crimes do not easily suspect others of them.

The pomp of funerals is more interesting to the vanity of the living than to the memory of the dead.

Men more easily set bounds to their gratitude than to their hopes or their desires.

We do not always regret the loss of friends in consideration of their merit, but in consideration of our wants, and of the good opinion they entertained of us.

To be always good others must believe that they can never appear wicked to us with impunity.

The most subtle folly is produced by the most subtle wisdom.

Great souls are not those which have less passion and more virtue than common souls, but those only which have greater designs.

Kings do with men as with pieces of money—they give them what value they please, and we are obliged to receive them at their current, and not at their real value.

Natural ferocity makes fewer cruel people than self-love.

There are some crimes which become innocent, and even glorious, by their renown, their number, and their excess. Hence it is that public robberies become proofs of talent, and seizing whole provinces unjustly is called making conquests.

experience at the good fortune of our friends does not always arise from the goodness of our nature, nor from the friendship we have for them. It is more often a result of self-love which flatters us with the hope of being fortunate in our turn, or of deriving some advantage from their good fortune.

In the adversity of our best friends we often find something which does not displease us.

How can we expect another to keep our secret if we cannot keep it ourselves?

There are no people who are so troublesome to others as the indolent: when they have satisfied their indolence they wish to appear diligent.

It is a proof of very little friendship not to notice a cooling in that of our friends.

Moderation is like temperance; we should wish to eat more, but are afraid of injuring our health.

Every one blames in his neighbour what the world blames in himself.

It is a kind of happiness to know to what extent we may be unhappy.

When we cannot find contentment in ourselves, it is useless to seek it elsewhere.

We must be able to answer for our fortune to be able to answer for our future conduct.

Justice in moderate judges is only love of their elevation.

When we are tired of loving we are very glad of some act of infidelity towards ourselves to disengage us from our own fidelity.

The first movement of joy which we

with it to work its own destruction, because, at the same time that it is overthrowing itself in one place it is re-establishing itself in another. When we suppose that it is relinquishing its pleasures, it does nothing but suspend or vary them; and even when defeated, and supposed to be annihilated, we find it triumphing in its own defeat. This is the picture of self-love, the whole existence of which is nothing but one long and mighty agitation. The sea is a sensible image of it, and self-love finds in the ebb and flow of the waves a faithful representation of the turbulent succession of its thoughts, and of its ceaseless movements.

Moderation in good fortune is commonly nothing but dread of the shame which attends excessive elation, or fear of losing what we possess.

it, but which it pursues because it wills to have them. It is whimsical, and often throws its whole application into the most frivolous pursuits; it finds its whole delight in the most insipid, and preserves all its pride in the most contemptible. It is present to all states and in all conditions of life; it lives everywhere, it lives on everything; it lives on nothing. It accommodates itself to advantages, and to the deprivation of them; it even goes over to the side of those who are at war with it; it enters into their schemes, and, what is wonderful, it joins them in hating itself, it conspires its own destruction, it labours for its own ruin. In short, it cares for nothing but its own existence, and, provided that it do exist, will readily become its own enemy. We must not be surprised, therefore, if it unites with the most rigid austerity, and enters boldly into league

cruel, timid and daring; it has various inclinations according to the various temperaments which affect it, and devote it, sometimes to glory, sometimes to riches, and sometimes to pleasure; it changes them according to the changes of our age, our fortune, and our experience. It is indifferent to it, whether it has many inclinations, or only one, because it shares itself among many, or collects itself into one as may be necessary or agreeable to it. It is inconstant, and, besides the changes which arise from external causes, there are an infinity which spring from itself, and from its own resources. It is inconstant from inconstancy, from levity, from love, from novelty, from weariness, from disgust. It is capricious, and we sometimes see it labouring with extreme earnestness and with incredible toil, to obtain things which are by no means advantageous, and even hurtful to

much so, that one is tempted to believe that each of our passions has a magic peculiar to itself. Nothing is so close, and so firm as its attachments, which it vainly endeavours to break off at the appearance of the extreme evils which menace it. Sometimes, however, it accomplishes in a short time, and without effort, what it had not been able to effect in the course of several years with all the efforts in its power: whence we may conclude, not unjustly, that its desires are excited by itself, rather than by the beauty and merit of their object; that its own taste is the price which gives them value, and the cosmetic which sets them off; that it is only itself which it pursues, and that it follows its own taste when it follows things after its taste. It is a compound of contraries, it is imperious and obedient, sincere and dissembling, compassionate and

is unable to recognise them, or cannot resolve to own them. From this darkness which conceals it, spring the ridiculous ideas it has of itself; hence come its errors, its ignorances, its grossness, and its follies with respect to itself. Hence it comes that it fancies its sentiments dead when they are only asleep, it thinks that it has no desire to arise from its repose, and believes that it has lost the appetites which it has satiated. But this thick darkness which conceals it from itself does not prevent its seeing perfectly every external object — in this, resembling our eyes, which see everything, and are only blind to themselves: in fact, in its greatest interests and in its most important affairs, where the violence of its desires calls for all its attention, it sees, it perceives, it understands, it imagines, it suspects, it penetrates, it divines every thing; so

makes men idolise themselves, and would make them tyrants over others if fortune were to give them the means. It never reposes out of itself, and only settles on strange objects, as bees do on flowers, to extract what is useful to it. There is nothing so impetuous as its desires, nothing so secret as its plans, nothing so clever as its conduct. Its pliancy cannot be depicted, its transformations surpass those of Ovid's 'Metamorphoses,' its refinements those of chemistry. We cannot sound the depths, nor penetrate the darkness of its abysses. There it is concealed from the keenest eyes, it goes through a thousand turns and changes. There it is often invisible to itself; it conceives, nourishes, and brings up, without being conscious of it, a vast number of loves and hates. Some of these it forms so monstrous, that when brought to light it

time ago amused himself with dancing on the scaffold on which he was about to be executed. Thus, though motives may differ, they often produce the same effects. So that it is true that whatever disproportion there may be between great men and common people, both the one and the other have been a thousand times seen to meet death with the same countenance; but it has been with this difference, that in the contempt which great men show for death it is the love of glory which hides it from their view; and in common people, it is an effect of their want of intelligence which prevents their being acquainted with the greatness of their loss, and leaves them at liberty to think of other things.

Self-love is the love of one's self, and of every thing on account of one's self; it

It is flattering ourselves to believe that death appears to us when near, what we fancied it at a distance, and that our sentiments, which are weakness itself, are of a temper so strong as not to suffer from the attack of the harshest of trials. It is also but a poor acquaintance with the effects of self-love, to think that it can aid us in treating lightly what must necessarily destroy itself, and reason, in which we think to find so many resources, is too weak in this encounter to persuade us of what we wish. On the contrary, it is reason which most frequently betrays us, and instead of inspiring us with the contempt of death serves to reveal to us all that it has dreadful and terrible. All that reason can do for us is to advise us to turn away our eyes from death, to fix them on other objects. Cato and Brutus chose illustrious ones. A lacquey a short

the shipwreck. To put a good face on the matter, let us content ourselves with not discovering to ourselves all that we think of it, and let us hope more from our constitutions than from those feeble reasonings which would make us believe that we can approach death with indifference. The credit of dying with firmness; the hope of being regretted; the desire of leaving a fair reputation; the certainty of being freed from the miseries of life, and of no longer depending on the caprices of fortune, are remedies which we should not reject. But at the same time we should not believe that they are infallible. They do as much to assure us as a simple hedge in war does to assure those who have to approach a place to the fire of which they are exposed. At a distance it appears capable of affording a shelter, but when near it is found to be a feeble defence.

itself in different shapes to their imagination, and appearing more instant at one time than at another. Thus it results that after having despised what they knew nothing of they end by fearing what they do know. If we would not believe that it is the greatest of all evils, we must avoid looking it and all its circumstances in the face. The cleverest and bravest are those who take the most respectable pretexts to prevent themselves from reflecting on it; but any man who is able to view it in its reality finds it a horrible thing. The necessity of dying constituted all the firmness of the philosophers. They conceived they should go through with a good grace what they could not avoid, and as they were unable to make their lives eternal, they had nothing left for it but to make their reputations eternal, and preserve all that could be secured from

opinion is never sincere. Every thing however has been written which could by possibility persuade us that death is not an evil, and the weakest men as well as heroes have given a thousand celebrated examples to support this opinion. Nevertheless, I doubt whether any man of good sense ever believed it, and the pains men take to persuade others and themselves of it let us see that the task is by no means easy. We may have many causes of disgust with life, but we never have any reason for despising death. Even those who destroy their own lives do not reckon it as such a little matter, and are as much alarmed at and recoil as much from it as others, when it comes upon them in a different way from the one they have chosen. The inequality remarkable in the courage of a vast number of brave men arises from the fact of death presenting

passion, without being so with the person they love.

Love, all agreeable as it is, is more pleasing from the manner in which it displays itself than from its own nature.

A small degree of wit accompanied by good sense is less tiresome in the long run than a great amount of wit without it.

Jealousy is the greatest of all evils, and the least pitied by those who cause it.

After having spoken of the falsity of so many apparent virtues it is reasonable to say something of the falsity of the contempt of death; I mean that contempt of death which the Pagans boast of deriving from their own strength, without the hope of a better life. There is a difference between enduring death with firmness, and despising it. The first is common enough, but the other in my

lightens them, and gives them views so just as to make them suppress or disguise the least things which might be condemned.

Young people on entering the world should be either timid or giddy: a composed and settled demeanour generally changes into impertinence.

Quarrels would not last long, if the fault was only on one side.

It is of no advantage to a woman to be young without being pretty, or to be pretty without being young.

There are some persons so fickle and frivolous, that they are as far from having real faults as solid qualities.

There are some people so full of themselves, that when they are in love, they find means to be occupied with their

these they cultivate with so much assiduity, that they become at length natural defects which are no longer capable of correction.

One fact which lets us see that men are better acquainted with their faults than is generally thought, is, that they are never wrong when they speak of their own conduct; the same self-love which generally blinds, on such occasions en-

to believe that it is false, or suppose it capable of crimes.

Men often proceed from love to ambition, but they seldom return from ambition to love.

Extreme avarice almost always mistakes itself; there is no passion which more often deprives itself of its object, nor on which the present exercises so much power to the prejudice of the future.

Avarice often produces opposite effects; there is an infinite number of people who sacrifice all their property to doubtful and distant expectations; others despise great future advantages to obtain present interests of a trifling nature.

It would seem that men do not find enough defects in themselves; they augment the number by certain singular qualities which they affect to put on, and

remains of a passion, we are more ready to receive a new one than when we are entirely cured.

Those who have had great passions find themselves during the whole of their lives both happy and unhappy at being cured of them.

There are even more people without interest than without envy.

We have more indolence in the mind than in the body.

The calm or agitation of our temper does not depend so much on the important events of life, as on an agreeable or disagreeable adjustment of little things which happen every day.

However wicked men may be, they dare not appear to be enemies of virtue; and when they wish to persecute, they pretend

gentle are in general only of a weak character, which easily changes into asperity.

Timidity is a fault for which it is dangerous to reprove persons whom we wish to correct of it.

Nothing is so rare as real goodness of heart; even those who fancy they are possessed of it, have in general only complaisance or weakness of character.

The mind attaches itself from indolence and from constancy to whatever is easy and agreeable to it. This habit always sets limits to our knowledge, and no one ever took the trouble to enlarge and guide his mind to the extent of its capacities.

Men are more satirical from vanity than from malice.

When the heart is still agitated by the

Rare as is true love, true friendship is still rarer.

There are few women whose merit outlives their beauty.

The desire of being pitied, or admired, often makes the greatest part of our confidence.

Our envy always outlives the happiness of those we envy.

The same firmness which serves to resist love serves also to render it violent and durable, and weak persons who are always agitated by passions are scarcely ever really taken up with it.

Imagination cannot invent so many different contrarieties as naturally exist in the heart of every individual.

It is only persons of firmness that can have real gentleness; those who appear

Of all violent passions, that which sits least ill on women is love.

Vanity makes us commit more faults against our taste than reason does.

There are some bad qualities which make great talents.

Men never wish ardently for what they only wish for from reason.

All our qualities are uncertain and doubtful, as well in good as in evil, and they are almost always at the mercy of conjunctures.

In their first passions women love the lover, in the others they love love.

Pride has its oddities as well as other passions: men are ashamed to avow that they are jealous, and yet take a pride in having been and in being capable of becoming so.

There are many cures for love, but none of them infallible.

We are very far from knowing all that our passions make us do.

Old age is a tyrant, which prohibits all the pleasures of youth upon pain of death.

The same pride which makes us censure the faults from which we fancy ourselves exempt, induces us to despise the good qualities which we want.

There is often more pride than goodness in our sorrow for the misfortunes of our enemies; it is to make them feel that we are superior to them that we give them marks of our compassion.

There is an excess of good and evil which passes our sensibility.

Innocence is very far from finding as much protection as crime.

In important affairs we ought not so much to apply ourselves to create opportunities, as to make use of those which present themselves.

It would seldom be a bad bargain for us to renounce the praise, on condition of escaping the censure of the world.

Whatever disposition the world may have to judge incorrectly, it more often shows favour to false, than injustice to true, merit.

We sometimes see a fool with wit, but never one with judgment.

We should gain more by letting ourselves be seen such as we are, than by attempting to appear what we are not.

Our enemies come nearer the truth in their judgments of us, than we do in our judgment of ourselves.

Propriety is the least of all laws, and the most obeyed.

A well-regulated mind has less difficulty in submitting to ill-regulated ones than in governing them.

When fortune surprises us by bestowing on us an important office, without having conducted us to it by degrees, or without our being elevated to it by our hopes, it is almost impossible that we should sustain ourselves in it with propriety, and appear worthy of possessing it.

Our pride is often increased by what we retrench from our other faults.

There are no fools so troublesome as those who have some wit.

There is no man who thinks himself in any of his qualities inferior to the man he esteems the most in the world.

that it is insipid when they have once tasted of love.

In friendship, as in love, we are often more happy from the things we are ignorant of, than from those we are acquainted with.

We endeavour to make a merit of faults that we are unwilling to correct.

The most violent passions leave us some moments of relaxation, but vanity always agitates us.

Old fools are more foolish than young ones.

Weakness is more opposed to virtue than vice is.

What renders the pangs of shame and of jealousy so acute is, that vanity cannot help us to support them.

proofs of their friendship, but we always owe sensibility to their misfortunes.

Fortune and humour govern the world.

It is more easy to become acquainted with men in general, than with any man in particular.

We should not judge of a man's merit by his good qualities, but by the use he can make of them.

There is a certain lively gratitude which not only acquits us of the obligations we have received, but by paying what we owe them makes our friends indebted to us.

We should desire few things ardently if we had a perfect knowledge of what we were desiring.

What causes the majority of women to be so little touched by friendship is,

with friendship, and the generality of devotees disgust us with devotion.

We easily pardon in our friends those faults which do not concern ourselves.

Women who love more readily pardon great indiscretions than little infidelities.

In the old age of love, as in that of life, we still live for its evils, but no longer for its pleasures.

Nothing so much prevents our being natural as the desire of appearing so.

To praise good actions heartily is in some sort to take part in them.

The truest mark of being born with great qualities is being born without envy.

When our friends have deceived us, we owe nothing but indifference to the

cowards suffer themselves to be killed through fear of defending themselves.

Confidence contributes more than wit to conversation.

All the passions make us commit faults, but love makes us commit the most ridiculous ones.

Few people know how to be old.

We often take credit for faults opposite to those we have; when we are weak we boast of being obstinate.

Penetration has an air of divination, which flatters our vanity more than all the other qualities of the mind.

The grace of novelty, and long habit, however opposite they may be, equally prevent our perceiving the faults of our friends.

The generality of friends disgust us

Our wit sometimes enables us to commit follies with impunity.

The vivacity which augments with years is not far from folly.

In love, he who is earliest cured is always best cured.

Young women who do not wish to appear coquettes, and men of advanced age who do not wish to appear ridiculous, should never speak of love as a thing with which they can have anything to do.

We may appear great in an employment beneath our merit, but we often appear little in one too great for us.

We often fancy that we have constancy in our misfortunes, while we have nothing but depression of spirit; and we endure them without looking them in the face, as

The most dangerous weakness of old people who have been amiable is to forget that they are no longer so.

We should often be ashamed of our best actions if the world could see all the motives which produced them.

The greatest effort of friendship is not to show our own faults to a friend, but to make him see his own.

We have few faults which are not more excusable than the means we take to conceal them.

Whatever disgrace we have merited, it is almost always in our power to re-establish our reputation.

A man does not please long when he has only one species of wit.

Madmen and fools see only through their humour.

would be badly rewarded if we were not very glad to purchase their absence.

It seems that nature has concealed at the bottom of our minds talents, and abilities of which we are not aware. The passions alone have the privilege of bringing them to light, and of giving us sometimes views more certain and more perfect than art could possibly produce.

We arrive complete novices at the different ages of life, and we often want experience in spite of the number of our years.

Coquettes make a merit of being jealous of their lovers, to conceal their being envious of other women.

Those who are over-reached by our cunning are far from appearing to us as ridiculous as we appear to ourselves when the cunning of others has over-reached us.

more above them than birth, dignity, or even merit itself.

There is merit without elevation, but there is no elevation without some merit.

Elevation is to merit what dress is to a handsome person

Fortune sometimes makes use of our faults in order to elevate us; and there are some troublesome people whose merit

The first lover is kept a long time—when a second is not taken.

We have not courage to say, as a general proposition, that we have no faults, and our enemies have no good qualities; but, in detail, we are not far from thinking so.

Of all our faults, that which we most readily admit is indolence. We persuade ourselves that it cherishes all the peaceful virtues; and that, without entirely destroying the others, it merely suspends their functions.

There is a kind of elevation which does not depend on fortune. It is a certain air which distinguishes us, and seems to destine us for great things; it is a price which we imperceptibly set on ourselves. By this quality we usurp the deference of other men; and it puts us, in general,

Men more easily renounce their interests than their tastes.

Fortune never appears so blind as she does to those on whom she confers no favours.

We should manage our fortune as we do our health—enjoy it when good, be patient when it is bad, and never apply violent remedies except in an extreme necessity.

Rusticity is sometimes got rid of in the camp, but never at the court.

A man may be more cunning than another, but not more cunning than all others.

We are sometimes less unhappy in being deceived by those we love than in being undeceived by them.

The desire of talking of ourselves, and of making our faults appear in the light we wish them, constitute a great part of our sincerity.

We ought only to be astonished that we are still able to be astonished.

Men are almost equally difficult to satisfy when they have very much love, and when they have scarcely any left.

There are few people who are more often in the wrong than those who cannot endure to be so.

A fool has not stuff enough to be good.

If vanity does not entirely overthrow the virtues, at least it makes them all totter.

What renders the vanity of others insupportable, is that it wounds our own.

condemn every thing which is beyond their range.

Envy is destroyed by true friendship, and coquetry by true love.

The greatest fault in penetration is not the not reaching the mark, but overshooting it.

We give advice, but we do not inspire conduct.

When our merit gives way, our taste gives way also.

Fortune displays our virtues and our vices, as light makes all objects apparent.

The constraint we put on ourselves to remain faithful to a person we love is scarcely better than an infidelity.

Our actions are like 'bout rimes,' which every one makes refer to whatever he pleases.

like hidden treasures, only safe because they are not sought for.

The violence we do ourselves to prevent falling in love is often more cruel than the severity of the loved object.

There are few cowards who know the extent of their fear.

It is almost always the fault of the lover not to know when he is no longer loved.

The generality of young people fancy that they are natural, when they are only ill-bred and coarse.

There are certain tears which often deceive ourselves, after having deceived others.

If a man fancies he loves his mistress for her own sake, he is much mistaken.

Minds of moderate calibre ordinarily

to speak very little of our wives; but we do not sufficiently know that we ought to speak still less of ourselves.

There are some good qualities which degenerate into faults when they are natural, and others which are never perfect when they are acquired. It must be reason, for instance, that should render us careful of our property and our confidence; and, on the contrary, it must be nature that should bestow on us goodness and courage.

Whatever distrust we may have of the sincerity of those who converse with us, we always believe that they tell us more truth than they do to others.

There are few virtuous women who are not weary of their profession.

The generality of virtuous women are

Infidelities ought to extinguish love, and we should not be jealous, even when we have reason to be so; it is only persons who avoid causing jealousy who are worth being jealous of.

People suffer more in our opinion, from the smallest infidelities committed towards ourselves, than from the greatest towards others.

Jealousy is always born with love, but it does not always die with it.

The generality of women mourn the death of their lovers not so much from the love they bore them as to appear more worthy of being loved.

The violences that others do to us are often less painful than those we put on ourselves.

We know well enough that we ought

A man of sense may love like a madman, but never like a fool.

There are certain faults which, when turned to good account, gain more reputation than virtue itself.

There are some persons whom, when we lose, we regret more than we mourn; and others whom we mourn and scarcely regret.

In general we only praise heartily those who admire us.

Little minds are too much hurt by little things. Great minds perceive them all, and are not touched by them.

Humility is the true proof of Christian virtues: without it, we retain all our faults, and they are only hidden by pride, which conceals them from others, and often from ourselves.

Opportunities make us known to others, and still more to ourselves.

There can be no regulation in the minds nor in the hearts of women, unless their temperament is in unison with it.

We think very few people sensible except those who are of our opinion.

In love we often doubt what we most believe.

The greatest miracle of love is the cure of coquetry.

What makes us so sore against those who practise artifices upon us, is that they fancy themselves cleverer than us.

It is very troublesome to come to a rupture when we no longer love.

We are almost always wearied in the company of persons with whom we are not permitted to be weary.

When our hatred is too keen, it places us beneath those we hate

We feel our good and our bad fortune solely in proportion to our self-love.

The intellect of the generality of women serves more to fortify their folly than their reason.

The passions of youth are scarcely more opposed to safety than the lukewarmness of age.

The accent of a man's native country dwells in his mind and in his heart as well as in his speech.

To be a great man one must know how to profit by the whole of one's fortune.

The generality of men have, like plants, latent properties, which chance brings to light.

We forgive so long as we love.

It is more difficult for a man to be faithful to his mistress when he is favoured than when he is ill-treated by her.

Women know not the whole of their coquetry.

Women never have a complete severity of demeanour except towards those whom they dislike.

Women can less easily surmount their coquetry than their passions.

In love deceit almost always goes further than mistrust.

There is a certain kind of love the excess of which prevents jealousy.

It is with certain good qualities as with the senses; those who are entirely deprived of them can neither appreciate nor comprehend them.

It is only those who are despicable who fear being despised.

Our wisdom is not less at the mercy of fortune than our property.

In jealousy there is more self-love than love.

We often console ourselves through weakness for evils in which reason is powerless to console us.

Ridicule dishonours more than dishonour.

We confess our little faults only to persuade others that we have no great ones.

Envy is more irreconcilable than hatred.

We sometimes fancy that we hate flattery, but in reality we only hate the manner of flattering.

our friends is not so much any distrust we have of them as the distrust we have of ourselves.

Weak persons cannot be sincere.

It is not a great misfortune to oblige ungrateful people, but it is an unsupportable one to be under an obligation to a vulgar man.

We find means to cure folly, but none to reclaim a distorted mind.

We cannot long preserve the sentiment we should have for our friends and benefactors if we often allow ourselves the liberty of speaking of their faults.

To praise princes for virtues they do not possess is to speak evil of them with impunity.

We are nearer loving those who hate us than those who love us more than we like.

life from which it requires a degree of madness to extricate ourselves well.

If there are men whose weak point has never appeared, it is because it has never been properly sought for.

The reason why lovers and their mistresses are never weary of being together is, that they always talk of themselves.

Why must we have memory enough to retain even the minutest details of what has happened to us, and not enough to remember how many times we have told them to the same person?

The extreme pleasure we take in talking of ourselves should make us fear that we give very little to those who listen to us.

What commonly prevents us from exhibiting the bottom of our hearts to

Interest, which is accused of all our crimes, often deserves to be praised for our good actions.

We seldom find people ungrateful as long as we are in a condition to render them services.

It is as honourable to be boastful to ourselves as it is ridiculous to be so to others.

Men have made a virtue of moderation to limit the ambition of the great, and to console people of mediocrity, for their want of fortune and of merit.

There are some people fated to be fools, who not only commit follies from choice, but are compelled to commit them by fortune.

There happen sometimes accidents in

There are people enough who despise wealth, but few who know how to bestow it.

It is generally only in petty interests that we run the hazard of not trusting to appearances.

In whatever respect people may praise us, they never teach us anything new.

We often pardon those who weary us, but we cannot pardon those whom we weary.

The humours of the body have a stated and regular course, which impels and imperceptibly guides our will. They cooperate with each other, and exercise successively a secret empire within us; so that they have a considerable part in all our actions, without our being able to know it.

Gratitude in the generality of men is only a strong and secret desire of receiving greater favours.

Almost every one takes a pleasure in requiting trifling obligations; many people are grateful for moderate ones: but there is scarcely any one who does not show ingratitude for great ones.

There are follies as catching as contagious disorders.

The merit of men has its season, as fruits have.

It may be said of men's humours as of many buildings, that they have divers aspects—some agreeable, others disagreeable.

Moderation cannot have the credit of combating and subduing ambition—they are never found together. Moderation is the languor and indolence of the soul, as ambition is its activity and ardour.

We always love those who admire us, and we do not always love those whom we admire.

We are very far from being acquainted with the whole of our will.

It is difficult to love those whom we do not esteem; but it is not less so to love those whom we esteem more than ourselves.

It is impossible to love a second time what we have once really ceased to love.

It is not so much fertility of invention which presents us with several expedients for attaining the same object, as it is want of intelligence which causes us to hesitate at every thing which presents itself to the imagination, and prevents our discerning at a glance which is the best.

There are certain affairs and diseases, the remedies of which only aggravate them at particular times; and great ability consists in knowing when it is dangerous to apply these remedies.

Affected simplicity is a refined imposture.

There are more faults in the humour than in the mind.

The approbation bestowed on those who are entering the world often arises from a secret envy of those already established in it.

Pride, which inspires us with so much envy, serves also to moderate it.

Some disguised falsehoods represent the truth so well, that it would be bad judgment not to be deceived by them.

There is sometimes as much ability in knowing how to profit by good advice as in arriving at a correct opinion ourselves.

Some bad people would be less dangerous if they had not some goodness.

Magnanimity is well enough defined by its name: nevertheless, we may say that it is the good sense of pride, and the most noble way of earning praise.

and increases great ones, as the wind extinguishes tapers and adds fury to fire.

Women often fancy themselves in love even when they are not. The occupation of an intrigue, the emotion of mind which gallantry produces, the natural leaning to the pleasure of being loved, and the pain of refusing, persuade them that they feel the passion of love, when, in reality, they feel nothing but coquetry.

What makes us often discontented with negotiators is that they almost always abandon the interest of their friends for that of the success of the negotiation, which becomes their own, from the credit of having succeeded in their undertaking.

When we dilate upon the affection of our friends, it is often less from gratitude than from a desire to convey an opinion of our own merit.

Youth is perpetual intoxication; it is the fever of reason.

Nothing ought more to humiliate men who have deserved great praise than the care which they still take to derive consequence from trifles.

Some people obtain the approbation of the world, whose only merit consists in the vices which serve to carry on the commerce of life.

The charm of novelty is in love what the bloom is on fruits: it gives a lustre which is easily effaced, and which never returns.

Good nature, which boasts of so much sensibility, is often stifled by the most petty interest.

Absence diminishes moderate passions

Readiness to believe evil without sufficient examination is the result of pride and indolence. We wish to find people guilty, and we do not wish to give ourselves the trouble of examining into the crimes.

We take exceptions to judges who are in the least degree interested, and yet we are quite willing that our reputation and our fame should depend on the judgment of men who are all opposed to us, either from jealousy, or from prejudice, or from want of intelligence; it is only to induce them to decide in our favour that we peril in so many ways our repose and our lives.

Scarcely any man is clever enough to know all the evil he does.

Honour acquired is security for that which should be acquired.

misfortunes in those of others; it is a clever foresight of the evils into which we may fall. We succour others in order to engage them to succour us in similar circumstances; and the services we render them are, to speak properly, a good which we do to ourselves by anticipation.

Narrowness of mind is the cause of obstinacy—we do not easily believe what is beyond our sight.

It is deceiving ourselves to fancy that it is only the violent passions, such as ambition and love, which can triumph over the others. Indolence, all languid as it is, nevertheless is frequently their master; it spreads its dominion over all the designs and all the actions of life, and thus destroys and insensibly consumes the passions and the virtues.

Good taste springs more from judgment than from intellect.

The pleasure of love is in loving. We are happier in the passion we feel than in that we excite.

Civility is a desire to receive it in turn, and to be accounted well bred.

The education commonly given to the young is a second self-love with which they are inspired.

There is no passion in which self-love reigns so powerfully as in love; and we are often more disposed to sacrifice the peace of the loved object than to lose our own.

What is called liberality is most often only the vanity of giving, which we like better than the thing we give.

Pity is often a perception of our own

pride which abases in order to exalt itself; and though it transforms itself in a thousand different ways, it is never better disguised and more capable of deceiving than when it conceals itself under the garb of humility.

All the sentiments have a tone of voice, gestures, and countenances, peculiar each to itself: and this conformity, as it is good or bad, agreeable or disagreeable, causes people to be pleasing or displeasing.

In all the professions every one affects a particular look and exterior, in order to appear what he wishes to be thought, so that it may be said the world is made up of appearances.

Gravity is a mystery of the body, invented to conceal the defects of the mind.

Magnanimity despises everything to gain everything.

There is as much eloquence in the tone of voice, in the eyes, and in the air of a speaker, as in his choice of words.

True eloquence consists in saying all that is necessary, and nothing but what is necessary.

There are some persons on whom their faults sit well, and others who are made ungraceful by their good qualities.

It is as common to see a change of tastes, as it is uncommon to see a change of inclinations.

Interest brings into play every sort of virtue and every sort of vice.

Humility is often only a feigned submission, of which we make use to render others submissive. It is an artifice of

We often inconvenience others, when we fancy we can never possibly do so.

Nothing is impossible: there are ways which lead to every thing; and if we had sufficient will we should always have sufficient means.

The sovereign ability consists in knowing thoroughly the value of things.

It is a great ability to be able to conceal one's ability.

What appears to be generosity is often nothing but a disguised ambition, which despises petty interests in order to reach greater ones.

The fidelity shown by the generality of men is only an invention of self-love to attract confidence—it is a means of raising ourselves above others, and of becoming depositaries of the most important affairs.

It is not so dangerous to do evil to the generality of men as to do them too much good.

Nothing flatters our pride so much as the confidence of the great, because we regard it as the result of our merit, without considering that it most frequently arises merely from vanity or from inability to keep a secret.

We may say of agreeableness, as distinct from beauty, that it consists in a symmetry of which we know not the rules, and a secret conformity of the features to each other, and to the air and complexion of the person.

Coquetry is the essential characteristic, and the prevalent humour of women; but they do not all practise it, because the coquetry of some is restrained by fear or by reason.

with so much obstinacy the most received opinions. They find the best places taken in the good party, and do not like to put up with inferior ones.

We easily console ourselves for the disgrace of our friends when it serves to signalise our affection for them.

It may seem that self-love is the dupe of good-nature, and that it forgets itself whenever we are labouring for the advantage of others. Nevertheless, it is taking the surest road to reach our objects; it is lending on usury under pretence of giving; it is in fact gaining over every one by a subtle and delicate method.

No man deserves to be praised for his goodness unless he has strength of character to be wicked. All other goodness is generally nothing but indolence or impotence of will.

really feel, they obstinately continue their tears, their complaints, and their sighs. They assume a doleful demeanour, and labour to persuade others by all their actions that their sorrow will only terminate with their lives. This miserable and fatiguing vanity is generally met with in ambitious women. As their sex bars them from all the paths of glory, they strive to render themselves celebrated by the display of inconsolable grief. There is yet another species of tears which have very petty sources, which flow easily, and as easily are dried: we weep to acquire the reputation of a tender heart; we weep to be pitied; we weep to be wept over; in fine, we weep to avoid the shame of not weeping.

It is more often from pride than from want of intelligence that people oppose

for the living. I call this a species of hypocrisy, because in this sort of grief we deceive ourselves. There is another hypocrisy which is not so innocent, inasmuch as it imposes on all the world. It is the affliction of certain persons who aspire to the distinction of a striking and perpetual grief. After time, which consumes all things, has put a stop to the sorrow they

Nothing is so contagious as example; and we never do any great good or great evil which does not produce its like. We imitate good actions from emulation, and bad ones from the depravity of our nature, which shame would keep prisoner, and example sets at liberty.

It is a great folly to wish to be exclusively wise.

Whatever pretext we may assign for our afflictions, it is often only interest or vanity which causes them.

There are divers sorts of hypocrisy in grief. In one, under pretext of lamenting the loss of a person who is dear to us, we lament ourselves, we lament the diminution of our advantages, of our pleasure, of our consideration. We regret the good opinion that was entertained of us. Thus the dead get the credit of tears which are only shed

It is not all who fulfil the duties of gratitude who can on that account flatter themselves that they are grateful.

What causes such a miscalculation in the amount of gratitude which men expect for the favours they have done, is, that the pride of the giver and that of the receiver can never agree as to the value of the benefit.

Too great eagerness to requite an obligation is a species of ingratitude.

Fortunate people never correct themselves. They always fancy they are in the right as long as fortune supports their ill conduct.

Pride does not like to owe, and self-love does not like to pay.

The good that we have received from any man should make us respect the evil that he does us.

enterprise for which they expose themselves.

Vanity, shame, and above all temperament, are often the causes of courage in men, and of virtue in women.

We are unwilling to lose our lives, and we wish to acquire glory. This is the cause of brave men having more tact and ability in avoiding death, than intriguing people have in preserving their fortunes.

There are very few persons who, in the first decline of life, do not let us see the points in which their bodies and minds will fail.

Gratitude is like the good faith of traders, it maintains commerce; and we often pay, not because it is just to discharge our debts, but that we may more readily find people to trust us.

Perfect valour is to do unwitnessed what we should be capable of doing before all the world.

Intrepidity is an extraordinary strength of mind, which raises it above the troubles, the disorders, and the emotions, which the sight of great perils is calculated to excite; it is by this strength that heroes maintain themselves in a tranquil state of mind, and preserve the free use of their reason under the most surprising and terrible circumstances.

Hypocrisy is the homage which vice renders to virtue.

The generality of men expose themselves in battle sufficiently to save their honour, but few are on all occasions willing to expose themselves as much as is necessary to insure the success of the

fears; others suffer themselves to be carried away by general panics; others go to the charge because they dare not remain in their posts. We find some in whom an acquaintance with petty dangers strengthens their courage, and prepares them to expose themselves to greater ones. Some are brave when sword in hand, and yet dread the fire of musketry; others are steady under fire, and fear the sword. All these different species of courage concur in this, that night, by augmenting fear and concealing good or bad actions, gives the privilege of being discreet. There is another species of discretion which is more general, for we never see a man perform as much in an encounter as he might do if he were sure of coming off safe; so that it is evident the fear of death subtracts something from courage.

others are often the causes of that valour so celebrated among men.

Valour in common soldiers is a dangerous trade which they have adopted to gain their livelihood.

Perfect bravery and thorough cowardice are two extremes which are seldom reached. The space between the two is great, and comprehends all other kinds of courage, between which there is as much difference as between countenances and dispositions. There are some men who expose themselves readily at the commencement of an action, and are disheartened and discouraged by its duration; some are content as soon as they have satisfied their reputation with the world, and do very little beyond this. We see some who are not at all times equally masters of their

If any one appears wise, it is only because his follies are proportioned to his age and fortune.

There are some silly people who know themselves, and make a clever use of their silliness.

He who lives without folly is not so wise as he thinks.

As we grow old we become more foolish and more wise.

Some people resemble ballads, which are only sung for a certain time.

The generality of people only judge of men by the fashion they are in, or by their fortunes.

Love of glory, fear of shame, the design of making a fortune, the desire of rendering our lives easy and agreeable, and the envious wish of lowering the fame of

is much mistaken; but he who thinks that others cannot do without him is still more mistaken.

Pretenders to virtue are those who disguise their faults from others as well as from themselves. The truly virtuous know their imperfections and confess them.

A truly virtuous man is he who prides himself upon nothing.

Severity of demeanour in women is a species of decoration and paint which they add to their beauty.

The virtue of women is often love of their reputation and of their quiet.

It is to be a truly virtuous man to wish to be always exposed to the view of virtuous people.

Folly pursues us in every period of life.

We easily forget our faults when they are only known to ourselves.

There are some people of whom we should never have believed evil unless we had seen it, but there are none at whom we ought to be surprised when we do see it.

We enhance the reputation of some with a view of depreciating that of others: and sometimes we should not praise the Prince de Condé and M. de Turenne so much, if we did not wish to blame them both.

The desire of appearing clever often prevents our becoming so.

Virtue would not travel so far if vanity did not keep her company.

He who thinks he can find in himself the means of doing without others

we must successively lodge; and I doubt whether experience would make us avoid them if we were to travel the same road a second time.

When our vices quit us we flatter ourselves with the belief that it is we who quit them.

There are relapses in the disorders of the soul as well as in those of the body. What we take to be our cure is most often nothing but an intercourse or a change of the disorder.

The faults of the soul are like wounds in the body. Whatever care we take to cure them the scar always appears, and they are every moment in danger of re-opening.

What often prevents our abandoning ourselves to a single vice is, our having more than one.

We do not despise all those who have vices, but we despise all those who have not a single virtue.

The name of virtue is as serviceable to interest as vice is.

The health of the soul is no more secure than that of the body; and though we may appear free from passions, we are in quite as much danger of being carried away by them as we are of falling sick when we are in health.

It would seem that nature has prescribed to every one from the moment of his birth certain limits for virtue and vice.

It belongs only to great men to have great faults.

It may be said that the vices await us in the journey of life like hosts with whom

There is a kind of inconstancy which arises from levity of mind, or from its weakness causing it to receive all the opinions of others. There is another kind, more excusable, which comes from satiety

The vices enter into the composition of the virtues, as poisons into that of medicines. Prudence collects and arranges them, and uses them beneficially against the ills of life.

For the credit of virtue it must be admitted that the greatest evils which befall mankind are caused by their crimes.

We confess our faults, to make amends by our sincerity for the harm they have done us in the opinion of others.

There are heroes in evil as well as in good.

ing in the loved person new subjects for love, the other arises from our making a merit of being constant.

Perseverance deserves neither blame nor praise, inasmuch as it is merely the duration of tastes and opinions, which we can neither give nor take away from ourselves.

What makes us like new acquaintances is not so much any weariness of our old ones, or the pleasure of change, as disgust at not being sufficiently admired by those who know us too well, and the hope of being more so by those who do not know so much of us.

We sometimes make frivolous complaints of our friends to justify beforehand our own fickleness.

Our repentance is not so much regret for the evil we have done, as fear of its consequences to us.

There are various sorts of curiosity: one is from interest, which makes us desire to know what may be useful to us; another is from pride, and arises from a desire of knowing what others are ignorant of.

It is better to employ our minds in supporting the misfortunes which actually happen, than in anticipating those which may happen to us.

Constancy in love is a perpetual inconstancy, which causes the heart to attach itself successfully to all the qualities of the person we love, giving the preference sometimes to one, sometimes to another; so that this constancy is nothing but an inconstancy, limited and confined to one object.

There are two sorts of constancy in love—one arises from continually discover-

The world more often rewards the appearance of merit than does it merit itself.

Avarice is more opposed to economy than liberality is.

Hope, deceitful as she is, serves at least to conduct us through life by an agreeable path.

Indolence and timidity often keep us to our duty, while our virtue carries off all the credit of doing so.

It is difficult to determine whether an open, sincere, and virtuous action is the result of probity or artfulness.

The virtues are lost in interest, as rivers are lost in the sea.

If we examine well the different effects of ennui, we shall find that it makes us neglect more duties than interest does.

often confers more reputation than real merit.

There is an infinity of modes of conduct which appear ridiculous, the secret reasons of which are wise and sound.

It is more easy to appear worthy of employments which we do not, than of those which we do possess.

Our merit gains us the esteem of the virtuous—our star that of the public.

useful manner, and they would spoil all if they changed their conduct.

The glory of men should always be proportioned to the means they have employed to acquire it.

Flattery is a false coin, which only derives its currency from our vanity.

It is not sufficient to have great qualities; we must be able to make proper use of them.

However brilliant an action may be, it ought not to pass for great when it is not the result of a great design.

There ought to be a certain proportion between actions and designs, if we would draw from them all the results they are capable of producing.

The art of being able to make a good use of moderate abilities wins esteem, and

A refusal of praise is a desire to be praised twice.

The desire of meriting the praise we receive fortifies our virtue; and that bestowed on talent, courage, and beauty, contributes to augment them.

It is more difficult to avoid being governed than it is to govern others.

If we did not flatter ourselves, the flattery of others would be very harmless.

Nature creates merit, and fortune brings it into play.

Fortune corrects us of more faults than reason is able to correct.

Some people with great merit are disgusting—others with great faults are agreeable.

The only merit of some people consists in saying and doing foolish things in a

for ourselves even when we seem to be praising them.

We are not fond of praising, and never praise any one except from interested motives. Praise is a clever, concealed, and delicate flattery, which gratifies in different ways the giver and the receiver. The one takes it as a recompense of his merit, and the other bestows it to display his equity and discernment.

We often choose envenomed praises, which, by a reaction, expose faults in those we are praising that we should not dare to discover in any other way.

We seldom praise but to be praised.

Few people are wise enough to prefer useful reproof to treacherous praise.

There are reproaches which praise, and praises which convey satire.

pleasing or persuading others, to be so studious of pleasing oneself; and that listening well and answering well is one of the greatest perfections that can be attained in conversation.

A man of wit would often be embarrassed without the company of fools.

We often boast that we are not weary of ourselves. We are such braggarts, that we do not like to allow that we are bad company for ourselves.

As it is the characteristic of great wits to convey a great deal in a few words, so, on the contrary, small wits have the gift of speaking much and saying nothing.

It is rather by estimation of our own sentiments that we exaggerate the good qualities of others, than by estimation of their merit; and we wish to attract praise

There are people who would never have been in love if they had never heard of love.

Men talk little when vanity does not prompt them.

We would rather speak ill of ourselves than not talk of ourselves at all.

One thing which makes us find so few people who appear reasonable and agreeable in conversation is, that there is scarcely any one who does not think more of what he is about to say than of answering precisely what is said to him. The cleverest and most complaisant people content themselves with merely showing an attentive countenance, while we can see in their eyes and minds a wandering from what is said to them, and an impatience to return to what they wish to say; instead of reflecting that it is a bad method of

Too great refinement is false delicacy, and true delicacy is solid refinement.

Coarseness is sometimes sufficient to protect us from being overreached by an artful man.

Weakness of mind is the only fault incapable of correction.

The least fault in women who have abandoned themselves to love is to love.

It is more easy to be wise for others than for ourselves.

The only good copies are those which exhibit the defects of bad originals.

We are never so ridiculous from the qualities we have, as from those we affect to have.

We are sometimes as different from ourselves as we are from others.

We often do good, in order that we may do evil with impunity.

If we resist our passions it is more from their weakness than from our strength.

We should have very little pleasure if we did not sometimes flatter ourselves.

The cleverest men affect all their lives to censure all artifice, in order that they may make use of it themselves on some great occasion, and for some great interest.

The ordinary employment of artifice is the mark of a petty mind; and it almost always happens that he who uses it to cover himself in one place, uncovers himself in another.

Treacheries and acts of artifice only originate in a want of ability.

The true method of being deceived is to think oneself more cunning than others.

repays the confidence shown in him by an ardent and disinterested zeal, though, in the advice he gives, he has generally nothing in view but his own interest or fame.

The most subtle of all artifices is the power of cleverly feigning to fall into the snares laid for us; and we are never so easily deceived as when we think we are deceiving others.

A determination never to deceive often exposes us to deception.

We are so much accustomed to disguise ourselves to others, that at length we disguise ourselves to ourselves.

Men are more often guilty of treachery from weakness of character than from any settled design to betray.

The more we love a mistress, the nearer we are to hating her.

The defects of the mind, like those of the countenance, augment with age.

There are some good marriages, but none that afford many delights.

We are inconsolable at being deceived by our enemies, and betrayed by our friends; and yet we are often content to be so by ourselves.

It is easy to deceive oneself without perceiving it, as it is difficult to deceive others without their perceiving it.

Nothing is less sincere than the method of asking and giving advice. The man who asks it appears to have a respectable deference for the opinion of his friend, while he intends to make him approve of his own; and he who gives the advice

near to be judged well of; others are never so well judged of as at a distance.

He is not a reasonable man who by chance stumbles upon reason; but he who derives it from knowledge, from discernment, and from taste.

To know things perfectly, we should know them in detail; but as this is almost infinite, our knowledge is always superficial and imperfect.

It is a species of coquetry to make a parade of never practising it.

The head cannot long play the part of the heart.

In youth the tastes are changed from heat of blood; in old age they are preserved from habit.

We give away nothing so liberally as advice.

produces all the effects attributed to judgment.

Every one speaks well of his heart, but no one dares to do so of his head.

Politeness of mind consists in the conception of honourable and delicate thoughts.

Gallantry of mind consists in saying flattering things in an agreeable manner.

It often happens that things present themselves to our minds in a more complete state than we could by much art make them arrive at.

The head is always the dupe of the heart.

It is not all who know their heads who know their hearts.

Men and things have both their proper points of view. Some require to be seen

to console themselves for being no longer in a position to give bad examples.

Great names debase, instead of elevating, those who cannot sustain them.

The mark of extraordinary merit is to see those most envious of it constrained to praise.

A man may be ungrateful, and yet less blameable for his ingratitude than he who conferred the favour.

We are mistaken in supposing that intellect and judgment are two different things. Judgment is merely the greatness of the light of the mind; this light penetrates into the recesses of things; it observes there every thing remarkable, and perceives what appears to be imperceptible. Thus it must be allowed that it is the greatness of the light of the mind which

proportion to the satisfaction we derive from them, and we judge of their merits by the kind of intercourse which they keep up with us.

Every one complains of his memory, and no one complains of his judgment.

In the intercourse of life we more often please by our faults than by our good qualities.

The greatest ambition has not the least appearance of it when it finds the absolute impossibility of reaching the height it aspires after.

To undeceive a man persuaded of his own merit is to do him as ill a service as that rendered to the Athenian madman, who fancied that all the vessels entering the harbour belonged to him.

Old men are fond of giving good advice,

an exchange of good offices; in fact, it is nothing but a system of traffic, in which self-love always proposes to itself some advantage.

It is more disgraceful to distrust one's friends than to be deceived by them.

We often persuade ourselves that we love people more powerful than we are; and yet it is interest alone which produces our friendship. We do not associate with them for any good that we wish to do them, but for that which we would receive from them.

Our mistrust justifies the deceit of others.

Men would not live long in society if they were not the dupes of each other.

Self-love increases or diminishes in our eyes the good qualities of our friends in

Silence is the safest course for any man to adopt who distrusts himself.

The reason we are so changeable in our friendships is, that it is difficult to know the qualities of the heart, while it is easy to know those of the head.

We can love nothing except with reference to ourselves; and we are merely following our own taste and pleasure when we prefer our friends to ourselves. It is, nevertheless, by this preference alone that friendship can be true and perfect.

Reconciliation with our enemies is only a desire of bettering our condition, a weariness of contest, and the fear of some disaster.

What men have given the name of friendship to is nothing but an alliance, a reciprocal accommodation of interests,

It is with true love as with apparitions. Every one talks of it, but few have ever seen it.

Love lends its name to an infinite number of connexions which are attributed to it, and in which it has no more part than the Doge has in what goes on at Venice.

Love ot justice in the generality of men is only the fear of suffering from injustice.

There is no disguise which can long conceal love where it does, or feign it where it does not, exist.

Almost everyone feels shame at being loved when they love no more.

If we judge of love by the generality of its effects, it resembles hatred rather than friendship.

It is impossible to meet with women who have never had an affair of gallantry; but it is rare to find any who have had only one.

There is only one sort of love, but a thousand different copies of it.

Love, like fire, cannot subsist without continual movement; as soon as it ceases to hope and fear, it ceases to exist.

A clever man should regulate his interests, and place them in proper order. Our avidity often deranges them by inducing us to undertake too many things at once; and by grasping at minor objects, we lose our hold of more important ones.

Grace is to the body what good sense is to the mind.

It is difficult to define love. All that we can say of it is, that in the soul it is a passion for reigning; in minds it is a sympathy; and in the body it is nothing but a latent and delicate desire to possess the loved object, after a good deal of mystery.

If there exists a love pure and exempt from the mixture of our other passions, it is that which lies hidden at the bottom of the heart, and of which we are ignorant ourselves.

depends as much on their humours as on fortune.

Sincerity is an opening of the heart: we find it in very few people; and that which we generally see is nothing but a subtle dissimulation to attract the confidence of others.

Aversion to lying is often an imperceptible desire to render our testimony important, and to give a religious respect to our words.

Truth does not do so much good in the world as its appearances do evil.

There is no kind of praise which has not been bestowed on prudence; nevertheless, however great it may be, it cannot assure us of the least event, because its subject is man—the most changeable in the world.

because we cannot deprive them of what attracts the respect of all the world.

In order to establish themselves in the world, men do all they can to appear established there.

Although men pride themselves on their great actions, these are often the result, not of any great design, but of chance.

It would seem that our actions are regulated by lucky or unlucky stars, to which they owe a great part of the praise or blame bestowed on them.

There are no circumstances, however unfortunate, that clever people do not extract some advantage from; and none, however fortunate, that the imprudent cannot turn to their own prejudice.

Fortune turns every thing to the advantage of her favourites.

The happiness or unhappiness of men

compensation of good and evil which renders them equal.

However great the advantages which nature bestows on us, it is not she alone, but fortune in conjunction with her, which makes heroes.

The contempt of riches among the philosophers was a hidden desire to revenge their merit for the injustice of fortune, by contempt of the very advantages of which she deprived them. It was a secret to secure themselves from the degradation of poverty: it was a by-road to arrive at that consideration which they could not obtain by riches.

Hatred of favourites is nothing else than the love of favour. The mortification of not possessing it is consoled and relieved by the contempt we show of those who do possess it; and we refuse them our respect,

Our humour sets its price on everything we get from fortune.

Happiness lies in the taste, and not in the things; and it is from having what we desire that we are happy—not from having what others think desirable.

We are never so happy, or so unhappy, as we imagine.

Men who fancy they have merit, take a pride in being unfortunate, to persuade others and themselves that they are worthy to be the butt of fortune.

Nothing ought so much to diminish the good opinion we have of ourselves as to see that we disapprove at one time what we approve at another.

Whatever may be the apparent difference between fortunes, there is a certain

We have not strength enough to follow all our reason.

A man often fancies that he guides himself when he is guided by others; and while his mind aims at one object, his heart insensibly draws him on to another.

Strength and weakness of mind are badly named—they are, in fact, nothing more than the good or bad arrangement of the organs of the body.

The capriciousness of our humour is often more fantastical than that of fortune.

The attachment or indifference which the philosophers had for life was nothing more than one of the tastes of their self-love, which we ought no more to dispute than the taste of the palate, or the choice of colours.

a view to our happiness, has also bestowed on us pride, to spare us the pain of being aware of our imperfections.

Pride has a greater share than goodness of heart in the remonstrances we make to those who are guilty of faults; we reprove not so much with a view to correct them as to persuade them that we are exempt from those faults ourselves.

We promise according to our hopes, and perform according to our fears.

Interest speaks all sorts of languages, and plays all sorts of parts, even that of disinterestedness.

Interest, which blinds some, opens the eyes of others.

Those who bestow too much application on trifling things become generally incapable of great ones.

We have more power than will; and it is often by the way of excuse to ourselves that we fancy things are impossible.

If we had no faults ourselves, we should not take so much pleasure in remarking them in others.

Jealousy lives upon doubts—it becomes madness, or ceases entirely, as soon as we pass from doubt to certainty.

Pride always compensates itself, and loses nothing, even when it renounces vanity.

If we had no pride ourselves, we should not complain of that of others.

Pride is equal in all men; and the only difference is in the means and manner of displaying it.

It seems that nature, which has so wisely disposed our bodily organs with

minds; and that, with the exception of a good deal of vanity, heroes are made just like other men.

It requires greater virtues to support good, than bad fortune.

Neither the sun nor death can be looked at steadily.

We often make a parade of passions, even of the most criminal; but envy is a timid and shameful passion which we never dare to avow.

Jealousy is in some sort just and reasonable, since it only has for its object the preservation of a good which belongs, or which we fancy belongs to ourselves, while envy, on the contrary, is a madness which cannot endure the good of others.

The evil which we commit does not draw down on us so much hatred and persecution as our good qualities.

cuted affect sometimes a firmness and a contempt of death, which is, in fact, only the fear of looking it in the face; so that it may be said that this firmness, and this contempt are to their minds what the bandage is to their eyes.

Philosophy triumphs easily over past, and over future evils, but present evils triumph over philosophy.

Few people know what death is. We seldom suffer it from resolution, but from stupidity and from habit; and the generality of men die because they cannot help dying.

When great men suffer themselves to be overcome by the length of their misfortunes, they let us see that they only supported them through the strength of their ambition, not through that of their

sometimes from indolence, often from fear, and almost always from all three together.

The moderation of fortunate people comes from the calm which good fortune gives to their tempers.

Moderation is a fear of falling into envy, and into the contempt which those deserve who become intoxicated with their good fortune; it is a vain ostentation of the strength of our mind; in short, the moderation of men in their highest elevation is a desire of appearing greater than their fortune.

We have all of us sufficient fortitude to bear the misfortunes of others.

The constancy of sages is nothing but the art of locking up their agitation in their hearts.

Those who are condemned to be exe-

Whatever pains we may take to disguise our passions under the appearances of piety and honour, they always discover themselves through these veils.

Our self-love endures with greater impatience the condemnation of our tastes, than of our opinions.

Men are not only prone to lose the remembrance of benefits and of injuries; they even hate those who have obliged them, and cease to hate those who have grievously injured them. The constant study to recompense good and avenge evil appears to them a slavery, to which they feel it difficult to submit.

The clemency of princes is often only a stroke of policy to gain the affections of their people.

This clemency, of which men make a virtue, is practised sometimes from vanity,

The passions are the only orators that always persuade: they are, as it were, a natural art, the rules of which are infallible; and the simplest man with passion, is more persuasive than the most eloquent, without it.

The passions have an injustice and an interest of their own, which renders it dangerous to obey them, and we ought to mistrust them even when they appear most reasonable.

There is going on in the human heart a perpetual generation of passions, so that the overthrow of one is almost always the establishment of another.

The passions often engender their contraries; avarice sometimes produces prodigality, and prodigality avarice; we are often resolute from weakness, and daring from timidity.

made in the territory of self-love, there still remain in it many unknown tracts.

Self-love is more artful than the most artful man in the world.

The duration of our passions no more depends on ourselves than the duration of our lives.

Passion often makes a madman of the cleverest man, and renders the greatest fools clever.

Those great and brilliant actions which dazzle our eyes, are represented by politicians as the effects of great designs, instead of which they are commonly the effects of caprice and of the passions. Thus the war between Augustus and Antony, which is attributed to the ambition they had of making themselves masters of the world, was, perhaps, nothing but a result of jealousy.

LA ROCHEFOUCAULD

WHAT we take for virtues is often nothing but an assemblage of different actions, and of different interests, that fortune or our industry know how to arrange: and it is not always from valour and from chastity that men are valiant, and that women are chaste.

Whatever discoveries may have been

Maxims

La Rochefoucauld

London
Arthur L. Humphreys
1911

MAXIMS.

La Rochefoucauld

LONDON.
ARTHUR L. HUMPHREYS
M.DCCCC.XI.

THIS WISDOM OF THE ANCIENTS

From Aesop to Sadi, to La Rochefoucauld to the wise of our own times, the intellectuals of every age have been imparting the sum total of the accumulated wisdom sometimes in the form of Fables, and at other times in Maxims

Khuda Bakhsh Library, in this age of explosion of information, is bent upon reviving the wisdom of the ancients The Fables Maxims are being offered afresh to the reader of the age of information, with a hope that such efforts may help strike a balance in the minds of men breathing in the air of 1991 and onward and thereby bringing them closer to the wisdom that is no more

A. R. B

MAXIMS

La Rochefoucauld

A few words about Sir Ali Imam	Dr Akhtar Imam	
A few words about himself		
Arabic, Persian and Urdu Manuscripts in Nepal		
Notes and jottings		
Regarding Journal Nos 57-62		
Nehru, Aligarh Ross Masood & Viceroy		
Maxims of La Rochefoucauld An introduction		

Contents

Maxims	La Rochefoucauld	1-116

Urdu/Persian Section

Hindustan Apne Hisar Men: Urdu version of "India: The Siege Within"	Mr.M.J.Akbar Mr.Masoodul Haq (Tr.)	1
A rare autograph writing of Wasi Ahmad Bilgrami	Mr.S.Murtaza Husain Bilgrami	341

Sir Syed Encyclopaedia

Premchand in Sir Syed's Aligarh	A letter, by Premchand	351
On Sir Syed	Taken from Premchand's "Ba-Kamalon ke Darshan"	352

Azad Encyclopaedia

Jama'at-e Ahmadiya	Maulana Abul Kalam Azad	363
Khuda Bakhsh Manuscript of Tarikh-e Mujmal Mufassal : New light on the life of Jan-e Janan	Mr.Farrukh Jalali	364

1993

Price Rs.75/-

Printer	: Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	: Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 650109, Tlx. 22-430 KBL IN)
Editor	: Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	: Rs.300/- (Inland) US 60 (Asian Countries) US 120 (Other Countries) Price (this issue) Rs. 75/-

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 95079

84-86

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

84—86

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA